دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

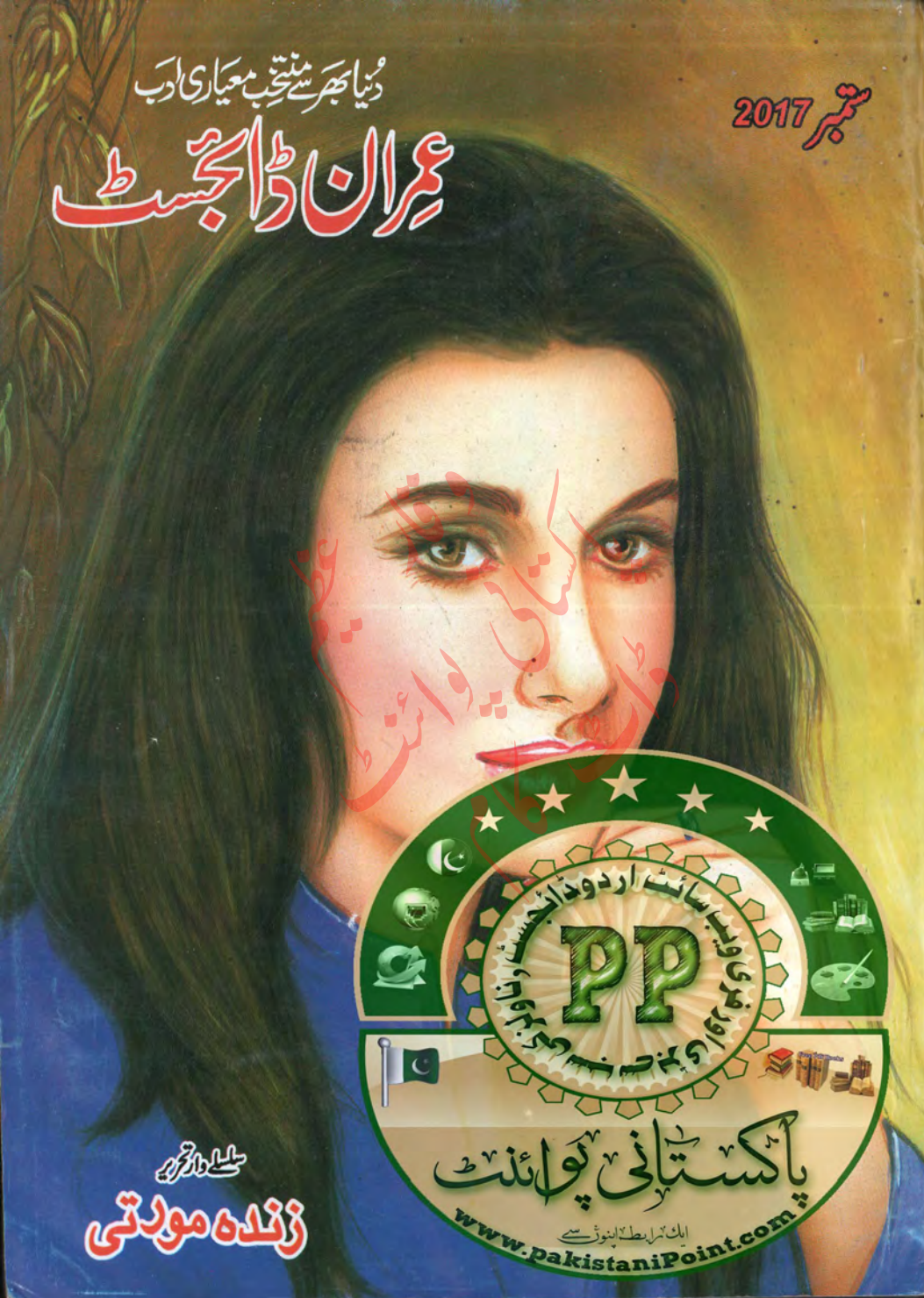

ستمبر 2017

سلسلے وار تحریر

زندہ موتی

پاکستانی پوائنٹ
ایک رابطہ اپنوں سے
www.pakistaniPoint.com

زندہ مورتی
8
ایم اے راحت
قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی طرف سے ایک خاص تحفہ

مہم
30
احمد صغیر صدیقی
ایک قاتل کی ڈائری سے سسپنس پارہ

زہریلی عورت
42
ایم۔الیاس
نفرت اور محبت کے جذبات کی ایک انوکھی کہانی

چتوڑکا چاند
95
ذوالفقار ارشد گیلانی
اس رانی کا تذکرہ جس نے عزت پر موت کو ترجیح دی تھی

تیری دیوانی
114
سدرہ محمود
ایک حساس دوشیزہ کی کتھا جوھر صورت محبت آشنا ہونا چاھتی تھی

کتے کی چوری
135
کھیل صدیقی
شہزاد اور اس کی محبوبہ نازش کا تازہ کارنامہ

انصاف ملا
152
شاہین جمال
ایک پیر فرتوت کے کارنامے پر مبنی سچ بیانی

شگون
160
اقبال بھٹی
حساس دلوں کے لیے ایک تاثر انگیز کہانی

جوش بے ہوش
166
شائستہ نعیم
ایک شخص کی پر سرار داستان جو سڑک پر چلتے چلتے اچانک غائب ہوگیا تھا

خودگم
176
نازی سلیمان
باذوق قارئین کے لیے بطور خاص ایک تحفہ

آخری کوشش
193
بسمیٰ سلیمان
انسان اور جانور کے درمیان ہونے والی دلچسپ اور عبرت سامان کشمکش

شک کا سانپ
211
نسیم جاوید سید
چند خطوط کے پس منظر میں جنم لینے والی سبق آموز تحریر

ذہن نارسا
220
سیمیں طاہر
اس کہانی کو پڑھنے کے بعد آپ بھی ہمدردی کرنے سے پہلے ایک دفعہ سوچیں گے ضرور

تائی
231
پروفیسر رام سروپ
محبتوں کی چاشنی میں ڈوبے زہریلے رویوں کی عکاسی

دوسرا راستہ
245
محمود عالم
ایک ماہر نفسیات کے کامیاب علاج سے شفا پانے والے مریض کا قصہ

محبت پھر آباد ہوگی
252
عمران عامر
بچھڑ کے ملنا ہی اصل محبت ہے، محبت کے موسم میں لکھی گئی کہانی

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

زندہ مورتی

ایم۔اے۔ راحت

تیسری قسط

ایم اے راحت اردو ادب کے چند بڑے ناموں میں سے ایک نام ہیں، آٹھ سو سے زائد ناولوں کے لکھاری، کالا جادو، ناگ دیوتا، کمند، کالے گھاٹ والی کفن پوش، صندل کے تابوت ان کی دیو مالائی تخلیقات ہیں۔

انہوں نے بچوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھیں۔ جب کہ تلفظ اور املا کے ساتھ ایسی لفاظی کی کہ بچے باآسانی پڑھ کر ان کے گرویدہ ہوئے۔

عمران ڈائجسٹ کے لیے بطور خاص انہوں نے ایک اچھوتی تحریر لکھی ہے جو وہ اپنی زندگی میں مکمل کر کے گئے تھے جو یقینا عمران ڈائجسٹ ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔

قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی طرف سے ایک خاص تحفہ

وہ مجھے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی' پھر بولی۔

"ڈرے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اب سمپورنی کا مجسمہ تمہارے پاس ہے۔ اب تم خود ڈرانے والی چیز ہو۔۔۔ ایک طاقت کے مالک ہو۔۔۔ اور اس طاقت کا استعمال کرتے ہوئے میرا وہ کام کرو گے۔۔۔"

"جی۔۔۔" میرا ڈر کم نہیں ہوا تھا۔

"اس دنیا میں ہر شخص کے دوست اور دشمن ہوتے ہیں اور دشمن کا کام اپنے حریف کو جھکانا ہوتا ہے۔ اس جیون پھیر میں میرے بھی پانچ دشمن ہیں جو میری جان لینا چاہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں ہی ان کو ان کے جیون سے آزاد کردوں۔ انہیں اس تکلیف سے مکتی مل جائے گی۔ وہ ابھی تک زندہ کیوں ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

"جی۔"

"اور اس کام میں تم میرا ساتھ دو گے۔ ان پانچوں کو تلاش کرکے ان کا خاتمہ کرو گے۔"

"میں۔" میں نے خوف زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

"ہاں تمہیں میرا کام کرنا ہے۔ مجھے ان پانچوں کا خون چاہیے۔"

"لیکن میں کس طرح۔۔۔؟"

"سمپورنی کی مورتی ہے تمہارے پاس۔ بہت بڑی شکتی ہے اور اس شکتی کا مظاہرہ تم دیکھ چکے ہو۔ ترتیب وار ان دشمنوں کا خیال کرنا یہ مورتی ان تک پہنچانے میں تمہاری مدد کرے گی۔ اس کے بعد کیا کرنا۔۔۔ یہ تم کو سوچنا ہے۔۔۔ مجھے بس ان پانچوں کا خون چاہیے۔ اس کے بعد جانتے ہو کیا ہوگا۔"

"کیا۔"

"یہ سمپورنی کی شکتی کچھ معاملات میں محدود ہے' لیکن ان کا خون لانے کے بعد تم امر شکتی کے مالک بن جاؤ گے۔ پھر شاید ہی تم سے بڑا کوئی شکتی مان ہو۔" پھر اس نے بیدیکا کے مجسمے کے نیچے رکھا ہوا ایک پیالہ اٹھایا۔ اس میں ایک عجیب سا سیال تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ یہ پانی کی طرح لگتا تھا' لیکن پانی نہیں تھا۔

اس نے وہ سیال میرے منہ پر ڈال دیا۔

"جا بالک وجے ہو تیری' تیری وجے ہو۔۔۔ سمپورنی کی شکتی تیرے ساتھ ہے۔ رانی کرشنا کا آشیرباد تیرے ساتھ ہے۔ وجے تیرا مقدر ہے۔ تیری وجے اوش ہوگی۔" وہ بلند آواز میں کہہ رہی تھی' لیکن میں خاموش رہا اور اس کی وجہ آنکھوں میں ہونے والی جلن تھی۔ جو شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ دیں۔ مورتی میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میں اپنی آنکھیں ملتا رہا۔ اس پانی میں ایسا کچھ تھا جس نے میری آنکھیں بند کروی تھیں۔ میں نے آنکھیں ملنی شروع کیں اور پھر آہستہ آہستہ یہ جلن ختم ہونے لگی۔ میں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا دیے۔۔۔ لیکن یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ میں ایک میدانی ڈھلان میں کھڑا تھا جہاں میرے سوا کچھ نہ تھا' ایسا میدان جو خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ دور دور تک کھلا میدان نظر آتا تھا۔ کافی دور ایک سڑک نظر آئی اور میں اس جانب چل پڑا۔

دل میں یہی خیال تھا کہ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ جاؤں اور کسی ایسے انسان کو تلاش کروں جو مجھے کسی آباد علاقے تک پہنچا دے۔ میں چلتا رہا اور پھر اوپر پہنچ گیا۔ یہ ایک شفاف سڑک تھی۔ دور دور تک آدم زاد کا نام و نشان نہ تھا۔ سڑک کے دوسری طرف بھی ایسی ہی ڈھلان تھی۔ میں کافی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر ایک جانب سے دھول اڑتی ہوئی نظر آئی۔ شاید کوئی گاڑی تھی۔ گاڑی کے ساتھ اردگرد سڑک پر پڑی دھول اڑ رہی تھی۔ میں اس گاڑی کو روکنے کے لیے تیار ہوگیا اور سڑک کے درمیان آگیا۔ البتہ اتنی جگہ ضرور چھوڑی کہ گاڑی والا مجھے نہ دیکھ پائے۔ پھر میں نے ہاتھ اٹھا دیے اور زور زور سے اس انداز میں ہلانے لگا جیسے مدد کے لیے پکار رہا ہوں۔ پھر اس گاڑی والے نے مجھے دیکھ لیا اور میرے قریب آکر رکا۔ یہ بالکل نئی چمکتی ہوئی گاڑی تھی۔ پھر اس میں سے ایک خوش شکل آدمی نکلا' رنگ گورا' خوب صورت شانوں تک بال آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک۔ ہاتھوں میں

انگشتریاں۔ گلے میں چین پڑی تھی۔ جدید لباس پہنے دیکھنے دکھانے کی چیز تھی۔

"آپ اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"مسافر ہوں۔"

"راستہ بھول گئے ہیں کیا۔؟"

"جی۔"

"لیکن آپ کے پاس کوئی سواری بھی نہیں ہے۔"

"نہیں جی۔ میں شہر جانے والی بس پر سوار ہوا تھا۔ پھر بس ایک جگہ رکی اور مسافر اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ میں بھی ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا اور میری آنکھ لگ گئی..... آنکھ کھلی تو میں وہاں تنہا تھا۔"

"اوہ..... یہ تو بہت برا ہوا۔"

"مجھے شہر جانا ہے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"آپ کا سامان۔"

"وہ بس میں رہ گیا۔" سامان کے ذکر پر مجھے وہ مورتی یاد آئی جو میں نے اندرونی لباس میں چھپائی تھی۔

"آپ کا پرس وغیرہ ہے نا آپ کے پاس۔"

"جی نہیں۔"

"یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ کیا وہ بھی سامان کے ساتھ تھا؟"

"جی۔"

"پھر تو یہ بہت برا ہوا۔ پھر تو اس بس کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر سامان نہ ملا تو اس کی رپورٹ درج کرنی ہوگی۔"

"چھوڑیں صاحب۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"اس میں کچھ دستاویزات بھی تو ہوں گی۔"

"نہیں اس میں صرف میرے کپڑے اور پیسے تھے۔"

"چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس کے حصول کے لیے کوشش کروں۔"

"نہیں صاحب۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ جانے والی چیز تھی چلی گئی۔"

"تمہارا نام نہیں پوچھا میں نے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"شاہو....."

"مجھے شیر خان کہتے ہیں..... کیا اسی شہر میں رہتے ہو۔"

"نہیں اس شہر میں تو اجنبی ہوں۔ میں تو جمال پور کے ایک علاقے شاہ بستی میں رہتا ہوں....."

"پڑھتے ہو؟" وہ بندہ بلا کا باتونی تھا۔

"نہیں..... ایک دکان پر ملازم ہوں....."

"فیروز آباد میں کہاں قیام کریں گے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا اور مجھے پہلی بار اس شہر کا نام معلوم ہوا۔

"وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں....."

"آپ کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں....."

"جی....." میں افسردہ ہوا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے گھر میں قیام کریں..... بلکہ یہی مناسب رہے گا۔"

"جی آپ کا احسان یہی بہت ہے کہ مجھے شہر پہنچا دیں ورنہ میں ان بیابانوں میں سر ٹکراتا پھرتا۔"

"اس میں احسان والی کون سی بات ہے۔ بحیثیت انسان یہ میرا فرض ہے اور کوئی شخص یہ نہیں کرتا تو وہ انسانیت سے خارج ہے۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ آپ کچھ دن میرے گھر قیام کریں اور جب آپ کا کام مکمل ہو جائے تو آپ شہر روانہ ہو جائیں۔"

"جی۔ میرے خیال میں....."

"خیال آپ چھوڑیں..... آپ کو میرے گھر میں ہی رہنا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور رقم کی آپ پروا نہ کریں....."

میں اس کو کیا جواب دیتا..... خاموش رہا..... پھر کافی راستہ طے کر کے گاڑی شہر میں داخل ہو گئی۔ گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ یہ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر تھا۔ کہاں شاہ بستی اور کہاں یہ ماحول۔ اب مجھے کچھ سکون مل رہا تھا۔ مجھے ایک مقصد مل گیا تھا۔ ساتھ ساتھ طاقت بھی دی گئی تھی اور یہ شخص میرے لیے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔

پھر گاڑی ایک کوٹھی کے سامنے جاکر رکی۔ شیر خان نے ہارن دیا اور گیٹ کھل گیا اور شیر خان گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی ایک وسیع گیراج میں روک کر شیر خان بولا۔

"آؤ" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں بھی اتر گیا۔ کوٹھی کی شان و شوکت سے اس کی حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ شخص انتہائی دولت مند تھا۔ پھر وہ مجھے لیے وہ آگے بڑھا اور سامنے کی جانب جانے کی بجائے دائیں جانب چل پڑا۔ وہاں چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے کے باہر رک کر کسی کو پکارنے لگا۔

"بادشاہ۔۔۔ او بادشاہ۔۔۔"

"آتا ہو خاناں۔۔۔ ابی آتا ہوں۔۔۔" پھر وہ باہر نکلا' مضبوط ہاتھ پیروں کا پٹھان' ہمیں دیکھ کر وہ چونکا تھا۔

"سلام صاب۔ تم آگیا۔۔۔"

"تو نہ آتا"

"نئیں صاب۔ ہم تو آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"چلو انتظار ختم ہوا۔۔۔ اب خوش ہو۔۔۔"

"جی۔۔۔ بہت خوش۔۔۔"

"اچھا یہ ہمارے مہمان ہیں اور کچھ دن یہی قیام کریں گے۔۔۔"

"جی صاب۔۔۔"

"یہ تمہارے ساتھ قیام کریں گے' ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ایک کمرہ ان کو دے دو۔"

"آپ فکر نہ کریں صاب۔۔۔"

"رشید آگیا۔۔۔"

"جی صاب۔ وہ اندر کوٹھی میں ہے۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے کہا اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہاں رہو۔ اپنا کام کرو اور یہ کچھ پیسے رکھ لو۔" اس نے جیب سے چند سو سو کے نوٹ میری جانب بڑھائے۔

"جی۔۔۔"

"اس میں جھجکنے والی کوئی بات نہیں۔۔۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو۔۔۔"

"جی۔۔۔ اور یہ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں۔ مجھے ضرورت ہوگی تو میں مانگ لوں گا۔۔۔"

"ارے نہیں۔۔۔ رکھ لو۔۔۔ یہ رکھ لو۔۔۔" انہوں نے زبردستی نوٹ میری جیب میں رکھ دیے۔

"بادشاہ خان۔۔۔ خیال رکھنا۔۔۔" اس نے کہا اور کوٹھی کی جانب بڑھ گیا۔

"آؤ صاب۔" اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔۔۔ کمرہ اچھا خاصا تھا۔۔۔ ایک جانب مسہری رکھی تھی۔۔۔ درمیان میں ایک میز' اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ بہرحال سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا تھا۔ اب کچھ دن یہاں رہوں گا اور پھر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ ابھی تو رانی کرشنا کا کام بھی کرنا ہے۔"

"صاب۔۔۔ یہ آپ کے رہنے کی جگہ ہے۔ اگر کوئی چیز چاہیے ہو تو بے جھجک کہو' ہم آپ کا خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

"جی اچھا۔۔۔"

"یہ جی اچھا کیا ہے صاب۔۔۔ حکم کرو۔۔۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔"

"ابھی کھانا بھجواتا ہوں۔۔۔ آپ منہ ہاتھ دھولیں۔۔۔ وہ باتھ روم ہے۔" اس نے کمرے کے ایک جانب اشارہ کیا پھر میں باتھ روم میں گھس گیا اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا' پھر مجھے مورتی کا خیال آیا میں نے اسے نکال کر دیکھا اور مطمئن ہو کر واپس رکھ دی۔ پھر میں باہر آکر دوبارہ مسہری پر لیٹ گیا۔ آرام دہ مسہری تھی مجھے لیٹنے میں لطف آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں ملازمہ' آپ کے لیے کھانا لائی ہوں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ پندرہ سولہ کی ایک پیاری سی لڑکی ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے ٹرے لینے لگا تو وہ بولی۔

"ارے آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔ میں کھا

میز پر لگا دیتی ہوں۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ آئی۔ میں نے اسے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ پھر اس نے کھانا اور پانی میز پر رکھ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا..... میں ابھی چلر لگاؤں گی۔"

"نہیں تم جاؤ..... اتنا ہی کافی ہے....." میں نے کہا اور وہ چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی ہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ بہرحال وہ مجھے اچھی لگی۔ میں نے میز اپنے قریب کی اور کھانا کھانے لگا۔ انتہائی مزے دار کھانا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ برتن میز پر سمیٹ کر میں مسہری پر جا کر لیٹ گیا کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔

"دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا اور وہی لڑکی اندر آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور مجھ سے بولی۔

"کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے کہا اور وہ مڑ گئی۔ میں اسے دروازے سے باہر جاتے دیکھتا رہا۔ تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر میں لیٹ گیا۔ کافی دیر اس طرح گزر گئی کہ دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون ہے۔ اندر آجاؤ۔" میں نے کہا اور بادشاہ اندر آگیا میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو صاب۔ ہم تو پوچھنے آیا تھا کہ کھانا وانا کھالیا....."

"کھالیا....."

"اور چائے....."

"وہ نہیں پی....."

"او صاب۔ تم بہت شرماتا ہے۔ اس بی بی سے ہمارے کا بول دیتا۔ دو منٹ میں آجاتا۔ اچھا ہم خود ہمارے لے کر آتا ہے۔" وہ چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ ان کا رویہ میرے ساتھ کتنا اچھا ہے۔ پہلے اتنا شاندار کھانا اور اب چائے۔ باقی ضرورت کی سب چیزیں بھی مہیا کر دیں۔ میں ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ جس میں کیتلی اور خالی کپ تھے۔

"تم برا نہ مانو تو ہم آپ کے ساتھ....."

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے....." میں نے کہا اور بادشاہ خان نے دونوں کپوں میں چائے ڈالی اور پھر ایک کپ میری جانب بڑھایا اور دوسرا کپ لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"بادشاہ خان اوپر آکر بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں صاب..... ہم ٹھیک ہے۔"

"اچھا نہیں لگتا....."

"نہیں صاب۔ ہم اپنے کمرے میں بھی زمین پر لیٹتا بیٹھتا ہے ہم کو اس زمین کی عادت ہے....."

"جیسے تمہاری مرضی....."

"صاب کسی چیز کی ضرورت ہو۔ کوئی تکلیف ہو۔ آپ ہمارا دروازہ بجا دینا۔ چاہے رات کا وقت ہو۔"

"یہ تو تمہاری محبت ہے۔ بادشاہ خان نے مجھے زبردستی دو کپ چائے کے پلائے۔ پھر وہ چائے کے برتن لے کر باہر نکل گیا۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور پھر کچھ دیر بعد مجھے نیند آگئی۔

ایک دو دن اسی طرح گزر گئے۔ بادشاہ خان اور وہ لڑکی آتے جاتے رہے۔ اس دوران شیر خان سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ میں باہر بھی آجاتا تھا۔ کبھی لان میں گھومنے لگتا۔ اس دوران مجھے شیر خان کا کوئی رشتہ دار نظر آیا۔ ماحول پر عجیب سی پراسرار خاموشی تھی۔ پھر تیسرے دن ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ شیر خان آگیا۔

"کہو شاہو، کیسی گزر رہی ہے؟"

"آپ کی مہربانی ہے جناب، بہت بڑا احسان کیا ہے آپ نے مجھ پر۔"

"اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ یہ سمجھو تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں۔"

"کیوں شرمندہ کر رہے ہیں....."

"اچھا یہ بتائیں، آپ نے کام کے سلسلے میں جانا تھا کہیں۔ اس کا کیا بنا؟"

"بس تھوڑی دیر کا کام ہے۔ کسی بھی وقت چلا

جاؤں گا۔"

"آپ کو جب بھی جانا ہو مجھے آگاہ کر دینا۔۔۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں جناب کوئی ایسی بات نہیں۔۔۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔۔۔" پھر کچھ دیر وہ میرے پاس رکا پھر کہنے لگا۔

"اچھا شاہو۔ آپ ہو آئیے گا۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔۔۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" وہ بار بار آپ سے تم پر آتا اور پھر سنبھل جاتا۔

"جی بالکل۔۔۔" میں نے کہا اور پھر بادشاہ خان سے بولا۔

"میں آج ذرا کام سے باہر جاؤں گا' دوپہر تک واپسی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے صاب۔ کھانا تو واپس آکر کھائیں گے نا۔۔۔"

"ہاں کھانا میں واپس آکر کھاؤں گا۔۔۔"

"ٹھیک ہے صاب۔ پھر میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس دوران بادشاہ نے جو مجھے کپڑے دیے تھے ان میں سے ایک پہنا اور باہر آگیا۔ مین گیٹ بادشاہ نے ہی کھولا تھا اور میں چونک پڑا۔

"بادشاہ خان۔"

"جی صاب۔"

"چوکیدار چھٹی پر ہے کیا؟"

"چوکیدار نوکری چھوڑ گیا ہے صاب۔"

"کیوں۔"

"بس کہتا تھا کہ گاؤں جا کر اب اپنا کام کرے گا۔ کچھ گھریلو مسئلہ بھی تھا اس کا۔"

"چلو ٹھیک ہے چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

کوٹھی کے دونوں جانب خالی پلاٹ بنے ہوئے تھے۔ آس پاس بھی گھر کم تھے اور بیشتر زمین خالی تھی۔ لیکن یہاں بھی میں نے کسی انسان کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ بڑے بڑے لوگ صرف کمروں میں گھسے رہتے ہیں۔ انہیں کسی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا' بس اپنے اپنے گھروں میں مست رہتے ہیں۔

بہرحال میں چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ پھر مین روڈ آگیا۔ تھوڑی دور ایک بازار سا نظر آیا اور میں اس طرف چل پڑا۔ یہاں بہت رونق تھی۔ کافی دیر میں بازار میں یوں ہی گھومتا رہا۔ پھر ایک دکان پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ میں واپسی کے لیے مڑ گیا اور اسی طرح چلتا ہوا کوٹھی تک پہنچ گیا۔ ابھی میں مین گیٹ کی بیل بجانے ہی والا تھا کہ بادشاہ خان گیٹ کھول کر باہر آگیا۔

"ارے صاب تم۔"

"ہاں۔ میں واپس آگیا۔۔۔"

"چلو اچھا ہوا۔ اچھا ایک سائیڈ پکڑو۔" اس نے مجھے ایک جانب ہونے کو کہا اور پھر جا کر گیٹ کھول دیا۔ ایک گاڑی زناٹے سے باہر نکلی اس میں کوئی اور ہی شخص تھا۔ وہ شیر خان نہیں تھا وہ عجلت میں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہو۔

"صاب۔ کھانا بھجوا دوں۔۔۔"

"ہاں۔ شدید بھوک لگی ہے۔۔۔"

"اچھا صاب۔۔۔ ابھی بھجوا دیتا ہوں۔ کوئی چیز چاہیے ہو تو سنبل کو کہہ دینا میں ایک کام سے باہر جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور وہ چلا گیا۔۔۔ مجھے یہاں آئے تین چار دن ہو گئے تھے لیکن میں نے ابھی تک اس لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا۔ پھر وہ لڑکی میرے لیے کھانا لے کر آئی۔ اس نے میز پر کھانا لگایا اور ایک جانب کھڑی ہو گئی' میں حیران تھا وہ ابھی تک یہی موجود ہے۔۔۔ پھر میں نے اس سے پوچھا ہی لیا۔

"خیریت ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"تم یہاں کیسے پھنس گئے۔" اس نے مجھ سے عجیب سا سوال کیا اور میں چونک پڑا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں پوچھ رہی ہوں کہ تم ان لوگوں کے چکروں میں کیسے پھنس گئے۔"

"تمہیں اس سے مطلب۔"

"بھاگ جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں بس یہ ہی کہنا چاہتی ہوں کہ تم اپنی زندگی بچانا چاہتے ہو تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"لیکن یہ میری جان کیوں لینا چاہیں گے۔ یہ تو انتہائی شریف لوگ ہیں۔"

"تم نہیں جانتے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"شاہو۔"

"شاہو۔ تم میری سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ انتہائی خطرناک لوگ ہیں۔"

"کچھ پتا بھی تو چلے۔"

"میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ بادشاہ بازار سے آتا ہوگا' بس اسے میری التجا سمجھ لو' یہاں سے جیسے ہی ممکن ہو نکل جاؤ۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئی تھیں' یہ لوگ اتنے اچھے تھے۔ میرا ہر طرح خیال رکھ رہے تھے اور میں اپنے محسنوں پر شک کیسے کرتا۔ یقیناً" اس لڑکی کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

بہرحال یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ پھر ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کوئی آواز سنائی دی۔ میں پھرتی سے اٹھا' اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس میں تھوڑی سی جھری پیدا کی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ بادشاہ خان چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھ رہا ہے اور پھر وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ رات کے اس پہر اسے اندر کیا کام ہوسکتا ہے۔ بات کچھ میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں باہر نکل آیا اور بھاگ کر نارنجل کے درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ یہاں سے میں کوٹھی کی نقل و حرکت کا جائزہ لے سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ باہر آیا اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بادشاہ خان نے وہ چیز اس شخص کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھی اور پھر وہ آدمی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ بادشاہ نے گیٹ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت وہ انتہائی پراسرار لگ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ ایسا کون سا سامان ہے جو دن کی روشنی میں نہیں دیا جاسکتا۔ کافی دیر میں وہیں کھڑا رہا پھر چھپتا چھپاتا اپنے کمرے میں آگیا۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ سنبل کی بات میرے ذہن میں آئی تو مجھے یقین ہوچلا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ پھر جانے کب مجھے نیند آگئی۔

دوپہر کو بادشاہ خان میرے پاس آیا۔ پہلے میرا دل چاہا کہ اس سے رات کے واقعے کے بارے میں پوچھوں پھر کسی مصلحت کے تحت چپ ہوگیا البتہ میں نے یہ ضرور پوچھا تھا۔

"سنو۔"

"جی صاب۔"

"یہاں اس کوٹھی میں شیر خان کے بیوی بچے نظر نہیں آئے۔" میری بات پر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی خاموشی کو میں نے معنی خیزی سے دیکھا۔

"تمہارا صاب تم کو جتنا خوش نظر آتا ہے۔ اندر سے اتنا ہی دکھی ہے۔ ایک بار صاب کی بیوی اور دو خوب صورت بچے ڈرائیور کے ساتھ شاپنگ پر گئے۔ واپسی پر ایک ٹرک نے اس کی گاڑی کو بری طرح کچل دیا۔ خود ٹرک کا ڈرائیور بھاگ گیا۔ صاب بہت رویا۔ وہ کئی ماہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ آپ کو اس لیے صاب کوٹھی کے اندر نہیں لے کر گیا کہ جب کوئی کوٹھی میں مہمان آتا تھا تو صاب ان کو بیگم صاحبہ سے ملواتا تھا اور پھر وہ ان کی بڑی خدمت کرتا۔ اس دن صاحب آپ کو یہاں چھوڑ کے گیا تو اندر جا کر بہت رویا۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

میں بادشاہ خان کی وفاداری سے بہت متاثر ہوا اور اس لڑکی کی باتوں پر مجھے غصہ آیا۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کندھے پر جا کر تھپکی دی۔

"صبر کرو بادشاہ خان۔ اللہ شیر خان کو بھی صبر دے گا۔" میں نے کہا۔ اس نے اپنے رومال سے آنکھیں

صاف کیں اور تھوڑی دیر بعد باہر چلا گیا۔

باقی دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ سنبل دوپہر اور رات کا کھانا دے کر خاموشی سے چلی گئی۔ اگلے دن وہ صبح صبح ناشتا لے کر آئی۔ میز پر ناشتا رکھ کر بولی۔

"تم نے میری بات کو مذاق سمجھا تھا....."

"کون سی بات....." میں انجان بنا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا بھاگ جاؤ یہاں سے....."

"خیر میرا یہاں مستقل رہنے کا کوئی ارادہ نہیں..... لیکن تم مجھے یہاں سے بھیجنا کیوں چاہتی ہو....."

"اس لیے کہ میں تمہاری خیر خواہ ہوں....."

"اچھا۔" میں نے مذاق اڑایا اور وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"دیکھو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا اور اب تم جانو اور تمہارا کام۔" وہ کہہ کر چلی گئی اور میں نے اسے ذہنی مریض کا لقب دے دیا۔ ہر ذہنی مریض کو یہی لگتا ہے کہ اس کے قریبی لوگ اس کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ میں نے بہرحال ان کو مخلص اور محبت کرنے والا جانتا تھا۔ کچھ دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ ایک دن بادشاہ میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا۔

"صاب..... وہ ہمارا صاب آپ کو بلاتا ہے۔"

"کہاں؟"

"باہر لان میں..... وہیں بیٹھ کر چائے پیئے گا۔ آپ کو بھی بلاتا ہے....."

"اچھا۔" میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ باہر لان میں بید کی ایک کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ میں قریب گیا تو اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آؤ شاہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مصروفیت اتنی ہو گئی ہے کہ آپ سے ملنے کی فرصت نہیں ملتی اور آپ سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ظاہر ہے آپ کی کاروباری مصروفیت ہیں..... اور پھر یہ لوگ میرا خیال رکھ رہے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ کا کام ہو گیا؟"

"جی۔ ایک صاحب سے ملنا تھا ان سے ملاقات ہو گئی۔ اور باقی باتیں بھی طے ہو گئی ہیں۔"

"کون سی باتیں؟"

"بس ذرا دوکان کا مسئلہ تھا۔"

"اچھا خیر۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔"

"جی۔"

"آپ کو دوکان سے کتنے پیسے مل جاتے ہوں گے؟"

"بس گزر ہو جاتا ہے....." میں نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

"تو کیا آپ ساری زندگی اسی طرح گزار دیں گے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کل کو آپ کی شادی ہو گی بچے ہوں گے۔ اس تنخواہ میں آپ گزارا کر لیں گے۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ابھی کوئی ایسا کام کرو..... جو مستقبل میں تمہارے لیے خوش کن ہو....."

"آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے....."

"میرا ایک دوست ہے جو بچوں کو باہر بھجواتا ہے۔ وہ قانونی طور پر یہ کام کرتا ہے اور پھر وہاں جا کر ان کو نوکریاں بھی لگواتا ہے۔ وہاں تم کو اپنے مزاج کے مطابق کام ملے گا۔ وہاں اسٹور ہوتے ہیں جن کو ہوشیاری سے چلانا پڑتا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم یہ کام کر لو گے۔"

"جی دیکھ لیں۔ اگر آپ بہتر سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات..... بادشاہ خان، بھئی چائے کہاں ہے؟" اس نے قریب کھڑے بادشاہ خان کو کہا اور وہ اندر چلا گیا۔

"اصل میں، میں ساری باتیں اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتا..... تم اسے بتانا کہ ٹکٹ کے پیسے تم نے خود مجھے دیے تھے۔ کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ اول تو وہ

پوچھے گا نہیں اور پوچھا تو یہی کہہ دینا۔"

"جی ٹھیک ہے۔۔۔"

"شاباش۔۔۔ ابھی بادشاہ تمہارا بلڈ گروپ لے گا اور کل تمہاری تصویریں کھینچی جائیں گی یہ پاسپورٹ کے لیے ضروری ہیں۔"

"جی بہتر۔" باہر جانے کے تصور سے ہی میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ پھر بادشاہ چائے لے آیا اور شیر خان نے کہا۔

"پہلے ان کے بلڈ سیمپل لے لو اور کل تصویریں کھینچ لینا۔"

"جی صاب۔"

"جی بہتر۔" بادشاہ نے کہا اور چائے کے برتن میز پر رکھ کر تیزی سے مڑا۔ پھر بادشاہ خان کچھ سامان اٹھائے اندر آگیا' اس کے سامان میں دو سرنجیں اور شیشے کی نلکیاں تھیں اس نے وہ سامان میز پر رکھ دیا اور شیر خان اس سامان کی جانب بڑھا۔

"تھوڑی سی تکلیف ہوگی۔ بلکہ کوئی خاص پتا بھی نہیں چلے گا' لیکن ہلنے جلنے کی ضرورت نہیں۔"

"جی بہتر۔" پھر شیر خان نے میرے خون کا نمونہ لے لیا اور بادشاہ خان سے بولا۔

"بادشاہ خان میرا کام پورا ہو گیا۔۔۔"

"جی اچھا صاب۔" بادشاہ خان نے کہا اور ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیر خان چائے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کپ میں چائے انڈیل کر مجھے دی۔ چائے پی کر وہ کھڑا ہو گیا اور پھر مجھ سے کہا۔

"اچھا شاہو۔ اب تم آرام کرو۔ ایک آدھ دن میں تمہارا پاسپورٹ بننے کے لیے دے دیا جائے گا۔۔۔"

"جی بہت اچھا جناب۔۔۔" میں نے کہا۔

"پھر اگلے دن بادشاہ میرے پاس آیا اور مجھے تصویریں کھنچوانے لے گیا۔ دن اسی طرح گزر گیا۔ اس رات عجیب بات ہوئی۔ میں اپنے کمرے میں آرام سے سو رہا تھا کہ مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ان آوازوں کی شدت سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے مورتی ہاتھ میں لی اور روشنی کیے بنا دروازہ تک پہنچ گیا۔ میں نے دروازے کی درز پیدا کی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ چیخوں کی آواز لان میں سے آرہی تھی۔ کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز تھی۔ میں احتیاط سے باہر نکلا اور ناریل کے درخت کی جانب رینگ گیا۔ اور لان کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں سامنے ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی اور پھر اسی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک لڑکی کو پکڑے ہوئے تھا اور وہ لڑکی چیخ رہی تھی۔

"چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو' میں مرنا نہیں چاہتی۔۔۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس جانب دیکھ رہا تھا اور میں اپنی جگہ اچھل پڑا۔ اگر میری نگاہیں دھوکہ نہیں دے رہی تھیں تو یہ لڑکی سنبل تھی اور اس کو اندر کی جانب لے کر جانے والا بادشاہ تھا' لیکن یہ اس طرح اس کو کیوں گھسیٹ رہا تھا اور یہ کیوں چیخ رہی ہے۔ پھر بادشاہ خان اسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ سنبل مسلسل چیخ رہی تھی۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چھپتا چھپاتا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن اس بار میں نے رفتار تیز رکھی تھی اور پھر اس جگہ پہنچ گیا جہاں کوٹھی کا صدر دروازہ تھا۔ دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر وہ کھل گیا۔

"دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں اندر چلا گیا۔۔۔ اندر ایک بڑی راہداری تھی۔ جو دور تک جاتی تھی۔ چیخوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اور اب کسی کمرے سے آرہی تھی۔ میں نے چیخوں کی سمت کا اندازہ لگایا اور اس جانب چل پڑا۔ راہداری میں لائن سے کمرے بنے ہوئے تھے اور ان ہی کمروں میں سے ایک کمرے میں سے آواز آرہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید بادشاہ خان اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا لیکن چلانے کی آواز ایک کونے سے آرہی تھی۔ پھر آنی بند ہو گئی۔ میں اس کونے میں پہنچا اور حیران رہ گیا۔ ایک کونے سے زمین ہی غائب تھی۔ ایک چوکور خلا تھا۔ میں نے اس خلا میں جھانک کر دیکھا۔ نیچے سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ میں مورتی پر گرفت مضبوط کی اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر سامنے بڑے بڑے پردے تھے۔ میں آہستہ چلتا ہوا ان

پردوں کے پاس پہنچ گیا اور پھر تھوڑی سی جگہ بنا کر دوسری جانب دیکھنے لگا' لیکن دوسری جانب جو کچھ تھا وہ حیران کن تھا۔

یہاں دو قطاروں میں لمبی لمبی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر بڑے بڑے جار پڑے ہوئے تھے۔ ان جاروں میں انسانی اعضاء پڑے ہوئے تھے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان جاروں کا مقصد سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ان پر لیبل بھی لگے ہوئے تھے اور ان میزوں کے درمیان واش بیسن بنے ہوئے تھے۔ مجھے سنبل نظر نہیں آئی تو میں آگے بڑھا۔ واش بیسنوں میں جو کچھ تھا اسے دیکھ کر مجھے گھن آئی۔ پھر میزوں کی قطاریں ختم ہوگئیں۔ ان کے بعد ایک دروازہ کھلتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دراز ے میں داخل ہوگیا۔ یہاں ایک لمبی سی میز پڑی تھی اور اس میز پر سنبل کو باندھ کر لٹایا گیا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھا پاس ہی بادشاہ خان کھڑا تھا۔ اس کا منہ دوسری جانب تھا۔ پھر ایک پردہ ہٹا اور اس میں سے شیر خان نکلا۔ اس نے ہاتھ میں دستانے پہن رکھے تھے اور وہ سفید لباس میں تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھے جوش آیا اور میں چیخ کر بولا۔

"یہ کیا کررہے ہو تم لوگ۔ کیا تماشا ہے۔" شیر خان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ بادشاہ نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر شیر خان کے عضلات نارمل ہونے لگے اور وہ پرسکون نظر آنے لگا۔

"کچھ نہیں ہورہا جان۔۔۔ یہ تو ہم اپنی روزی کا سامان کررہے ہیں۔۔۔"

"اسے کیوں باندھا ہے۔۔۔"

"یہی تو روزی ہے۔ اب دیکھو پیارے ابھی ہم اس کا دل' گردے اور ہڈیاں نکالیں گے اور جنہوں نے ہمیں آرڈر دیا ہے ان تک پہنچادیں گے اور کے بعد ہمیں ان کے پیسے مل جائیں گے۔ ہاں سنو۔ ہمیں تمہارے گروپ کا بھی آرڈر آیا ہوا ہے۔ کیا خیال ہے بادشاہ آج ہی کیوں نہ اس آرڈر کو نمٹادیا جائے۔ کل پھر نئے سرے سے آپریشن کی تیاریاں کرنا پڑیں گی۔"

"جو آپ کا مرضی ہو صاب۔" اس وقت بادشاہ بھی مشینی انداز میں بول رہا تھا۔

"میں پولیس کو بتادوں گا۔"

"اب تم یہاں سے زندہ نکلو گے تو پولیس تک پہنچو گے نا۔"

"اگر تم روک سکتے ہو تو پہلے اس لڑکی کو کھولو۔" میں تیزی سے آگے بڑھا اور شیر خان کے ہاتھ میں دبے پستول کو دیکھ کر رک گیا۔

"شاباش شاہو۔ اب اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ ورنہ تمہارے جسم میں یہ چھ کی چھ گولیاں پیوست ہوجائیں گی' چلو بادشاہ۔ اپنا کام شروع کریں۔"

"جی صاب۔"

"یہ لو پستول۔ اسے نشانے پر رکھنا' یہ کوئی حرکت نہ کرے۔" بادشاہ نے مجھے نشانے پر رکھا اور شیر خان ایک انجکشن لے کر سنبل کی جانب بڑھنے لگا۔ غالباً یہ بے ہوشی کا انجکشن تھا۔ اچانک مجھے مورتی کا خیال آیا جو میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور پھر زور سے کہا۔

"تم دونوں اسی وقت اپنی جگہ ساکت ہوجاؤ۔"

میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ دونوں منجمد ہوگئے اور میں بھی حیران رہ گیا' پھر اپنی جگہ سنبھلتے ہوئے اس مورتی کی طاقت سے دل سے قائل ہوگیا۔ پھر میں اس لڑکی کی طرف بڑھا اور اس لڑکی کو کھول دیا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھے جارہی تھی پھر بولی۔

"یہ کیا کیا تم نے۔۔۔"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔۔۔ جلدی سے نکل چلو یہاں سے۔۔۔"

"اگر یہ ہوش میں آگئے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ میری مرضی کے بنا اب اصلی حالت میں نہیں آئیں گے۔۔۔"

"لیکن تم نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے۔۔۔"

"بس جتنی جلدی ہوسکے۔۔۔ یہاں سے نکلو۔"

"چلو۔۔۔" اس نے کہا اور ہم دوڑتے ہوئے کوٹھی کی عمارت سے باہر آگئے۔ کافی دور تک اسی طرح دوڑتے رہے۔ پھر سنبل ایک جگہ رک گئی۔

"کیا ہوا۔"

"وہ دیکھو۔" اس نے ایک بوتھ کی جانب اشارہ کیا اور پھر اس ٹیلی فون بوتھ کی جانب بڑھی میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

"ہمیں فون کرنے کے لیے سکے چاہیے ہوں گے۔"

"سکے یہ ہیں۔" میں نے ایک بار پھر مورتی کا استعمال کیا۔ میری جیب سکوں سے بھر گئی۔ میں نے چند سکے اس کی جانب بڑھائے۔ اس نے ریسور پکڑ کر اس میں سکے ڈالے اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ کچھ بیلوں کے بعد کسی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔ پولیس اسٹیشن۔"

"جی۔" آواز اتنی واضح تھی کہ مجھے بھی سنائی دی۔

"پچھلے کئی دنوں سے جو لاش ملی ہے جس کے دل گردے غائب ہیں اور اس کی سنسنی خیزی اخبارات میں چھائی ہوئی تھی میں اس گروہ کو جانتی ہوں۔ جو یہ کام کرتا ہے اور پھر ان کی لاشوں کو سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں۔"

"آپ کون ہیں اور کہاں سے بات کر رہی ہیں۔" دوسری طرف تندہی سے پوچھا گیا۔

"آپ میرا نام پتا چھوڑیئے اور ایک پتا نوٹ کریں۔۔۔ یہاں اس وقت اس گروہ کا سرغنہ اور ان کی لیبارٹری موجود ہے۔" اس نے پتا دہرایا اور فون بند کر دیا دوسری جانب اس کی شناخت پوچھی جا رہی تھی۔

"کیا وہ لوگ اپنی اصل شکل میں نہیں آئیں گے؟"

"آسکتے ہیں اگر میں چاہوں تو۔"

"تو آپ کم از کم تین گھنٹوں بعد ان کو اصل شکل میں لے آیئے گا۔ جب تک پولیس ریڈ ڈال دے گی اور ان کو ان کے خلاف ثبوت مل جائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" پھر میں نے مورتی ہاتھ میں لی اور تین گھنٹوں کا تصور کر کے مورتی واپس جیب میں رکھ لی۔

"اب کیا کریں۔ کیا تمہارا گھر اس شہر میں ہے۔"

"نہیں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں دارالامان میں رہتی تھی اور میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی ایک دن اخبار میں نوکری کا اشتہار دیکھا۔ انہیں صاف ستھرائی اور کھانا پکانے کے لیے ملازمہ کی ضرورت تھی۔ میرے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن انہوں نے مجھے رکھ لیا۔ میں بڑی خوش خوش واپس آئی تھی۔ اگلے دن میں نوکری پر گئی تو انہوں نے مجھے قید کر لیا۔ کہتے تھے اگر یہاں کام کرنا ہے تو باہر کی دنیا سے تعلق ختم کرنا ہوگا۔ اس وقت تو میں خاموش ہو گئی لیکن ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ پھر ایک دن میں وہاں سے بھاگ آئی۔ لیکن شیر خان نے مجھے تلاش کر لیا اور پھر مجھ پر قید سخت ہو گئی۔ یہ لوگ مجھے اس تہ خانے میں لے گئے کہ اگر دوبارہ ایسی حرکت کی تو تمہارا بھی یہ ہی حشر کریں گے۔ پھر انہوں نے میرا بلڈ گروپ چیک کیا اور کہا۔

"برا نایاب خون ہے تمہارا تو۔ اب تو تمہاری زندگی بھی لینی پڑے گی۔"

میں ان لوگوں سے ڈر گئی تھی۔ یہ لوگ رات کو اغوا شدگان کو لاتے اور ان کے اعضاء نکال کر رات کو ہی انہیں پھینک آتے۔ پھر یہ لوگ تمہیں یہاں لائے۔ تم کو اعتماد میں لینے کے لیے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ لیکن ان کا ارادہ تمہیں بھی نقصان پہنچانے کا تھا۔ اگر تم بروقت نہ پہنچتے تو تمہارا بھی یہی حشر کرتے اور تم سے پہلے میرا۔"

"بہرحال جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ فی الحال ہمیں سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں کوئی ہوٹل تلاش کرنا پڑے گا۔ کیا خیال ہے تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی۔"

"اگر میں واپس دارالامان گئی تو؟"

"تم میرے ساتھ چلو۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن ہوٹل میں قیام کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت پڑے گی اور وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس کا انتظام ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور پھر میں نے مورتی سے مدد لی۔ پھر اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور اس میں سے پانچ سو کے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آئے۔"

"یہ میں نے اس لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی کہ اگر مجھے وہاں سے بھاگنا پڑے تو کم از کم میری جمع پونجی تو میرے پاس محفوظ ہو۔"

"تمہارا نام۔" اس نے اچانک پوچھا۔ حالانکہ میں اسے اپنا نام بتا چکا تھا۔

"شاہو۔" میں مسکرایا۔

"میرا نام۔"

"جانتا ہوں۔ سنبل ہے۔"

"ہاں۔" اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ ابھری۔ جو اتنے دنوں میں پہلی بار میں نے دیکھی تھی۔

"چلو پھر کہیں چلیں یا یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ میں شوخ ہوا۔

"چلو۔"

"پھر ہم چلتے ہوئے مین روڈ تک آئے، وہاں ہمیں ٹیکسی مل گئی۔"

"چلو گے۔"

"کہاں جانا ہے صاب۔"

"کسی قریبی ہوٹل لے چلو۔"

"اچھا صاب۔" ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر دیا اور ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارا سفر خاموشی سے کٹا۔ پھر درمیانے درجے کے ہوٹل کے سامنے ڈرائیور نے ٹیکسی روکی۔

"جناب۔ یہ اخراجات کے حوالے سے مناسب ہوٹل ہے۔ اور آپ کے لیے بہتر ہوگا۔"

"ٹھیک۔ کتنے پیسے ہوئے۔" پھر پیسے دے کر ہم ہوٹل کی طرف بڑھ گئے۔ کمرہ حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں آسانی سے ایک کمرہ مل گیا اور ہم کمرے میں آ گئے۔ کمرہ مناسب سا تھا۔ زمین پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک آرام دہ کرسی۔ ایک چائنہ صوفہ اور ڈبل مسہری۔

"تم منہ ہاتھ دھولو، بھوک تو لگی ہوگی۔"

"اتنی مشکل سے جان بچی ہے۔ ابھی تو یہی کافی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا اور وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ نکھری نکھری لگ رہی تھی میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یوں دیکھتا دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

"شاہو تم جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔" اس نے کہا اور میں چونک پڑا۔

"ہاں ہاں۔ جا رہا ہوں۔" میں بھی شرمندہ سا ہو گیا۔ میں جب منہ ہاتھ دھو کر نکلا تو وہ آرام کرسی پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر بلا کی معصومیت اور کشش تھی۔ میں کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سنبھل گیا۔ دل نے دہکا، ارے شاہو یہ کیا۔ ایک ہی دن میں تو ہار گیا۔ وہ لڑکی کیا سوچے گی، چل ہٹ بری بات ہے۔

"سنبل۔ تم آرام سے مسہری پر لیٹ جاؤ۔" میں نے اسے متوجہ کرنا ضروری سمجھا۔

"ہوں۔" اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔

"میں کہہ رہا تھا کہ آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں قالین پر لیٹ جاؤں گا اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم محفوظ مقام پر ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ۔ تم نے ان لوگوں کو ساکت کیسے کیا؟"

"ایک بار مجھے ایک بزرگ ملے تھے۔ میں نے ان کی خدمت کی تو صلے میں انہوں نے مجھے ایک تحفہ دیا کہ میں جس کی طرف اشارہ کر کے کہوں گا وہ ساکت ہو جائے گا۔ بس اسی وجہ سے میں نے ان کو ساکت کیا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ میں سمجھی تمہیں جادو آتا ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔"

"پھر کیا خیال ہے۔۔۔ اب آرام کیا جائے۔۔۔"

"ہاں بالکل۔" پھر وہ مسہری پر لیٹ گئی اور میں تکیہ لے کر قالین پر لیٹ گیا۔ پھر میں کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ نیند کوسوں دور تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کے لیے میں اجنبی ہوں، لیکن وہ مجھ پر کتنا اعتبار کر رہی ہے یہ مجھ پر اعتماد ہی ہے کہ وہ میرے ساتھ آئی اور پھر وہ چاہے جانے کے قابل بھی ہے تب ہی تو مجھے دل کے اندر وہ محسوس ہونے لگی ہے۔ ماں باپ کے بنا بھی وہ بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ کافی دیر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر مجھے نیند آگئی۔

دوسری صبح ہم کافی دیر سے جاگے تھے اور میں جب اٹھا وہ منہ ہاتھ دھو کر فارغ تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو اس سے کہا۔

"میں ابھی ناشتے کا انتظام کرتا ہوں۔۔۔"

"میں ناشتے کا آرڈر دے چکی ہوں۔۔۔"

"واقعی۔"

"کیوں۔۔۔"

"تم واقعی سمجھ دار ہو۔۔۔"

"شکریہ۔" وہ ہنس دی۔

"اور خوب صورت بھی۔" میں نے کہا تو وہ شرما گئی۔ اتنی دیر میں ناشتا آگیا۔ جن میں ایک ڈبل روٹی۔ ہاف فرائی انڈے۔ پھل اور ایک پلیٹ میں بھنے ہوئے گوشت کا ایک پارچہ۔ ساتھ میں مکھن اور جیم۔ ایک کیتلی میں چائے۔

"اتنا ناشتا دو افراد کے لیے۔" میں نے کہا۔

"یہ سب میں کھاؤں گی۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"بالکل۔ کھانا شرط ہے۔"

"بالکل۔ کھا جاؤں گی۔۔۔" ویٹر نے میز پر ناشتا سجایا اور کہا۔

"میڈم اور کچھ۔۔۔"

"نہیں۔ بس اور نہیں۔۔۔" ویٹر گردن جھکا کر واپسی کے لیے مڑا۔

"سنو۔۔۔" اس نے اسے روکا اور میرے قریب آئی اور مجھ سے سو روپیہ مانگا۔

"کیوں؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی۔" اس نے کہا تو میں نے اسے پیسے پکڑا دیے۔ اس نے وہ پیسے ویٹر کو پکڑا دیے۔ وہ شکریہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا۔۔۔"

"یہ ہوٹلوں کے آداب ہوتے ہیں۔۔۔ تمہاری اس دولت پر میرا کوئی حق نہیں، لیکن یہ ضروری تھا۔ کیونکہ اس بے رحم دنیا میں صرف پیسے کی قدر ہے۔"

"پھر کوئی حرج نہیں۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔۔۔ اب وہ شخص ہمارا زیادہ خیال رکھے گا۔"

"بالکل یہی بات۔" اس نے کہا۔

"ارے بھئی چلو ناشتا کرو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے کہا اور ہم دونوں ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ وہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے میرے اور اپنے لیے کپوں میں چائے ڈالی۔ ایک کپ میری جانب بڑھایا اور دوسرا لے کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے کہا۔

"سنبل۔۔۔"

"جی۔۔۔" وہ کسی اور دھیان میں تھی۔

"تمہارا اب کیا پروگرام ہے۔۔۔"

"کس بارے میں۔۔۔"

"اب تم کہاں رہنا پسند کرو گی، یہیں اسی ہوٹل میں میرے ساتھ وقت گزارو گی یا کہیں اور جا کر رہو گی۔"

میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔ پھر میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ میں پریشان ہو گیا میں نے جلدی سے کہا۔

"ارے۔۔۔ تم رو کیوں رہی ہو، میں نے تو صرف تم سے یہ پوچھا کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے اور تم رونے لگیں۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاہو میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ بس تقدیر

کے ستارے گردش میں تھے کہ ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی۔ پھر تم میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے اور تم نے میری زندگی بچالی۔ جس کے لیے میں عمر بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔ اب اس کے بعد ظاہر ہے تم پر بوجھ نہیں بنوں گی اور اپنے لیے جینے کے راستے خود تلاش کروں گی۔ مجھے امید ہے کہ میں جلد ہی دنیا میں اپنے لیے جگہ حاصل کرلوں گی۔"

"کس طرح۔ آخر کس طرح۔ اگر تمہیں پھر کوئی شیر خان جیسا مل گیا تو اور یہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے' نہیں میں تمہیں ایسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ رونا دھونا بند کرکے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں' اس کو اس بھری دنیا میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا' لیکن میرے پاس اسے اپنانے کا کوئی جواز نہ تھا میں ٹھہرا ایک فقیر۔ زمانے کا ستایا ہوا۔ اگر اسے حقیقت بتادوں تو شاید وہ مجھے ٹھکرادے' پھر میں نے فیصلہ کیا کہ شیر خان کو سنائی کہانی کو برقرار رکھوں اور اسے شادی کی آفر کروں۔ اسے کہوں مجھے کچھ وقت دے۔ اس کے بعد ہم شادی کرلیں گے۔ ہاں یہ ہی مناسب رہے گا۔ میں نے اسے پھر کہنا شروع کیا۔

"دیکھو سنبل۔ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں ایک ایسا دوست چاہتا ہوں جو مجھ سے مخلص ہو اور میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں کہ تم میری دوست۔ میرا سہارا بنو۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم زندگی بھر کے لیے میرے ساتھ رہنا پسند کروگی۔ ایک ایسا دوست جو دکھ درد۔ خوشی میں' غمی میں' ہر عمل میں میری ساتھی بنو۔ یہ ایک مخلصانہ پیشکش ہے۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ بس یہ میری خواہش ہے۔"

سنبل حیران سی مجھے دیکھے گئی۔ پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔

"ارے ارے۔ یہ کیا کررہی ہو۔" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر مسہری پر بٹھایا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا پھر وہ بولی۔

"شاہو تم بہت اچھے انسان ہو کہ تمہاری اچھائی کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ تم مجھ سے میری مرضی پوچھ رہے ہو۔ میں کہتی ہوں یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تم جیسا ساتھی ملے۔ میں کسی طرح بھی رہ لوں گی۔ ہم روکھی سوکھی کھالیں گے' میں تمہارے ساتھ ہر حال میں رہنے کو تیار ہوں۔" اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اپنی کیفیت پر وہ خود ہی شرمندہ ہوگئی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس مجھے تمہاری رضامندی درکار تھی۔ اب ہم کس طرح رہیں گے کہاں رہیں گے' یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو' لیکن ایک بات مجھے پریشان کررہی ہے۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں ان دونوں کا کیا ہوا ہوگا۔ اگر پولیس نے ان کو پکڑ لیا ہوگا تو وہ جلد چھوٹ جائیں گے اور واپس آکر ہمیں تلاش ضرور کریں گے۔ اگر انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا تو ہماری شامت آجائے گی۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے۔۔۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔۔۔"

"ایک خیال ہے میرے ذہن میں۔۔۔"

"کیا؟"

"ہم یہ شہر ہی کیوں نہ چھوڑ دیں۔" اس نے کہا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے یہاں کون سے ہمارے عزیز ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ یہ شہر چھوڑ دیا جائے چنانچہ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے۔ ایک آدھ دن رکتے ہیں پھر چلے جائیں گے۔"

"یہی مناسب رہے گا۔۔۔"

پھر ہم نے سارا دن ساتھ گزارا۔ سنبل بہت خوش نظر آرہی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ اسے دنیا بھر میں ایک چاہنے والا مل گیا تھا۔ خوش تو میں بھی تھا' کہاں وہ ذلت کی زندگی وہ فقیرانہ ماحول اگر وہاں ہوتا تو یقیناً ابھی تک وہی گاڑی دھکیل رہا ہوتا' لیکن اب وقت

بدل آیا تھا۔ تقدیر مجھ پر مہربان تھی۔ وہ مورتی میرے پاس تھی جس سے میں ہر چیز حاصل کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں شہر جا کر وہاں کے ماحول کا جائزہ لوں گا۔ پھر مکان خریدنے کا فیصلہ کروں گا۔ میں سنبل کو زندگی کی ہر خوشی دوں گا۔ اب جانے کی تیاریاں شروع کرنی تھیں۔ نہ ہمارے پاس سامان تھا اور نہ کوئی اور چیز۔ پھر میں نے سوچا کہ کم از کم کپڑوں کے دو تین جوڑے ہمارے پاس ہونے چاہیے ہیں' چنانچہ میں سنبل کو بازار جانے کا بتا کر باہر نکل گیا۔

میں ہوٹل سے نکلا اور بازار جانے کے لیے ایک ٹیکسی لی۔ بازار سے اپنے اور سنبل کے لیے سلے ہوئے کپڑے خریدے یہ میرا کپڑے خریدنے کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد میں نے کپڑوں کا ایک بیگ خریدا۔ پھر میں جوتوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔ وہاں سے میں نے اپنے اور سنبل کے لیے ایک ایک جوتی خریدی۔ شاپنگ میں نے کر تو لی تھی۔ اب میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اب اسے یہ شاپنگ پسند آجائے۔ یہ سب چیزیں میں نے بیگ میں رکھ لیں تھیں پھر میں واپس ہوٹل چل پڑا۔ ہوٹل واپس آکر میں نے وہ بیگ سنبل کو دیا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔" اس نے پوچھا۔

"بیگ ہے۔۔۔"

"کیا ہے اس میں۔۔۔"

"بم۔" میں نے کہا اور وہ حیرت سے اچھل پڑی۔

"تو۔۔۔ تم۔۔۔ باہر سے بب۔۔۔ بم خرید کر لائے ہو۔۔۔" اس نے کہا اور میں ہنس پڑا۔

"بے وقوف ہو تم۔۔۔ کھولو اسے۔۔۔"

"نہیں۔ بم پھٹ جائے گا۔۔۔"

"ارے کوئی بم وم نہیں ہے' کھولو اسے۔" میں نے کہا تو اس نے میرے ہاتھ سے بیگ لے کر ڈرتے ڈرتے اسے کھولا اس نے جلدی سے اس میں سے سامان نکالا۔

"دیکھو کھولو اسے۔۔۔" میں نے کہا تو وہ تہیں کھولنے لگی۔

"بہت اچھے ہیں۔۔۔ کس کے ہیں۔۔۔"

"میرے۔" میں نے کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اب کیا تم یہ پہنو گے۔" اس نے مذاق اڑایا۔

"بے وقوف۔ ظاہر ہے میں تمہارے لیے لایا ہوں۔۔۔"

"میرے لیے۔۔۔" اس نے حیرانگی سے مجھے اور پھر کپڑوں کو دیکھا اور گردن جھکالی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"کپڑے پسند نہیں آئے؟"

"نہیں۔۔۔ بہت اچھے ہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔"

"میں جب چھوٹی سی تھی تو والدین مر گئے۔ اس کے بعد کسی نے مجھے کپڑے لا کر نہیں دیے۔ اتنی اپنائیت۔ اتنی چاہت سے کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ بس جو ملا پہن لیا۔ کھالیا اور تم نے۔ تم نے۔"

"کیا یار۔۔۔ ہر بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو' چلو جلدی سے آنسو صاف کرو۔"

"تم اپنے لیے کچھ نہیں لائے۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"لایا ہوں۔ دیکھو نا۔" میں نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کپڑے نکال کر اسے دکھانے لگا اور انہیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی رہی۔ پھر میں نے وہ سب چیزیں بیگ میں رکھیں اور اس سے کہا۔

"تم نے کھانا کھالیا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔"

"تو کھانا منگواؤ۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

"میں باہر دیکھتی ہوں کوئی ویٹر نظر آجائے۔"

سنبل نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ایک ویٹر نظر آیا۔ سنبل اس نے اسے پکارا۔

"جی میڈم۔" وہ قریب آکر مودب انداز میں بولا اور سنبل نے کھانا کا آرڈر کر دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹی تو میں نے کہا۔

"جی میڈم۔ اب کیا ارادے ہیں۔" میں نے ویٹر

کی نقل اتاری۔
"کس سلسلے میں۔"
"یہاں سے نکلنے کے سلسلے میں..."
"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایک آدھ دن میں یہاں سے نکلیں گے..."
"اصل میں مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ دونوں رہا ہو گئے تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے..."
"تو پھر۔"
"اور پھر یہ کہ اب کھانا کھا کر آرام کریں گے اور پھر یہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن جائیں گے۔ وہاں جو بھی گاڑی ملی اس میں بیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے۔"
"بالکل ٹھیک رہے گا۔" پھر کھانا آ گیا اور آرام کرنے کے لیٹ گئے۔ جب اٹھے اس وقت صبح کے چار بجے تھے۔
"اٹھو اور اب چلنے کی تیاری کرو۔" میں نے اسے آواز دی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور ہوٹل کے مین کاؤنٹر پر آ کر بل ادا کیا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ ہم ٹیکسی لے کر اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہاں ٹکٹ گھر میں بہت رش تھا۔ میں نے سنبل سے کہا۔
"یہاں تو بہت رش ہے اب کیا کریں؟"
"کوئی بات نہیں ٹکٹ ریل میں بنوا لیں گے۔" پھر ہم پلیٹ فارم پر پہنچے اور سامنے جو بھی ٹرین نظر آئی اس میں بیٹھ گئے۔ اندر ڈبے میں بھی وہی رش تھا۔ ہمیں مشکل سے سیٹ مل ہی گئی۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ نے وسل بجائی اور گاڑی نامعلوم راستے کی جانب روانہ ہو گئی۔
پہلا اسٹیشن تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا۔ پھر راستے میں کئی اسٹیشن آئے ہم چائے پیتے کھانے پینے کی اشیا خریدتے سفر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک بوڑھا میاں بیوی بھی بیٹھے تھے۔ بڑی بی نے سنبل سے پوچھا۔
"کتنے دن ہوئے ہیں شادی کو..." سنبل اس سوال پر شرما گئی۔ پھر بی بی خود ہی کہنے لگیں۔
"اس کا مطلب ہے نئی نویلی ہو..."
"جی..."
"بچوں کی عمر کم ہے..." بڑے میاں کہنے لگے۔
"ارے جب ہماری شادی ہوئی تھی تو بھلا کیا عمر تھی ہماری... یاد ہے آپ کو۔"
"ہاں... ہاں۔"
"کیا تھی بھلا..."
"یہی کوئی پچیس سال..."
"پچاس کے نہیں تھے کیا۔ جھوٹ مت بولیں۔"
"ارے میں جھوٹ بول رہا ہوں کیا..."
"تو اور کیا۔"
"پھر آپ ہی بتا دیں۔"
"آپ پندرہ کے تھے اور میں بارہ کی۔"
"اب بھی اتنی ہی لگتی ہو۔"
"باز نہیں آئیں گے کیا..." ہم دونوں ان کی نوک جھونک کا لطف لینے لگے۔ پھر میں نے بڑے میاں سے کہا۔
"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"
"ہم جلال آباد جا رہے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز کی شادی ہے، بہو اور بیٹے کے پاس وقت نہیں۔ اس لیے اس عمر میں ہمیں جانا پڑ رہا ہے۔"
"بڑی ہمت کی بات ہے۔"
"ہاں بھئی کرنا پڑتا ہے۔ کمبخت ہے بھی آخری اسٹیشن پر۔"
"اچھا۔" میں نے دل میں سوچا ہم بھی وہی اتریں گے۔
"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"
"ہم بھی وہیں جا رہے ہیں..." میں بے اختیار بولا۔
"کسی عزیز کے ہاں جا رہے ہو؟"
"ہوٹل میں قیام کریں گے..."
"ہوٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے ہمارے ساتھ رہنا..."
"جی نہیں... شکریہ۔ آپ نے کہہ دیا اتنا ہی بہت

ہے۔"

"بی بی، تم نئی نویلی دلہن کہیں سے نہیں لگتی۔" بڑی بی نے کہا تو سنبل کا رنگ فق ہو گیا۔

"وہ کیسے؟" بڑے میاں پھر شروع ہو گئے۔

"نہ کوئی زیور، نہ کوئی چمک والے کپڑے۔"

"بیگم۔ یہ اب تمہارا زمانہ نہیں رہا۔ اچھا ہے زیور نہیں پہنا ورنہ کسی کا کیا اعتبار۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ کسی کا کیا اعتبار، آئے سر پر پستول رکھا اور لوٹ مار مچا دی۔"

"بڑی سمجھ دار ہے ہماری بیگم۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" انہوں نے اس انداز سے کہا پھر چونک کر ہمیں دیکھا اور ہم تینوں ہنسنے لگے۔ سفر اسی طرح جاری رہا۔ پھر ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ڈبے میں ٹکٹ چیکر آ گیا۔ سب کے ٹکٹ چیک ہو رہے تھے۔ میں نے خوف زدہ نظروں سے سنبل کو دیکھا اور کہا۔

"سنبل۔۔۔"

"ہاں۔۔۔"

"ٹکٹ چیکر۔۔۔" میں نے اشارے سے کہا اس نے وہاں دیکھا اور اطمینان سے بیٹھی رہی۔

"وہ اسی طرف آ رہا ہے۔۔۔" میں اس کے اطمینان پر جھنجلایا۔

"تو کیا ہوا۔۔۔"

"اب وہ ٹکٹ مانگے گا۔"

"مانگنے دو۔۔۔"

"ہمارے پاس ٹکٹ نہیں۔" میں دانت پیس کر بولا۔

"ہم ٹکٹ بنوا لیں گے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" وہ نرمی سے بولی۔

"اچھا۔" میں خاموش ہو گیا چیکر ہمارے پاس آیا۔

"ٹکٹ۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔ جواب سنبل نے دیا۔

"جی ٹکٹ گھر میں رش تھا اور ہمیں جلدی تھی۔ اگر ہم ٹکٹ لائن میں لگتے تو ہماری ٹرین چھوٹ جاتی۔ آپ براہ کرم ہمارا ٹکٹ بنا دیں۔"

"جی بہتر۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔" وہ نرمی سے بولا اور ٹکٹ بنا دیا۔

"ایک ہزار روپے۔۔۔" اس نے ٹکٹ بنا کر تھمایا اور کہا میں نے ہزار روپے اسے تھما دیے۔

"ہم سے کہہ دیتے ہم ٹکٹ بنوا دیتے۔۔۔" بڑے میاں نے کہا۔

"جی بس۔۔۔ ہم پروگرام بنا چکے تھے اور بکنگ نہ ہو سکی۔۔۔ خیر اب ٹکٹ بن گیا نا۔" میں نے کہا۔

"چلو اب کوئی مشکل نہیں۔" انہوں نے کہا۔ یوں ہی ہنستے کھیلتے سفر گزر گیا۔ گاڑی جلال آباد کے اسٹیشن پر رکی۔ یہ ایک اچھا خاصا رش اسٹیشن تھا۔ سنبل نے اپنا بیگ پکڑا اور میں نے بڑے میاں کا سوٹ کیس تھام لیا۔

"ارے بیٹا۔ تم کیوں تکلیف کر رہے ہو؟"

"بابا۔ آپ نے بیٹا کہا تو تکلیف کیسی۔ چلو شاباش۔" سنبل نے کہا اور میں سنبل کی اس ادا پر فدا ہو گیا۔

اسٹیشن سے باہر آ کر بڑے میاں نے ٹیکسی روکی اور میں نے سوٹ کیس اس میں رکھا تب بڑے میاں ہماری جانب مڑے اور کہا۔ "ہاں بھئی بچو۔۔۔ کیا ارادہ ہے۔۔۔"

"کسی ہوٹل میں قیام۔۔۔"

"بھئی بیگم۔ دیکھو یہ بچے جا رہے ہیں۔"

"بیٹا ہمارے ساتھ چلو۔ بڑا اچھا ماحول ہے وہاں کا۔ تم کو لطف آئے گا۔"

"اماں جی۔ فی الحال ہمیں جانے دیں۔ ہم پھر ضرور ملنے آئیں گے آپ کے پاس۔" سنبل نے کہا۔

"چلو ایڈریس لکھ لو۔" بڑے میاں نے مجھے کہا تو میں ادھر ادھر دیکھنے لگا انہوں نے جیب سے پین نکال کر میری جانب بڑھایا تو سنبل نے جلدی سے پکڑ لیا۔

"لائیں میں لکھتی ہوں۔" وہ ایڈریس لکھنے لگی اور میں نے شکر ادا کیا کہ آج اللہ نے عزت رکھ لی۔ پھر وہ دونوں ہمیں دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

ہم نے ایک ٹیکسی روکی تو ٹیکسی والے نے کہا۔
"جی صاب۔ ہوٹل جانا ہے؟"
"ہاں۔۔۔"
"یہاں کے سب سے اچھا ہوٹل میں لے چلتا ہوں۔ ہر آسائش اور کرایہ بھی معقول۔"
"ٹھیک ہے۔" ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک ہوٹل کے سامنے جاکر رکا۔ ہم اندر گئے۔ کمرے کے لیے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بہرحال یہ میری کمزوری تھی کہ میں آگے ہوکر بات نہیں کرسکتا تھا اور اس کی وجہ میرا غیر تعلیم یافتہ ہونا تھا۔ کمرے میں آکر بھی میں اسی بارے میں سوچتا رہا۔
"کیا سوچ رہے ہو شاہو۔۔۔"
"کچھ نہیں۔۔۔"
"کچھ تو سوچ رہے ہو۔" اس نے کہا تو میں نے سوچا کہ جسے شریک سفر بنانے کا فیصلہ کیا ہو اس سے کیا چھپانا۔
"میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ ہوش سنبھالا تو خود کو وان پر نوکری کرتے ہوئے پایا۔ پھر مالک نے مجھے فیروز آباد بھیجا اور میں شیر خان کے چنگل میں پھنس گیا۔ تم خود سوچو میں تعلیم کہاں سے حاصل کرتا۔ اس لیے میں لوگوں سے بات کرتے ہوئے کتراتا ہوں۔"
سنبل مجھے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اب تم میرا مذاق اڑاؤ گی۔۔۔"
"میں کیوں اڑانے لگی تمہارا مذاق۔۔۔"
"یہی کہ۔۔۔"
"نہیں شاہو، میں صرف اس لیے مسکرا رہی تھی کہ تم اتنی چھوٹی سی بات کے لیے پریشان ہو رہے ہو۔۔۔"
"یہ اتنی سی بات ہے۔۔۔"
"جتنا میں نے پڑھا ہے اتنا تو میں آپ کو پڑھا دوں گی۔۔۔ ٹھیک ہے اسٹوڈنٹ جی۔۔۔"
"جی۔۔۔"
"صرف جی نہیں۔۔۔ میڈم کہو۔"
"جی میڈم جی۔۔۔"
"شام کو بازار چلیں گے اور کچھ بنیادی کتابیں لے کر آئیں گے جس سے تمہیں بات کرنے میں آسانی ہو۔۔۔"
"جی بہتر میڈم۔۔۔" میں نے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔
زندگی کا یہ انداز بھی نرالا تھا۔ اتنی اچھی لڑکی میرے پاس تھی اور پھر مورتی بھی تھی میرے پاس۔ اب زندگی کا ایک مقصد تھا کہ اس لڑکی کو بحیثیت شوہر زندگی کی تمام تر سہولیات دوں۔ میں اچھی جگہ جاکر ایک گھر، گاڑی لوں گا، لوگوں سے اچھے تعلقات بناؤں گا، سنبل مجھے پڑھنا لکھنا سکھائے گی، زندگی میں سکھ اور سکون ہوگا، ہم دونوں ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔
شام کو ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔ گھومتے گھماتے ہم کتابوں کی ایک دکان پر پہنچے۔ سنبل نے دو چار کتابیں خریدیں اور ہم باہر نکل آئے۔ راستے میں گول گپے کی ریڑھی دیکھ سنبل رک گئی۔
"کیا ہوا؟"
"میں گول گپے کھاؤں گی؟"
"اس طرح سڑک پر۔۔۔"
"تو کیا ہوا۔ لے دو نا۔" وہ بچوں کی طرح مچلی۔
میں نے گول گپے والے کو دو پلیٹیں بنانے کو کہا۔ پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مارکیٹ کے آخری سرے سے ایک لڑکی تیزی سے بھاگتی ہوئی برآمد ہوئی اور ساتھ میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ پھر اس کے پیچھے چار خطرناک شکلوں والے آدمی برآمد ہوئے۔ وہ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی نے چھلانگ لگائی اور لڑکی کو جھٹکا دے کر گرایا۔
"سالی۔۔۔ کتیا۔۔۔ بھاگ کر کہاں جائے گی۔ چل۔۔۔" اس آدمی نے لڑکی کا بازو اس شدت سے موڑا کہ وہ بلبلا کر کھڑی ہوگئی، لیکن اٹھتے ہوئے اس

نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور اس کا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بھاگنے لگی۔ میں نے مورتی نکالی اور اسے اس طرح نکالا کہ سنبل کو احساس نہ ہو۔ پھر میں نے خیال کیا کہ لڑکی کا پیچھا کرنے والے وہ لوگ ساکت ہو جائیں اور وہ چاروں اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ سنبل نے اچانک مجھے دیکھا اور معنی خیزی سے مسکرا دی۔

"یہ تم نے کیا ہے نا؟" اس نے سرگوشی کی۔

"تو اور کیا۔۔۔" میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔ لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے۔ لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بھی ان کی اس کیفیت پر حیران ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر آئی ان کو چھو کر دیکھا اور چیخ کر پیچھے ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے پھر سے بھاگنا شروع کیا۔ لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے میں نے گول گپے والے سے کہا۔

"بھائی گول گپے۔۔۔"

"ابے تمہیں گول گپے کی پڑی ہے' ادھر نہیں دیکھ رہے' پہلے وہ تماشا تو دیکھنے دو۔"

"تمہیں دینے ہیں کہ ہم آگے جائیں۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" اس نے کہا اور پھر گول گپے کی پلیٹ سیٹ کرنے لگا۔ سب لوگ یونہی کھڑے دیکھ رہے تھے۔ پھر پولیس کی گاڑی کا سائرن ہوا۔ وہ گاڑی ان آدمیوں کے قریب آکر رکی۔ پھر میں نے مورتی نکال کر ان کو متحرک کیا۔ وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"پولیس۔۔۔ بھاگو۔" ان چاروں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے انہیں پکڑ لیا تھا۔

اس کے بعد ہم نے گول گپے والے کو پیسے دیے اور آگے بڑھ گئے۔

"خوب تفریح رہی۔۔۔ لیکن شاہو ایک بات ہے۔۔۔"

"کیا؟"

"کبھی اپنی اس قوت کا غلط استعمال نہ کرنا۔۔۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں وہ کبھی اس کا غلط استعمال نہیں کروں گا۔ اب خوش۔"

"ہاں۔۔۔ خوش۔۔۔"

پھر ہم واپس ہوٹل آگئے۔ کھانا کھا کر وہ مجھے پڑھانے لگی۔۔۔ مجھے پڑھنے میں مزا آرہا تھا۔۔۔ اچانک وہ بولی۔

"شاہو۔۔۔"

"اب تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں۔۔۔"

"ابھی تو کافی سارے ہیں۔۔۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔"

"میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ جب یہ ختم ہو جائیں گے پھر۔۔۔"

"پھر کیا۔۔۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں۔۔۔ پھر کیا کریں گے۔۔۔"

"پھر کچھ نہیں کریں گے۔۔۔"

"زندگی کیسے گزرے گی۔۔۔"

"کچھ دن بعد میں ایک گھر اور گاڑی خرید لوں گا۔ اس کے بعد ہم نکاح کریں گے اور پھر۔"

"بس اتنا ہی کافی ہے۔" اس کا چہرہ گلاب ہو گیا۔

"یہ سب خریدو گے کیسے۔۔۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ ہم لیٹ گئے۔ کافی دیر یوں ہی لیٹا رہا۔ پھر میں نے سنبل کو دیکھا وہ سو چکی تھی۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس جگہ گیا جہاں کتابیں رکھی تھیں۔ پھر ایک کتاب کھولی اور مورتی پکڑ کر سوچا کہ اس کتاب کا ایک ایک حرف مجھے زبانی یاد ہو جائے۔ اس کے بعد کتاب کا ایک ایک حرف پلٹتا چلا گیا۔ اس طرح میں نے چاروں کتابیں یاد کر لیں۔ پھر میں نے لکھنے کی مشق کی۔ یہ بے شک سمپورنی کے کمالات تھے۔ پھر میں نے کتابیں رکھیں اور اپنی جگہ آکر لیٹ گیا' جلد ہی مجھے نیند آگئی۔

دوسری صبح ناشتا کرنے کے بعد میں نے سنبل سے کہا۔ "آج میں باہر جا کر حالات کا جائزہ لوں گا۔۔۔"

پھر ناشتے سے فراغت کے بعد تیار ہو کر باہر نکلا اور ایک ٹیکسی کو روکا۔ "جی صاب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے

کہا۔

"ریس کورس۔" میں نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ریس کورس اترا تو وہاں بے پناہ رش تھا۔ میں اس جگہ گیا جہاں بکنگ ہوتی تھی۔ یہاں مختلف کمپنیوں کی بکس تھیں۔ بک پر بیٹھے آدمی کو پیسے دینے سے وہ ایک کارڈ دیتا تھا اور اس کے بعد اپنے سامنے رکھی بک پر کچھ لکھ لیتا تھا۔ پھر پہلی ریس شروع ہوئی۔ اس میں' میں نے مورتی کو آزمایا اور پرسکون ہو گیا۔ میرا منتخب گھوڑا جیت گیا تھا۔

میں اسی وقت بکنگ کی جگہ پر ہی کھڑا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا وہ دوڑتا ہوا آیا۔

"لاؤ بکی' پیسے دو' جلدی کرو بھئی۔" اس نے کارڈ اس آدمی کو واپس دے دیا اور اس نے پیسے گن کر اسے پکڑا دیے۔

"ایک تو یہ کمبخت بڑا مسئلہ ہے۔ گھوڑا پلیس پر لگائیں تو مزہ آتا ہے۔ اب دیکھو نا' ون کا ریٹ کم ہوتا ہے بلاوجہ نقصان ہوتا ہے' اب کی دفعہ پلیس پر لگاؤں گا۔"

"تو پھر لگائیں نا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" انہوں نے کہا اور پیسے بکی کو پکڑا دیے اور پھر بولے۔

"گولڈن فاکس۔" اس آدمی نے کارڈ پر کچھ لکھ کر انہیں پکڑا دیا۔

وہ صاحب چلے گئے۔ لوگ آتے پیسے دے کر کارڈ لے جاتے پھر دوسری ریس شروع ہوئی۔ اس بار میں نے خاص طور پر ایک نام لیا تھا۔ "گولڈن فاکس۔" اور گولڈن فاکس جیت گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

"یہ ہوئی نا بات' اب دیکھو پلیس کے لیے گولڈن فاکس لگائی تھی اور جیت گئی۔ اب پیسے تو وہی پلیس والے ملیں گے نا۔" اس بار بڑے میاں نے مجھے مخاطب کیا۔

"جی جی۔۔۔" میں نے کچھ نا سمجھتے ہوئے بھی کہہ دیا۔

"کیا۔۔۔ جی جی لگا رکھی ہے تم نے کس پر لگائے ہیں؟"

"میں نے ابھی پیسے نہیں لگائے۔"

"تو لگاؤ نا۔۔۔"

"جی۔۔۔"

"پھر جی۔ ارے بھئی چلو۔" وہ مجھے لے کر اسی بک والے کے پاس گئے۔ میں حیرانی سے ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"اب میری شکل کیا دیکھ رہے ہو نکالو پیسے۔" اور میں نے جیب میں سے پانچ ہزار نکالے بڑے میاں نے پیسے دیکھے اور کہا۔

"بس پانچ ہزار۔۔۔"

"میرے پاس اتنے ہی ہیں۔" میں نے کہا اور انہوں نے میرے ہاتھ سے پیسے لیے اور بکی کو دے دیے۔

"مہاراجہ۔" بڑے میاں نے کہا اور اس آدمی نے پیسے لے کر ایک کارڈ پر کچھ لکھا اور مجھے پکڑا دیا۔ اس کارڈ کے دو حصے تھے۔ ایک پر ون لکھا تھا اور ایک پر پلیس۔۔۔ پلیس والے حصے پر گھوڑے کا نام اور ریٹ لکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک فقیر۔ جس نے ساری عمر لوگوں کی دھتکار سنی اور بیک مانگی وہ کبھی ایسے بھی بڑھ سکے گا اور آج میں بنا پریشانی کے فر فر انگلش پڑھ رہا تھا۔ پھر بڑے میاں نے ایک دوسرے گھوڑے پر اچھے خاصے پیسے لگائے۔ میں حیرانی سے ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کارڈ دیکھا پھر میری طرف۔ پھر زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"بیٹا' چار پیسے لگا کر ہارو اور گھر جاؤ۔ شاباش۔۔۔ شاباش۔۔۔" بڑے میاں نے ہنستے ہوئے کہا مجھے بڑا غصہ آیا۔ پھر ان پر ترس آیا۔ پھر میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔۔۔ پھر ریس شروع ہوئی اور پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ مہاراجہ ریس جیت گیا۔ بڑے میاں تقریباً" روتے ہوئے واپس آئے۔ میں نے بھی اپنا کیش وصول کیا اور اگلی ریس پر لگانے لگا۔ پھر چوتھی۔ پانچویں ریس پر بھی میرا ہی گھوڑا جیتا

تھا اس کے بعد ریس ختم ہونے کا اعلان ہوا۔ میں نے اطمینان سے رقم سنبھال کر جیب میں رکھی اور واپس چل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے دس ہزار الگ کر لیے تھے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے پیسے سنبل کی طرف بڑھا دیے۔

"پورے دس ہزار ہیں۔" وہ اچھل پڑی۔

"یہ آپ کے پاس پھر دس ہزار ہو گئے ہیں۔"

"بس انتظام ہو گیا ہے۔ اب سنبھال کر رکھنا' جتنے مرضی خرچ کرنا لیکن ضرورت کے حساب سے....."

"لیکن یہ آپ کے پاس آئے کہاں سے۔"

"نہ میں نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے اور نہ کسی کو تا ہے بس تھوڑا سا قوت کا استعمال کیا ہے' اور بس کے آگے دیکھو میں کرتا کیا ہوں تمہارے لیے۔"

"تم میرے ساتھ ہو میرے لیے یہ ہی سب سے ی خوشی ہے....."

"کل میں رات کو نکلوں گا۔ ایک کام کے لیے جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔"

"کچھ کام ہے....."

"ٹھیک ہے....." اس نے کہا اور شکر ہے کہ وہ مطمئن تھی۔ پھر رات کو جب وہ سو گئی میں نے جیب سے رقم نکال کر گنی۔ پورے چالیس ہزار تھے۔ میں نے وہ رقم سنبھال کر دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ دوسرا دن میں نے ہوٹل میں گزارا اور شام کو نیچے اتر ۔ میں نے استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں کون کون سے کلب اور کن جگہوں پر ہیں۔"

"جی ایک منٹ....." اس نے ایک کارڈ نکال کر ے سامنے رکھ دیا اس کارڈ پر مختلف جگہوں کے نام تھے میں نے پھر اسے کہا۔

"یہ میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں....."

"جی نہیں سر۔ آپ صرف کلب کا نام پتہ نوٹ یں اور وہاں چلے جائیں۔"

"بہتر....." پھر میں نے ایک کلب کا نام پتا نوٹ کر لیا اور باہر نکل گیا۔

(جاری ہے)

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگرایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

مہم

احمد صغیر صدیقی

قتل و غارت گری کے خونی سلسلے کے ضمن میں جیک دی رپر کا نام ہلاکتوں کی تاریخ میں بہت نمایاں کہا جاسکتا ہے سنہ 1800ء کے آخری عشرے میں لندن میں سلسلے وار قتل کی وارداتیں شروع ہوئی تھیں۔قتل کا انداز یکساں تھا وہ عموماً اکیلی عورتوں کو نشانہ بناتا تھا یا پھر طوائفوں کو۔ اس کہانی سے لطف اندوز کے لیے قارئین کی توجہ ادھر مبذول کرائی جا رہی ہے۔ جیک دی رپر کا کبھی کوئی سراغ نہیں مل سکا مگر اس پر بہت افسانے تخلیق کیے گئے ہیں یہ کہانی بی انہی کہانیوں میں سے ایک ہے۔

ایک قاتل کی ڈائری سے سسپنس پارہ

پیر

میں نے رہائش اختیار کرلی ہے کمرا چھوٹا سا ہے۔

اس میں ایک بستر ہے میٹرس والا‘ دو عدد کھڑکیاں ہیں جو باہر کی ایک تنگ سی گلی میں کھلتی ہیں۔ سامنے کے مکان کے گیندوں کی وجہ سے یہ کمرا تاریک سا رہتا ہے۔ گرمیوں میں یقیناً” یہ کمرا بہت گرم ہوتا ہوگا۔ اسی طرح سردیوں میں ٹھنڈا‘ خوش قسمتی سے ابھی موسم معتدل ہے۔ مکان مالکہ فراڈ ماگر کو کوئی اچھا نہیں کہتا مگر میرے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ زیادہ کرایہ بھی نہیں لیا ہے۔ شاید یہاں کوئی واقعہ ہوا ہے۔ میں اس کا پتا کروں گا۔ دوسرے کرائے داروں سے پوچھوں گا۔

ابھی تک میں نے صرف ایک کو دیکھا ہے۔ یہ ایک لمبے قد کی زرد رو سی لڑکی ہے۔ سیاہ لباس میں تھی سر پر جوڑا باندھا ہوا تھا۔ نقش عام سے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسی نے مجھے آنکھیں پھیلا کر خوف زدہ انداز میں دیکھا تھا۔ حالانکہ میں کوئی ڈراؤنا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے مکان مالکہ نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی ایک لیڈ[illegible] ڈریس کی دکان میں ملازم ہے۔ جو شہر میں ہے ادھر [illegible] دنوں سے بیماری کی باعث یہ اپنے کمرے تک ہی محد[illegible] رہی تھی۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ ڈاک[illegible] کا بل ادا کرسکتی۔

آج کل زندگی کا حال یہی ہے۔ برلن شہر میں بھ[illegible] یہی حالت ہے۔ بس ادھر وقت زیادہ ہے اور شو[illegible] بہت۔ میں نے اپنے دن کا بڑا حصہ سامان کھولنے او[illegible] سیٹ کرنے میں لگایا ہے میرے پاس ایک سوٹ کیس[illegible] ہے اور ایک بڑا سا کاغذی پارسل۔ یہ پارسل بھرا[illegible] ہے مگر اس کی کوالٹی اچھی ہے۔

جب میں یہاں آیا تھا تو فراڈ ماگر نے اسے مشکوک[illegible] نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری شخصی[illegible] ایسی نہیں جسے نمایاں کہا جاسکے۔ اس لحاظ سے یہ اچھ[illegible] بات ہے کہ میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے ا[illegible] ہی شخصیت درکار ہے۔ جو بھیڑ میں نمایاں نہ ہو۔ م[illegible]

اوور کوٹ بھدا سا ہے اور جوتے گھسے ہوئے ہیں۔ مگر میں انہیں کسی ہمسائے سے پالش لے کر چمکالوں گا۔ ویسے میرے پاس رقم بھی ہے۔

میں یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ میرے خیالات اور حرکات کا ریکارڈ رہیں اور بعد میں کام کی ثابت ہوں گی۔ میں اخباروں میں بھی لکھنا چاہتا تھا۔ مگر اب تذبذب میں ہوں۔ جب میں کلون میں تھا میں نے لکھا تھا اور دلچسپی کا باعث بھی خوش قسمتی سے مجھے ایک شناسا نے بتادیا تھا کہ پولیس میرے خیالات میں دلچسپی لے رہی ہے۔ بس میں کلون سے اس لمحے نکل لیا تھا۔ اس جگہ مجھے خاصا محتاط رہنا ہے۔ میں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا میرے والد کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا تھا کہ میرے اندر ایک ایسی مکاری چھپی ہوتی ہے جسے مافوق الفطرت کہا جا سکتا ہے۔ یعنی میں کسی واقعہ کے ہونے سے پہلے ہی اسے بھانپ جاتا ہوں۔ غریب آدمی عجیب سی موت سے دوچار ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آسکا تھا۔

میرے بستر کے پاس دیوار پر ایک گندہ سا کلینڈر لٹکا ہوا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کے پچھلے مہینوں کو پھاڑا نہیں گیا تھا۔ میں نے انہیں نکال لیا ہے۔ ان کی پشت سادہ ہے۔ میں انہیں رائٹنگ پیپر کی طور پر استعمال کروں گا میں نے کمرے کی آخری کھڑکی کھول دی ہے۔ اس سے اس گھٹے ماحول میں ہوا آنے لگی ہے۔ میں یہاں کرسی پر کھڑے ہو کر نیچے کی گلی دیکھ سکتا ہوں اور اس میں چلتے راہ گیروں کو بھی۔

اب میں بستر پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے کلینڈر کے گزرے دنوں کو کراس کر دیا ہے۔ اور پیر کے دن کے گرد دائرہ بنادیا ہے۔ تاکہ مجھے آج کے دن کا علم رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم گزرے دن کو واپس کیوں نہیں لا پاتے۔ ہو سکتا ہے سائنس دانوں کے پاس اس کا کوئی جواب ہو۔

میں نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ سہ پہر ڈھل چکی ہے۔ گوبھی کے سوپ کی بو فضا میں پھیل رہی ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے ناشتے میں بس ایک کپ چائے لیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے اپنا پرس نکالا حال کے لیے چند مارک موجود تھے۔ مگر آئندہ کے لیے اس کے لیے کوئی قریبی سستا سا کیفے موزوں تھا۔

مجھے بہرحال اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے' کیتھرائن کہتی تھی۔ میں بہت لاغر اور دبلا ہوں۔ کسی میڈیکل اسٹوڈنٹ کے لیے یہ بات ٹھیک نہیں پتا نہیں وہ اب کہاں ہے؟ اچھی لڑکی تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی دبلی تھی۔ اس نے کلون میں میری خاصی مدد کی تھی۔

میرے سر میں ابھی تک ہلکا ہلکا درد ہے میں سمجھتا ہوں۔ یہ اس شراب کا اثر ہے جو میں نے رات یان ہوف میں پی تھی۔ جو نہایت بری تھی۔ کمرا ٹھیک کرنے کے بعد میں نے لیمپ جلا کر اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ کمرا برا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی تھوڑی سی چیزیں اچھی طرح سجادیں تھیں۔

میں نے لیمپ کو ہلا کر دیکھا تو اندازہ ہوا اس میں تیل نہیں رہا ہے۔ باہر تو روشنی ہے مگر اندر اندھیرا ہے اور مجھے لکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوگی۔ میں فراڈ ماگر سے کہنے جا رہا ہوں کہ وہ تیل فراہم کر دے۔ اس کے کچن میں میں نے کچھ خالی ڈبے دیکھے تھے یہ سب تیل کے تھے۔ کوئی بارہ عدد۔ یہاں بارہ عدد کمرے تھے۔ معلوم نہیں سب اٹھے ہوئے تھے یا کچھ خالی بھی تھے۔ یہ ایک اہم بات معلوم کرنا ہوگا۔

میں نے اپنا کیس بستر پر رکھ دیا ہے۔ میں اس کے اندر کی چیزیں ذرا ٹھیک سے دیکھنا چاہتا ہوں اس کے تالے عمدہ ہیں۔ میری غیر موجودگی میں اس کی اشیاء محفوظ رہیں گے۔ بے شک فراڈ ماگر کے پاس اس کمرے کی ایک کنجی ہے اور ایک لڑکی بھی صفائی پر ملازم ہے۔ میں اپنی تحریروں کو البتہ یہاں نہیں چھوڑوں گا اس قسم کی جگہوں پر پرائیویسی کو جو نقصان پہنچ سکتے ہیں ان کی داستان طویل ہے۔

ان کو بھی میں نہیں لکھوں گا۔ بعد میں اگر میں مشہور ہوا تو دیکھا جائے گا۔

میں نے کمرے میں کونے میں ایک چھوٹا سا پردہ دیکھا ہے مجھے امید تھی اس کے پیچھے ایک محراب ہوگی

اس کے عقبی حصے میں ایک آئینہ ہے اس کے تلے ایک اسٹون کا سنک ہے۔ اور نالی بھی ہے۔ اس کی اوپر ایک بڑی سی براس ٹیپ بھی ہے۔

میں نے اسے گھمایا تو ٹھنڈا پانی بہنے لگا۔ یہ اچھی چیز ہے میں نہا سکوں گا گرم پانی مجھے نیچے سے مل سکتا ہے۔ مجھے گرم پانی کی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس استرا ہے جس سے میں شیو کر سکتا ہوں۔ اس کی دھار ذرا مر گئی ہے۔ اور میں نے اپنے نئے سیفٹی ریزر کو ابھی استعمال نہیں کیا ہے۔

میں نے رقم دیکھ لی ہے اس سے کام چل جائے گا۔ اگر میں نے احتیاط سے خرچ کیا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ کلون میں جو ہوا اس سے میں خاصا ڈر گیا ہوں۔ اگر وہ عورت نہ ہوتی تو کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ اس بوڑھی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی آنکھیں اور کان اتنے تیز ہوں گے۔ بقول میرے والد کے میری چھٹی حس نے مجھے بچالیا تھا۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے مجھے۔

میں نے اپنا عکس آئینے میں دیکھا ہے۔ میں خوش شکل تو نہیں مگر برا بھی نہیں ہوں۔ برلن میں بھیڑ ہوتی ہے میں اس میں آسانی سے کھو جاؤں گا۔ شکر ہے خدا کا۔

اس جگہ میں بتادوں میں مزاجاً "دہریہ ہوں۔ یہ جملہ تو عادتاً" میرے منہ سے نکلا میں ویسے اکثر خود کلامی کرنے لگتا ہوں۔ مجھے ادھر سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

اس کمرے کی دیواریں پتلی سی ان میں دراڑیں ہیں۔ میں نے نل سے منہ ہاتھ دھو کر خود کو تازہ کیا ہے۔ میرے سر کا درد ختم ہوگیا ہے۔ اب میں کمرے سے نکلنے والا ہوں۔ پہلے دیکھوں گا سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ مجھے ادھر ایسی جگہ ڈھونڈتی ہے جہاں کم پیسوں میں کھایا جاسکے۔

تاہم میں کہیں دور بھی نہیں جانا چاہتا۔ ورنہ میرا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ مجھے اپنی دور رس نظر پر بھروسا ہے۔ میں پاہی لوں گا۔ میں نے اپنے جوتے رگڑ کر صاف کیے ہیں۔ اب میں نکلتا ہوں۔ میں پلٹ کر لیمپ بجھا دیا ہے۔ دروازہ احتیاط سے مقفل کیا ہے۔

فراڈ ماکر کا تصور کر کے میں مسکرایا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کرتا کیا ہوں۔ ورنہ یہ سوال ٹیڑھا ہوتا۔

کنجی جیب میں ڈال کر میں نے سیڑھیاں اتری ہیں۔ زینے چرچراتے ہیں مجھے کچھ نظر آیا ہے۔ نچلی منزل پر کچھ ہلکی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ میں بغلی دروازے سے باہر جاتا ہوں اور گلی میں تیز چلتا ہوں۔ تاکہ راہ گیروں کا حصہ بن جاؤں۔

☆ ☆ ☆

مجھے کھانے کے لیے ایک معقول جگہ مل گئی ہے۔ یہ مین روڈ سے ہٹ کر ایک گلی میں ہے۔ اور کئی عمارتوں کے درمیان میں ہے۔ یہاں نہ بھیڑ ہوتی ہے۔ نہ سناٹا۔ میرے لیے عمدہ جگہ ہے۔ ادھر عموماً" نچلے طبقے کے لوگ آتے ہیں۔ اکیلی عورت کوئی نہیں آتی۔

یہاں مسافر بھی آتے ہیں۔ اپنی میز سے میں باہر بھی دیکھ سکتا ہوں۔ بچوں لڑکیوں بوڑھوں وغیرہ کو گزرتے۔ جبکہ میں خود کسی کو نظر نہیں آتا۔

میں انہیں دیکھ رہا ہوں ایک لڑکی میری نظر میں آئی ہے وہ لمبی اور سڈول ہے۔ اس نے لمبی ڈریس پہن رکھی ہے مگر اس کا سینہ بھرا بھرا ہے سر پر اس نے ہیٹ پہن رکھا ہے۔ اس کی عمر یہی بائیس سال ہوگی۔ وہ مجھے کئی بار ادھر ادھر چلتی نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ وہ بہرحال کوئی خراب لڑکی نہیں لگتی۔

میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں ویٹر نے آکر یہ سلسلہ روک دیا ہے۔ یہ جوان آدمی ہے اس کی قمیص پر دھبے ہیں۔ لڑکی اب نظر نہیں آرہی میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ میں نے بہت کم کھایا ہے۔ میں اب باہر دیکھنے لگا ہوں۔ لڑکی کی نا موجودی نے مزا خراب کر دیا ہے۔

اب میں اندر توجہ دے رہا ہوں جہاں لوگ جا رہے ہیں۔ میرے نزدیک میز پر تین آدمی بیٹھے ہیں۔ ان کے چہرے کھردرے ہیں۔ ان کے پاس لیدر ٹیمپل کیس

رکھے ہیں۔ جس سے اندازہ ہورہا ہے یہ سفری سیلز مین ہیں۔

ان کے درمیان کچھ بزنس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں غور سے سن رہا ہوں۔ کبھی کبھی وہ ہلکتی آواز میں کسی لڑکی کا ذکر بھی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے چہرے اور باتوں کی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ میں اب یہاں اٹھ رہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کے اٹھنے کا انتظار ہے۔ وہ اٹھ پڑے ہیں اور کیش ڈیسک کی طرف جا رہے ہیں جہاں ایک معمر عورت ہیجر کھولے بیٹھی ہے۔

ان تین میں سے ایک آگے ہے اس کا مطلب ہے بل وہی دے گا۔ اس نے جیب سے پرس نکالا ہے۔ یہ خاصا پھولا ہوا ہے۔ میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اور میری کہنی اس کے اس ہاتھ سے ٹکرائی ہے جس میں پرس ہے۔ بٹوہ گر جاتا ہے۔ سب کچھ میری منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔ میں اپنے پیشے میں ماہر ہوں۔ اس کے منہ سے۔

"ارے..... ررر" کی آواز نکلتی ہے۔ بٹوے سے زمین پر بہت سے نوٹ بکھر جاتے ہیں۔ میں عجلت سے معافی چاہتا ہوں کے الفاظ ادا کرتا ہوں۔ اور جھک نوٹ سمیٹنے لگتا ہوں۔ میں انہیں اسے دیتے ہوئے پھر معذرت کرتا ہوں۔ وہ نوٹ لے لیتا ہے اور انہیں گننے لگتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ کتنے ہیں بلکہ بل کی ادائی کے لیے۔ باقی نوٹ وہ بٹوے میں ٹھونس لیتا ہے۔

میں اپنی ادائیگی کر کے چل دیتا ہوں وہ تینوں آگے ہیں۔ اور اپنے پلان ڈسکس کر رہے ہیں۔ وہ باہر نکل کر الگ ہو رہے ہیں۔ میں لوگوں میں خود کو گم کر لیتا ہوں۔ میری نظریں راہ گیروں میں لڑکیوں کو دیکھ رہی ہیں۔ یہاں مجھے فقیر بھی نظر آ رہے ہیں۔ خوانچے والے بھی۔ ایک گاڑی میں ایک اپاہج آدمی بیٹھا ہے جسے ایک بوڑھی عورت دھکیل رہی ہے۔

میں چلتے چلتے اس کی کیپ میں ایک سکہ ڈال دیتا ہوں۔ اس وقت میں اس پوزیشن میں ہوں کہ کچھ فیاضی کر سکوں۔ میں اپنی جیب میں پڑے چند نوٹوں کو چھوتا ہوں یہ کڑکڑا رہے ہیں۔ ابھی میں انہیں نہیں گنوں گا۔ یہ کام میں گھر پہنچ کر کروں گا۔ چلتے ہو... اچانک گلی کے منہ پر وہ لڑکی نظر آتی ہے۔ جو قدر... بے چارگی سے کھڑی ہے۔ وہ بار بار اپنے دستانہ پو... ہاتھوں کو مل رہی ہے۔ پھر وہ مڑتی ہے اور راہگیرو... میں شامل ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کا پیچھا شروع... دیا ہے۔ احتیاط سے۔

وہ لڑکی شاید اپنا وقت گنوا رہی ہے۔ مجھے اس... ساتھ چلتے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے۔ یہ سفر دائرے کا... ہم اب اسی کیفے کے سامنے ہیں جہاں میں نے کھ... کھایا تھا۔ اب رات ہو گئی ہے اور لیمپ جلا دیے گ... ہیں۔ میں گلی کے سرے پر ہوں معا" مجھے چاپیں سنا... دیتی ہیں۔ یہ ایک نوجوان ہے۔ بغیر ہیٹ کے یہ نوجوا... آگے بڑھ کر تیزی سے لڑکی کو بازوؤں میں بھر لیتا ہے... لوگ اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

میرے لیے اب اس کے ساتھ جانے کی ضرور... نہیں۔ مجھے محرومی کا احساس ہو رہا ہے اور غصہ آ... ہے۔

جب میں اپنے کمرے کی طرف چلا تو مجھے کچھ نظ... نہ آیا۔ پھر کہیں دور سے کسی کمرے سے کچھ باتوں... آوازیں مجھے سنائی دیں۔ راہداری ایک گیس جیس... جل رہا تھا۔ میں نے فراڈ ماگر کے کچن سے وہ کین ا... لیا۔ جس پر میرے کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ میں... کمرے میں پہنچ کر لیمپ بھرا۔

کمرے کا دروازہ مقفل کر کے میں نے پردے گ... دیے میں نے ہاتھ صاف کیے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھ... میں نے جیب میں پڑے نوٹ نکالے اور گننے لگا یہ... تھے کوئی سومارک کے قریب رقم تھی۔

صرف چند سیکنڈ کی محنت کا نتیجہ۔ اب میں آرا... سے ہفتہ بھر رہ سکتا تھا۔

جس لڑکی کو میں نے دیکھا اس کا چہرہ مجھے یاد آ... تھا۔

میں نے نوٹوں کو لیدر باڈی بیلٹ میں رکھ دیا۔ او... بستر پر لیٹ گیا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو کلاک...

اندازہ ہوا کہ بارہ بج رہے ہیں۔ میں نے اٹھ کر کپڑے بدلے لیمپ کو سائڈ ٹیبل پر لایا۔ پھر اسے بجھادیا۔ اس کے بعد میں دوبارہ بستر پر گر کے سو گیا۔

☆ ☆ ☆

منگل

آج صبح مجھے پہلی بار فراڈ مگر کے ہاں ناشتے کا تجربہ ہوا۔ یہ بات عجلت سے بتانے کی نہیں ہے۔ میں نے اب سے پہلے اس قدر جھگڑیلو کرائے دار نہیں دیکھے تھے جیسے یہاں تھے اور یہاں جو ناشتا لگا تھا وہ ایسا تھا کہ ایک بار کھانے کے بعد ناشتے ہی سے نفرت ہو سکتی تھی۔ کافی کڑوی تھی۔ بوٹیوں سے بو آ رہی تھی۔ یہاں رہنے والی کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جس کی طرف دیکھنے کی خواہش ہوتی۔

میں نے فردا" فردا" لوگوں کو دیکھا۔ ایک بوڑھا تھا۔ یہ شاید کوئی کلرک تھا۔ اسی طرح کے دو کلرک اور تھے ایک معمر آدمی تھا۔ اس کے کالر پر کوئی تمغہ لگا ہوا تھا۔ لوگ اسے ہربانیں کہہ کر پکار رہے تھے۔ میں نے ان میں چند لڑکیاں بھی دیکھیں۔ بہت معمولی شکلیں تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ہربانیں جو شاید کوئی ریٹائرڈ فوجی ہے میری طرف راغب ہو رہا ہے۔ مگر میں اس کی سمت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس ضمن میں کچھ خطرہ سا بھی محسوس ہوا۔ میں نے طے کیا آج کے بعد سے میں یہاں ناشتا نہیں کروں گا۔

ضرورت کے پیش نظر میں نے ایک سنجیدہ سے چہرے والے اوسط عمر کے آدمی سے باتیں شروع کریں۔ میں نے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا مگر یہ معلوم کر لیا کہ یہ آدمی کسی کوئلہ گیس کمپنی میں ہے۔ یہ لنگڑا بھی تھا اور غیر شادی شدہ بھی ادھر وہ ریٹائرڈ فوجی اپنی دونگی اڑائے جا رہا تھا۔ موقع ملتے ہی میں یہاں سے نکل لیا۔ اور ایک بیئر گارڈن میں بیٹھ کر میں نے شراب پیا۔ پھر میں ہجوم کو دیکھنے لگا۔ بہ ظاہر میری نظریں سرسری تھیں مگر میں انہیں ایک خاص مقصد سے دیکھ رہا تھا۔

جس قسم کی عورت کی مجھے تلاش تھی وہ یا تو کسی جوان کے ساتھ نظر آئی یا گروپ کے ساتھ بقیہ کا ذکر بیکار ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کوئی تیاری نہیں کر رکھی تھی۔ اپنے پیشے سے متعلق کوئی بھی چیز میرے پاس نہیں تھی۔ انہیں میں نے کلون میں ایک ویران کنویں میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ بہت مجبوری میں کرنا پڑا تھا۔ برلن اب واحد جگہ تھی جہاں میں ہر وہ چیز پا سکتا تھا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ یہاں میں اپنے مقاصد حاصل کر لوں گا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں میرا نام مشہور ہونے والا تھا۔

ویٹر میرے گرد منڈلا رہا تھا۔ میں نے بیئر کا ایک گلاس اور منگایا۔ پھر میں نے لفافے کے ٹکڑے پر چند سطور لکھیں۔ جب گلاس آ گیا میں نے ادھر دیکھا جدھر گارڈن کا دروازہ تھا۔ ادھر مجھے ایک مانوس سے جسم والی لڑکی چلتی دکھائی دی۔ مگر جب اس کا چہرہ نظر آیا تو پتا چلا وہ کوئی اور ہے اس کے بعد میں نے چند گھنٹے ایک میوزیم میں گزارے۔ میں نے ازمنہ قدیم کی تصاویر دیکھتے ہوئے کہا "وہ زمانہ بھی کیا تھا۔ تب یہ طبقاتی باتیں نہیں تھیں۔" مجھے احساس ہوا کہ میوزیم کا ایک ملازم مجھے غور سے دیکھے جا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری ذات میں دلچسپی لے۔ میرا لباس معقول ہے اور صاف ہے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں کو نیم وا رکھوں تاکہ ان کی چمک سے کوئی میری طرف متوجہ نہ ہو۔

بدھ

اس لڑکی کو میں نے پھر دیکھا ہے۔ شاید وہ ادھر ہی کہیں رہتی ہے۔ اس کا نام اپنا ہے آج سہ پہر کو میں نے سڑک پر اسے ایک عام سی لڑکی کے ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ ان دونوں میں گہری دوستی لگتی تھی۔

مگر میں ایک مارکیٹ میں کہیں کم کر بیٹھا میں وائن گارڈن میں جا بیٹھا اور لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اچھا مشغلہ ہے ویٹر نے شاید میری عادت کا نوٹس لے لیا

ہے کہ میں اپنے ناخن اپنے جیبی چاقو سے کاٹتا رہتا ہوں۔ اس کا پھل ذرا بڑا ہے شاید اس لیے یہ ویٹر بے چینی محسوس کرتا ہے۔

میں یہاں سے اٹھ کر دوسرے سرے پر جا رہا ہوں ادھر بھی ویٹر ہیں۔ ادھر میرے چاروں طرف نئے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے سامنے ایک گلاس رکھا جس نے مجھے تقریباً" چھپا رکھا ہے۔ اب مجھے اس ویٹر کی فکر نہیں۔ فضا میں ایک ملٹری بینڈ کی آواز گونج رہی تھی جیسے جیسے یہ آواز قریب آ رہی تھی۔ لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر میرے اندر کا ہیجان بیٹھ رہا تھا۔ سہ پہر دھندلی ہوتی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی میز تلے چند بھونرے اڑتے نظر آ رہے ہیں۔ ایک لڑکی نظر آ رہی ہے۔ جو میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں گارڈن سے اٹھ جاتا ہوں۔

وہاں سے گھر کی طرف چلا ہوں۔ اندر داخل ہو کر میں عقبی سیڑھیوں سے اوپر چلا مجھے اپنے سامنے فراؤ ماگر کھڑی نظر آئی۔ مجھے شک ہوا پھر تصدیق ہو گئی۔ اس نے کنجی جلدی سے چھپالی تھی۔ میں سمجھ گیا۔

"اچھا ہوا تم آ گئے۔" اس نے گھبراہٹ سے کہا۔ تمہارے اوپر کرایہ واجب ہو چکا ہے۔

ابھی مجھے ہفتہ بھی نہیں ہوا میں نے بٹوہ نکالا اور ایک چھوٹا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ "یہ کرایہ آگے کے پندرہ دن کے لیے بھی کافی ہے۔"

اس نے کہا میں اس کے کمرے کی طرف گزروں تو رسید لے سکتا ہوں۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے چل دی۔

میں نے کمرا کھولا۔ لیمپ جلایا یہ پہلے ہی سے گرم تھا۔ فراؤ ماگر یقیناً" میری کمرے میں گھسی تھی، میں نے اپنی اشیاء کا جائزہ لیا۔ میرے کیس کا قفل مضبوط تھا۔ سب چیزیں ٹھیک تھیں۔ رہیں تصویریں تو انہیں میں ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا۔

میں ایک بال توڑ کر اس کے سروں کو پانی میں بھگویا۔ اور لاک کے آر پار لگا دیا۔ پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔ راستے میں فراؤ ماگر کا کمرا تھا۔ میں رک گیا۔ اندر سکوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ میں نے دستک دی اور فوراً" ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

عورت گھبرا کر اچھل پڑی اس کے سامنے میز پر ایک ٹین کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی نوٹوں کی ایک گڈی بھی تھی۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا مگر میں نے دستک دے رکھی تھی لہٰذا وہ چپ رہی۔ اس نے ایک کاغذ پر کرائے کی رسید بنا کر مجھے دے دی ماہ میں کوئی بات کیے بنا رسید لے کر باہر آ گیا۔

باہر سڑک پر بھی ہوا چل رہی تھی۔ میں ہر گزرنے والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ ادھر عموماً" ورکنگ کلاس عورتیں تھیں۔ معمولی اور سادہ سی۔

میں دراصل اپنا کو تلاش کر رہا تھا۔ لگتا تھا وہ آج گھر سے نکلی نہیں۔ میں نے طے کیا کہ میں خود کو اس سے متعارف کراؤں بے شک کسی فرضی نام سے۔

یہ اچھی بات ہے کہ میرے پاس مناسب فنڈ ہے دراصل اس احمق سیلزمین کے بٹوے سے مجھے معقول کمک مل گئی ہے۔

میں اسی پرانے کیفے میں داخل ہو رہا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ اپنا ادھر سے گزرے گی۔ مجھے دیکھ کر ایک ویٹر لپکتا آیا ہے۔ میں لائٹ فوڈ کا آرڈر دیتا ہوں۔ اور اخبار اٹھا لیتا ہوں۔ پھر میں یہاں کے گاہکوں کو دیکھتا ہوں۔ شام کا یہ ابتدائی حصہ ہے ادھر کوئی چھ سات آدمی ہیں۔ یہ سب میری میز سے فاصلے پر ہیں۔ ایک کنوارا سا آدمی میز پر اخبار پھیلائے پڑھ رہا ہے۔ اس نے ایک پرانی سی گرین جیکٹ پہن رکھی ہے اس کے بائیں ہاتھ پر ایک سیاہ پٹی بندھی ہے۔ کبھی کبھار وہ ادھر نظریں مار لیتا ہے جدھر وہ خوش شکل عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں مجھے یہ عورتیں بہ ظاہر ہم جنس پرست لگتی ہیں اس کی ساتھی عمر میں بڑی ہے۔ اور خاصی گھاگ لگتی ہے۔ میرے خیال میں یہی اس لڑکی کا شوہر ہے۔ اس کی صورت بھی اچھی ہے اس نے اپنے بال مردوں کی طرح بنوا رکھے ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں شادی کی انگوٹھیاں ہیں۔ باتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے ہاتھ بھی پکڑ رہی ہیں۔ تبھی وہ دونوں میری جانب متوجہ ہو گئیں اور میں نے جلدی سے

نظریں پھیلالیں۔

اب دو آدمی جو ورکنگ کلاس کے لگتے تھے میری نظروں میں آگئے تھے۔ ایک اور آدمی تھا جو ذرا پیشہ ورانہ ٹائپ کا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سپید داڑھی تھی۔ وہ آنکھوں کے سامنے ایک کتاب رکھے پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب شاید شاعری کی تھی۔ مگر مجھے کیسے معلوم ہوا کہ کتاب شاعری کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری آنکھیں عمدگی سے دیکھنا جانتی ہیں۔ یہ آدمی جب صفحے الٹتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ کتاب شاعری کی ہے۔ وہ ایک خاص طرح سے لکھی جاتی ہے نا؟

اب میرا کھانا میز پر لگ گیا ہے۔ لہٰذا میں لکھنا بند کروں گا۔ یہ جرمن لوگ بھی خوب ہیں سنا ہے اس کے ہاں آٹھ سو اقسام کے ساسیجز ہوتے ہیں۔

میں کھا ہی رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا المیہ ہوا۔ میں نے ٹن کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا کہ مجھے کھڑکی سے ادھر ایک مانوس چہرہ چلتا محسوس ہوا۔ جب تک میں سمجھوں یہ اینا ہے وہ پیکر کسی طرف غائب ہو گیا۔ میں ایک دم سے اچھلا تھا اور دروازے کی طرف دوڑا تھا۔ سارے لوگ مجھے دیکھنے لگے تھے۔ مگر تب تک لڑکی غائب ہو چکی تھی۔ میں واپس پلٹا۔ ویٹر عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سمجھا تھا ادھر کوئی شناسا ہے۔ اس واقعے نے مجھے اپ سیٹ کر دیا۔ کھانے میں مزا نہیں رہا۔ میں کیفے سے نکلا ادھر ایک پارک تھا۔ میں وہاں گیارہ تک رکا رہا۔

اس رات میں رات گئے ڈائری لکھتا رہا۔ اس کے بعد میں نے اپنی رقم دوبارہ گنی۔ میرا ایک مہینہ اطمینان سے گزر سکتا تھا۔ البتہ مجھے اپنی عیاشی میں کچھ کمی کی ضرورت ضرور تھی۔

اس وقت میرا ذہن بٹا ہوا تھا۔ میں اینا کے چکر میں تھا مگر وہ ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا یہ بتانا میں بھول گیا کہ دروازے کے لاک پہ جو ہال میں نے چپکایا تھا وہ لگا ہوا تھا یعنی کسی نے کمرے میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لیے سوٹ کیس کو چیک کرنا ضروری نہ تھا۔ تاہم میں نے اسے کھول کر دیکھا مجھے احساس ہوا کہ میں جس کام میں ہاتھ ڈالنے جا رہا ہوں اس میں مجھے کچھ مخصوص قسم کے آلات اور آوازوں کی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس ان کے خریدنے کے لیے رقم نہ تھی۔ وقت بھی کم تھا۔ اس وقت صرف اینا کا مسئلہ تھا۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جمعرات

پچھلی رات مجھے کچھ خوف ناک خواب نظر آئے تھے۔ ابھی تک ان کا اثر میرے اوپر ہے۔ ان کی وجہ وہ کھانا ہے جو میں کھا رہا ہوں۔ بہ ہرحال مگر اس قسم کے خوف ناک خواب مجھے پہلے کبھی نظر نہیں آتے۔ ان کا آغاز اس طرح ہوا جیسے کوئی اسکرین میرے سامنے تھا۔ پھر مجھے اس پر اینا کی صورت نظر آئی وہ افسردہ تھی۔ پھر میں فراڈ مگر کی عمارت میں پہنچا تھا۔ اس کے بعد میں یہاں کے نو تعمیر ٹوائلٹ میں گیا تھا۔ میں سنک کے سامنے کھڑا تھا۔ کہ مجھے ٹیپ کے اندر سے سیاہ شکلیں تیزی سے نکلتی دکھائی دیں۔ یہ سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ یہ سب کی سب مکڑیاں تھیں سیاہ بالوں والی مکڑیاں.... میں چیخ کر بدکا پھر یہ مکڑیاں اچھلنے لگیں اور انہوں نے فضا میں اڑنا شروع کر دیا۔ دوسرے لمحے یہ سب کی سب مجھ سے چمٹ گئیں۔ میرے سر، بازو جسم انہوں نے سب کو ڈھانپ لیا۔ انہوں نے میری ناک میں گھسنے کی کوشش کی۔

میں جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے لگا میں نے کوئی چیز اٹھالی ہے۔ کوئی جھاڑو.... پھر میں نے اسے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ہلانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ میں پیروں سے ان مکوڑوں کو مار بھی رہا تھا۔ کچل رہا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بے ہوش نہیں ہوا اور پھر.... میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا میرا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا ہے۔ اور کپڑے تر ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے خواب میں میں کئی بار چیخا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے خوف سے میری آواز ہی نہیں نکلی ہوگی۔ کیونکہ کوئی بھی ادھر نہیں آیا

بہر حال یہ بڑا دہشت ناک خواب تھا۔ میں نے نوچ نوچ کر خود کو زخمی کر لیا تھا۔ میں نے اٹھ کر لیمپ جلایا۔ کچھ پٹیاں نکالیں اور رومالوں سے خون صاف کیا۔

صبح جب میری حالت سنبھلی۔ تو ایک عجیب بات ہوئی۔ یہ ایک تبدیلی تھی جو میری سوچ میں ہوئی تھی۔ پہلے بھی دہریہ تھا اب میں ایک دم سے مذہبی ہو گیا تھا۔ اسی روز ایک اور بات بھی ہوئی۔ میں نے اینا کو دیکھا اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ جس وقت وہ کھڑکی کے سامنے سے گزری تھی۔ میں دوپہر سے ذرا پہلے ہی کیفے میں کافی پینے چلا وہ اس وقت اس لڑکی کے ساتھ تھی جس کے ساتھ میں نے اسے پہلے دیکھا تھا۔ میں نے جلدی سے کپ رکھا رقم ادا کی اور باہر کی طرف بھاگا۔ میں نے بہر حال انہیں جا ہی لیا اس وقت وہ دونوں ایک دروازے میں داخل ہو رہی تھیں۔ یہ عورتوں کی ڈریس کی دکان تھی۔ اس وقت اس پر کلوزڈ کی تختی لگی تھی۔ میں نے دیکھا ان دونوں لڑکیوں کے ہاتھ میں کے بڑے بڑے ڈبے دبے ہوئے تھے۔ اس پر اس دکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ اچھا انکشاف ہوا تھا اب میں اس دکان کے آس پاس رہ کر اینا کو تلاش کر سکتا تھا۔

مجھے سات گھنٹے گزارنے تھے میں نے خاصی دیر میں کھانا کھایا۔ تاکہ وقت گزر جائے۔ اس کے بعد میں ایک فیشن ایبل ایونیو میں داخل ہوا۔

یہاں میں ایک کتابوں کی دکان کی طرف چلا گیا۔ اور پھر مجھے ایک بہت دلچسپی سی کتاب دکھائی دی۔ اس کا نام تھا۔ ”اذیت کی لذت“ مجھے یہ موضوع بہت دلچسپ لگا۔ میں نے یہ کتاب اٹھائی اور قریب ہی کونے میں پڑے صوفے پر جا بیٹھا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے لگا میرے دماغ کے سارے قمقمے روشن ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے غضب کی کتاب تھی۔

فراؤ ماگر کی عمارت میں میری ہی طرح کا ایک کرائے دار اور تھا۔ یہ پیشے کے لحاظ سے قصاب تھا۔ اینا سے ملنے کے لیے ابھی مجھے بہت وقت گزارنا تھا۔ میں نے ایک بگھی پکڑی اور اس سلاٹر ہاؤس کی طرف چل دیا جہاں میرا ہمسایہ کرائے دار ملازم تھا' مجھے دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے خون دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مگر اس وقت میں بہت ہی متجسس تھا۔ اور جاننا چاہتا تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد ان کی کھال کس طرح اتاری جاتی ہے۔ اور ان کے اعضا کس طرح کاٹے جاتے ہیں۔ میرا ہمسایہ مجھے ایک آئرن گیلری کے پاس لے گیا۔ یہاں کچھ ایسا انتظام تھا کہ ذبح شدہ جانوروں کے جسم تاروں میں پھنسے راڈوں میں لٹکتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اور بہت سے قصاب ایپرنوں میں ملبوس انہیں نکال کر فوراً" کام میں لگ جاتے تھے۔ ان کے پاس ڈنڈے تھے چاقو تھے' چھریاں تھیں۔ کلہاڑیاں تھیں۔ انہیں لاشوں پر یہ بڑی مہارت سے استعمال کر رہے تھے۔

میں انہیں حیرانی سے کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے ہمسائے سے مصافحہ کیا اور چل دیا۔ اب میں دوبارہ شہر کے مرکز میں تھا۔ مجھے جلد ہی ایک کھلونوں کی دکان مل گئی۔ یہاں سے میں نے چند خاص قسم کی گڑیاں خریدیں۔ پھر ایک کیفے میں جا گھسا جب میں کھانا کھا چکا میں باہر آیا میں ایک جانب مڑا اور ایک ایسے کورٹ کی طرف گیا جہاں کچھ خصوصی قسم کی دکانیں تھیں۔

میرے دائیں جانب ایک دکان تھی۔ مجھے اسی دکان کی تلاش تھی۔ ڈسپلے ونڈو میں طرح طرح کے چاقو سجے ہوئے تھے۔ ادھر سرجیکل انسٹرومنٹ کی کئی دکانیں تھیں۔ جو میڈیکل کی طالب علموں کی ضرورت پوری کرتی تھیں۔ اگر ایک واقعہ خلاف توقع نہ ہوا ہوتا تو میں بھی میڈیکل لائن میں ہوتا۔ افسوس اس کی وجہ سے میری تعلیم کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا تھا۔ پھر بھی مجھے اس لائن کی کچھ معلومات ضرور ہیں۔

میں نے ونڈو میں اپنا عکس دیکھا۔ ایک معقول آدمی کا عکس تھا۔ مجھے سرجری سے بہت دلچسپی تھی۔ میں دکان میں چلا گیا۔ یہاں پر دوائیں بھی تھیں۔ ایک جوان ملازم میری مدد کے لیے بڑھا۔

مجھے وہ ایک گوشے میں لے گیا جدھر میری مطلوبہ چیزیں تھیں یہاں بہت سے سرجیکل انسٹرومنٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں عجلت سے پانچ عدد اوزاروں کا انتخاب کیا۔ میں بڑی خود اعتمادی سے دکان سے باہر آیا۔ رسید پر میں نے نام پتا سب غلط لکھوایا تھا۔ مجھے تلاش کیے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ مقفل کیا۔ پھر اپنا سوٹ کیس کھولا میں نے چند اشیا الگ کر کے انہیں میز پر رکھ دیا۔ وہیں میں نے اپنی لائی چیزیں بھی رکھ دیں۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی میں یہ سب چیزیں دمک رہی تھیں۔ میں نے یہ چیزیں اٹھائیں اور انہیں لے جا کر سنک پر رکھ دیا اور انہیں دھونے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے وہ گڑیاں اٹھائیں جو میں نے خریدی تھیں۔ میں نے ان کے لباس اتارے بے شک یہ کسی بھی طرح ان لاشوں کی طرح نہ تھیں جنہیں میں نے سلاٹر ہاؤس میں دیکھا تھا۔ تاہم میری ضرورت ان سے کسی حد تک پوری ہو سکتی تھی۔ پھر میں نے بڑے انہماک سے ان کے اعضا بدن سے کاٹنے شروع کر دیے حالانکہ میڈیکل کلاس چھوڑے مجھے عرصہ ہو چکا تھا پھر بھی مجھ میں مہارت موجود تھی۔ ذرا دیر میں میز پر برادے کے ساتھ۔ شیشوں کی آنکھیں' بازو اور دوسرے اعضا بکھرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ بے شک یہ حقیقی کام نہ تھا مگر یہ ریہرسل تو تھا۔ پھر میں نے اسی تھیلے میں جس میں یہ اشیاء آئی تھیں ان تمام کٹی ہوئی چیزوں کو بھر دیا۔

پھر میں نے ان چیزوں کو الگ کیا جو میرے موجودہ کاموں کے لیے ضروری تھیں۔ اور انہیں احتیاط سے لاک کر دیا۔ میں نے ان آلات کو جو میں لایا تھا ایک لیدر اپیرن میں رکھا اور اسی اپنی پٹی سے باندھ دیا۔ اس کے اوپر میں نے کوٹ پہن لیا۔ اور پھر میں اپنے کمرے سے باہر آیا۔ میں اس طرح چل رہا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہوں۔ اینا سے ملنے میں ابھی آدھے گھنٹے کا وقت باقی تھا۔ میرا رخ اسی طرف تھا جدھر سے اینا کے آنے کی توقع تھی میں ایک خالی جگہ پر رک گیا۔ مجھے بس یہ فکر تھی کہ کہیں اینا کے ساتھ اس کی ساتھی بھی نہ ہو۔

میں اینا کی سمت بڑھا۔ اسے بے شک مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اس سے پہلے میں اس سے کہاں ملا تھا۔ ہمارے درمیان بہت مختصر سی بات ہوئی پھر میں نے اسے ایک تنگ سی گلی میں چھوڑ دیا۔ اور اپنے گھر چل دیا۔ مگر مجھے پھر ایک وحشت ناک خواب دکھائی دیا۔ میں اپنے کمرے میں ہوں اور خون کی بارش ہو رہی ہے۔ میں برہنہ ہوں اور خون کی بوندیں میری پیٹھ سے پھسل رہی ہیں۔ پھر میں چیخا تھا اور جاگ گیا تھا۔ میں نے لیمپ جلایا۔

میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میں نے اپنی طرف فوراً نہیں دیکھا۔ مگر یہ پسینہ تھا خون نہ تھا۔ اطمینان کا احساس اس قدر خوش گوار تھا کہ بس بہر حال میں اٹھا میں نے محسوس کیا میں کپکپا رہا ہوں۔ حالانکہ سردی نہیں تھی۔ میں دروازے کی طرف گیا۔ رک کر میں نے سنا۔ باہر سناٹا تھا۔ کسی نے میری چیخ نہیں سنی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ چیخ بھی خواب کا حصہ رہی ہو۔ پھر میں بستر پر جا گرا اور سو گیا۔

جمعہ

آج شاید کچھ ہوا ہے۔ باہر کچھ شور سا ہو رہا ہے۔ میں کھڑکی کھولتا ہوں۔ کرسی لاتا ہوں۔ اس پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھتا ہوں گلی میں مجمع سا ہے۔ کچھ ہوا ضرور ہے۔ پھر مجھے ایک گھوڑوں والی ایمبولنس دکھائی دیتی ہے۔ میں ٹوائلٹ میں جاتا ہوں واپسی پر مجھے گلی صاف نظر آتی ہے۔

میں نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا۔ تبھی مجھے ڈور ناب پہ کوئی چپکتی چیز کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ کو دیکھا اس پر سرخی موجود تھی۔ مجھے شاک سا ہوا۔ اتفاق سے کاری ڈور میں کوئی نہیں ہے۔ اور ابھی ناشتے کا وقت بھی نہیں ہوا ہے۔ میں واپس کمرے میں

جاتا ہوں۔ نل کھول کر ہاتھ صاف کرتا ہوں۔ راہداری میں چلتے ہوئے مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں واپس آتا ہوں اور دوبارہ ٹھنڈے رومال سے منہ صاف کرتا ہوں۔ اس پر سے خون کا دھبہ صاف کرتا ہوں۔ پھر میں سنک چلا کر پانی بہا دیتا ہوں۔ بھیگے رومال کو تہہ کر کے اسے دوسرے رومال کے ساتھ اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ یہ جلد ہی یہاں سوکھ جائے گا۔

گلی میں فضا نارمل ہے۔ وہاں سے میں بیئر گارڈن جاتا ہوں۔ اور کافی اور رول کا آرڈر دیتا ہوں۔ وہ ویٹر جو مجھے سرو کرتا ہے مجھے جاننے لگا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر میرا سوکھا ہوا منہ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھ سے وہ بڑوس میں سرو کرنے آیا تو جو باتیں میں نے سنیں اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قریبی گلی میں ایک لڑکی مردہ ملی تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے الجھن سی ہوئی۔ ایسی الجھن کہ میرا جی چاہا میں بل ادا کیے بغیر ہی چلا جاؤں۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ویٹر میری طرف آیا۔ وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا "میری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

رقم لے کر وہ چلا گیا۔ پھر چینج کے ساتھ لوٹا۔ میری حالت ایسی تھی کہ میں نے اسے جو ٹپ دی وہ تمام حالات میں کبھی نہ دیتا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے شکریہ ادا کیا۔ اس کے جاتے ہی میں اٹھا اور وہیں دھپ سے بیٹھ گیا۔ یہ تھی میری حالت میرے لیے چلنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا میں رک گیا۔

اب جی سنبھلا ہے۔ میں نے ایک قریبی پارک کا رخ کر لیا ہے۔ یہاں بنچ بھی خالی ہے ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔ میں بیٹھ جاتا ہوں بیٹھے بیٹھے دیر ہو رہی ہے کچھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ میں نے ایک اچھے سے ریسٹوران کا رخ کیا۔

سہ پہر ہو چکی ہے۔ میرا جی نہیں چاہ رہا ہے کہ میں اپنے کمرے میں جاؤں۔ میں زولوجیکل گارڈن چلا جاتا ہوں۔ وہاں لوگ کبوتروں کو دانہ کھلا رہے ہیں۔

جس وقت میں فراڈ ماگر کی عمارت میں عقبی زینے سے اندر گیا سائے لمبے ہو چکے تھے۔ میں آہستہ سے اپنی سیڑھیوں پر چلا۔ وہاں سے میں نے دیکھا فراڈ ماگر کے چھوٹے سے سٹنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیمپ کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میری آواز سن کر وہ باہر آ گئی۔ مجھے اسی کا چہرہ وحشت سا محسوس ہوا۔

اس نے مجھے بتایا پولیس کا کوئی آدمی آیا تھا۔ اس نے سارا دن ادھر کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ اب صرف میں رہ گیا ہوں اور ایک نوجوان کلرک۔ میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے پوچھا وہ کیا پوچھ رہا تھا۔ ماگر نے کہا عام سے سوالات تھے۔ میں نے اس کا حلیہ پوچھا۔ اس نے کہا۔ فلیٹ ہیٹ سر پر تھی۔ سیاہ اوور کوٹ تھا عمر درمیانی تھی.... اس نے کہا ہے کہ وہ کل پھر آئے گا۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ یقیناً" کوئی پولیس سراغ رساں تھا۔ میں نے سکون سے کہا میں اس سے مل لوں گا۔ فراڈ نے دروازہ بند کر لیا۔ بجھے بجھے انداز میں میں کمرے کی طرف چلا۔ میں اس سے پوچھنا بھول گیا تھا اس نے کمروں کی تلاشی تو نہیں لی تھی۔ بہرحال اب دیر ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے اپنا پرس دیکھا اور تیاری شروع کی۔

میں نے بیڈ کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ چیزیں رکھیں۔ پیکنگ مکمل کی۔ لیمپ بجھایا۔ کسی بھاگتے شکار کی طرح مجھے کھانے کا گانگ سنائی دیا۔ پھر کرائے داروں کے قدموں کی چاپیں ابھریں۔ سب اس تاریک سے ڈائننگ روم میں جا رہے تھے جس میں بس میں ایک ہی پار گیا تھا۔ میں نے اطمینان کیا کہ باہر میری کوئی چیز تو نہیں۔ میری ڈائری میرے جیب میں تھی۔

میں نے کوٹ پہنا۔ کنجی میز پر ڈالی۔ اور باہر نکل گیا۔ میں نے احتیاط سے دروازہ بند کیا۔ زینے احتیاط سے طے کیے باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔

میں نے رفتار بڑھا دی۔ ادھر رکنا میرے لیے تباہ کن تھا۔ آج رات میں کسی Bahrhof میں سو

رہوں گا۔ کل کا لائحہ عمل میرے پاس ہے۔ راستے ماپنے کا صاف ہے۔

بعد میں

میں اب لندن میں ہوں۔ مجھے یہ جگہ اچھی نہیں لگی ہے۔ یہاں کا موسم نم اور کہر آلود ہے۔ فضا کو فیکٹریوں کی چمنیوں نے آلودہ کر رکھا ہے۔ میں ایک گھٹیا سے رہائشی ہاؤس میں مقیم ہوں جو ایسٹرنامی اسٹریٹ کے مقابل ایک تنگ سی گلی میں بنا ہوا ہے۔

یہ فراڈ مگر کے مکان ہی کی طرح بدتر ہے اور یہاں کا کھانا اس سے بھی برا ہے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن پر اخبار دیکھا تھا۔ کوئی خبر نہ تھی۔ یہ اچھی بات ہے۔

میں نے اپنے بچے ہوئے مارک کو انگلش کرنسی میں بدلوالیا ہے۔ مگر انہوں نے انہیں بہت کم قیمت پر خریدا ہے۔ میرا سفر عمدگی سے طے ہوا تھا۔ کسی نے روکا ٹوکا نہیں تھا۔ ڈوور پہنچ کر میں نے احتیاط سے جائزہ لیا تھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ یہ خوش قسمتی ہے میری کہ رہنے کو جگہ مل گئی ہے۔ یہاں کرائے داروں کی رجسٹریشن نہیں ہوتی۔ میرا کمرا بہت محفوظ سا ہے۔ دروازے کا قفل بھی اچھا ہے۔

یہاں پہنچ کر پہلی رات میں نے اپنے اوزاروں کو اچھی طرح صاف کیا۔ قلعی کیا تاکہ میں انہیں اپنی پہلی مہم میں عمدگی سے استعمال کر سکوں۔ اس مہم میں کامیابی کا مطلب ہوگا کہ میرا نام ایک دم سے شہرت یافتہ لوگوں میں ہونے لگے گا۔ میرے چاقو چمکیلے ہیں۔ کمرا روشن ہے۔ یہاں سے دریا کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہو رہی ہے آج رات میں ان اوزاروں کو نکالوں گا جو میرے مقصد کے لیے ضروری ہیں بقیہ کو میں مقفل کر دوں گا۔ میں نے ہر طرح کی احتیاط برتی ہے۔ ربڑ کے دستانے بھی خرید لیے ہیں کپڑے بھی۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ کوئی میرا نوٹس لے سکتا ہے۔ یہ موسم البتہ خراب ہے مگر یہ انگلینڈ ہے۔ ویسے یہ میرے مقصد کے لیے بہترین جگہ ہے۔ میں اندھیرے کا منتظر ہوں۔

رات کے اب دس بج رہے ہیں۔ میں اب یہاں سے نکل سکتا ہوں۔ دریا کے کنارے پر لگے لیمپ جلائے جا چکے ہیں۔ یہ کمرے میں بھوتوں کی طرح لگ رہے ہیں۔

میں نے کل ایک چھوٹا سا تھیلا خریدا ہے۔ یہ اس طرح کا جیسا کلرک لوگ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مجھے امید ہے اس موسم میں میری طرف کوئی دھیان نہیں دے گا۔ جس جگہ میں ٹھہرا ہوں وہاں ایک دو لوگوں سے کچھ باتیں کی ہیں اور کچھ کام کی معلومات حاصل کی ہیں۔

اب میں کمرے پر آخری نگاہ ڈال رہا ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے پہلے اہم کام پر نکل جاؤں گا۔ یہ ایک عظیم مہم ہے۔ میں نے دیوار پر لٹکے گندے سے کلینڈر پر ایک جھوٹا ٹک کا نشان لگا دیا ہے۔ یہ نشان جس تاریخ پر میں نے لگایا ہے وہ ہے۔

چھ اگست سن 1888ء

میں دروازے سے نکلتا ہوں۔ کسی نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ یہ دروازہ رات بھر کھلا رہتا ہے۔ میں باہر کے راہ گیروں میں گھل مل گیا ہوں۔ میرے لائے ہوئے اوزار اپنے کیس میں میرے چلنے کے ساتھ ساتھ کچھ کھٹ پٹ کر رہے ہیں۔ یہ سب چمکتے ہوئے پھلوں والے ہیں۔ مجھے مستقبل میں خیال رکھنا ہوگا تاکہ آوازیں نہ پیدا ہوں۔

میں نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔ اب میں مشرق کی طرف چل رہا ہوں۔ جدھر اندھیرا زیادہ ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق جدھر میں جا رہا ہوں ادھر طوائفوں کی کثرت ہے۔ مجھے اس جگہ کا علم ہے جس مقام سے مجھے ٹیکسی مل سکتی ہے۔ وائٹ چیپل کے لیے جو میری منزل ہے۔

☆ ☆

زہریلی عورت

ایم الیاس

عورت محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے بیوی بنتی ہے تو شوہر پرست ہوجاتی ہے۔ ماں بنتی ہے تو اس کے اندر ممتا کا عظیم جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ محبت کرنا اور نبھانا جانتی ہے۔ ایثار اور قربانی کا جذبہ اس میں موجود رہتا ہے لیکن جب اسے دھوکا دیا جاتا ہے اور اس کی محبت کو پامال کیا جاتا ہے تو پھر وہ انتقام لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے محبت کے نام پر فریب دیا گیا تو وہ انتقام لینے کے اندھے جنون میں مبتلا ہوکر ایک خطرناک اور خوف ناک زہریلی ناگن بن گئی اس طویل کہانی میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے اپنے فریبی محبوب سے انتقام لینے کے لیے کیسے جال بچھایا، ایم الیاس نے بنگلا دیش کے ماحول میں لکھا ہے جسے آپ مدتوں بھلا نہ سکیں گے۔

نفرت اور محبت کے جذبات کی ایک انوکھی کہانی

عورت محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ بیوی بنتی ہے تو شوہر پرست ہو جاتی ہے۔ ماں بنتی ہے تو اس کے اندر ممتا کا عظیم جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ محبت کرنا اور نبھانا جانتی ہے۔ ایثار اور قربانی کا جذبہ اس میں موجود رہتا ہے۔ لیکن جب اسے دھوکا دیا جاتا ہے اور اس کی محبت کو پامال کیا جاتا ہے تو پھر وہ انتقام لیتی ہے۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی جسے محبت کے نام پر فریب دیا گیا تو وہ انتقام لینے کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر ایک خطرناک اور خوف ناک زہریلی ناگن بن گئی۔ اس طویل کہانی میں آپ دیکھیں گے اس نے اپنے فریبی محبوب سے انتقام لینے کے لیے کیا جال بچھایا۔ نفرت اور محبت کے جذبات کی ایک انوکھی کہانی جسے ایم الیاس نے بنگلہ دیش کے ماحول میں لکھا ہے۔ جسے آپ مدتوں بھلا نہ سکیں گے۔

میں نے چونک کر نیلم چوہدری کی طرف حیرت بھری نظروں سے اس طرح دیکھا جیسے کسی تراشیدہ پیکر پہلی بار دیکھ رہا ہوں جس نے میرے اندر سنسنی بھر دی ہو۔ میں اسے دفتر ہی میں نہیں دن رات جب وہ میرے سامنے نہیں ہوتی اور میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا تو چشم تصور میں دیکھتا تھا۔ وہ میز پر بکھرے ہوئے کاغذات بڑی تیزی سے سمیٹ کر دراز میں رکھتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ عجلت میں ہو۔ اسے اس بات کا بھی کوئی احساس اور خیال نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کی فکر اور خیال نہیں تھا کہ اس کی ساڑی کا پلو کسی مرد کے پیر کی طرح شانے اور سینے سے بار بار پھسل کر اسے بے حجاب بنا رہا ہے۔ وہ کالے رنگ کے مختصر سے بلاؤز میں ملبوس تھی جس کا گریبان اس قدر کھلا ہوا تھا وہ سب صاف واضح اور نمایاں دکھائی دیتا تھا جس کے حجاب کے لیے عورت کوشش کرتی ہے۔ اس کی مرمریں، سڈول اور سنگ مرمر جیسی بانہیں بے نیام تھیں۔ عورت بغیر دوپٹے اور پلو کے بے لباس سی لگتی ہے۔ لڑکی عورت کو بھی اس کا احساس اور اندازہ ہوتا ہے۔

میرے اندر تیز ہوائیں سنسنانے لگیں۔ یوں لگا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ کمرے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی تھا بھی نہیں۔۔۔ وہ ایسی ہوش ربا بدن تھی۔ کوئی بدصورت، بے کشش اور بھدی عورت نہیں تھی۔ لیکن تنہائی میں ایک عام سی عورت کا قرب مرد کے جذبات میں افراتفری پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔ پرشباب اور گداز بدن کی جس میں کسی پکے پھل کا سا رس بھرا ہوا تھا۔ مرد ناگ بن جاتا ہے۔ مجھے اپنی سماعت پر فتور کا سا احساس ہوا۔ میرے وجود میں کتنے ہی لمحات تک سناٹا چھایا۔ یہ اس کی پیش کش اور چونکا دینے والی تھی کہ میں اپنی خوش نصیبی کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

نیلم چوہدری اس ملٹی نیشنل فرم میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ مجھ سے زیادہ باصلاحیت اگرچہ یہاں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ میں نے شاید ہی کبھی نیلم چوہدری کو ان اعلیٰ عہدیداروں یا باس میں دل چسپی لیتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا ہو۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ کی عورت تھی۔ جب کہ میں ایک معمولی سا ملازم۔ میرے اور اس کے درمیان ایک طبقاتی دیوار حائل تھی جسے میں کسی صورت سے گرانے کی ہمت اور جرات نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ کئی بار تنہائی میں ہم دونوں یک جا تھے۔ لیکن اس نے یہ دیوار مسمار کر دی تھی۔ کاغذات دراز میں رکھ کر اسے مقفل کیا۔ پھر ساڑی پر نگاہ ڈالی۔ پلو شانے اور سینے پر درست کر کے اٹھی اور پھر بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا پرس میری نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"آپ کو دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے؟" اس نے اپنی شیریں آواز میں شوخی سے کہا۔

"وہ دو چیزیں کیا ہیں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"چابیاں یا نیلم چوہدری۔۔۔۔"

وہ میرے جواب دینے سے پہلے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ایسا لگا جیسے فضا میں سات سر بول اٹھے ہوں۔

اس کی ہنسی کے ترنم اور شوخ لہجے نے جیسے میرا حوصلہ اور خواہش اور جسارت کو بڑھا دیا تھا کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے اس کے چہرے پر جھک جاؤں اور فراز پر سے پلو پھسل جائے گا تو وہ بڑی خود سپردگی سے من مانیاں کرنے دے گی۔ لیکن میں اپنے اس سپنے پر جو جانے کب سے دیکھ رہا تھا عمل نہ کر سکا۔ کیوں کہ دفتر کے باہر چوکی دار اور چپراسی موجود تھے۔

اس کی سفید رنگ کی بے حد آرام دہ گاڑی کی گداز سیٹ پر اس کے ساتھ اس کے پہلو میں بیٹھا تو مسحور کن خوشبوؤں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ قرب کی ایک مدہوش انگیز خوشبو تھی جو اس کے سراپا سے پھوٹ کر میرے گرد لہرانے لگی تھی۔ میرا وجود جیسے اس خوشبو میں گم ہو کر رہ گیا۔ گاڑی تیزی سے مسافت طے کر رہی تھی اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ راستہ ختم نہ ہو۔ وہ منزل بھی نہ آئے جہاں مجھے لے جا رہی تھی اور اس طرح مہکتی رہے۔ اس کی نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں اور میری اس پر اس نے گاڑی ایک ایسے اعلیٰ ترین ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی جس کے اندر قدم رکھنے کے بارے میں کبھی کوئی بھی سوچ نہیں سکتا تھا۔ ہم دونوں اس میز پر جا بیٹھے جو نیم تاریک تھی اور آس پاس کوئی میز نہ تھی۔ ہماری حرکات و سکنات اور خوش فعلیاں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں گزرتے سے ایک جوان جوڑا دیکھا جو بہک رہا تھا۔ مرد کے ہاتھ اس لڑکی کی منی ٹی شرٹ میں زیر جامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بنگلہ دیش میں ایسے نظارے عام تھے۔ میرے دفتر میں اسٹاف کی لڑکیاں اور مرد اسٹور روم، لائبریری میں فائل نکالنے کے بہانے اپنے ارمان پورے کرتے تھے۔ روز بروز بے حیائی، بے حجابی اور فحاشی بڑھنے لگی تھی۔ یہ امریکہ یورپ کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔

اس گوشے میں بیٹھ کر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا نیلم چوہدری بھی چاہتی ہے کہ اس جوڑے کے مرد کی سی میں حرکات کروں اور وہ اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ لیکن دوسرے لمحے میرا یہ خیال باطل نکلا۔ اس نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر بر تکلف ناشتے اور کریم کافی کا آرڈر دیا۔ گرم گرم کافی کی چسکیوں کے دوران وہ میری سابقہ ملازمت کے بارے میں سوالات کرتی رہی۔ اس کا پلو نہ جانے کتنی بار شانے اور سینے سے پھسل پھسل کر اس کی گود میں گرتا رہا۔ دو ایک مرتبہ تو اس نے پلو سے ہیجان خیز نظارے کو ڈھکا۔ میری پیاسی نظروں کو بہلاتی رہی۔ بنگالی عورت لڑکی اس لیے بہت گرم ہوتی ہے کہ وہ روز ہی ماس کھاتی ہے۔ وہ میری نظروں اور وجود پر پھوار بن کر برستی رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ میں کوئی سندر سپنا دیکھ رہا ہوں۔

میں اس کی مدھر آواز کے جادو میں جکڑتا چلا گیا۔ میری بے تابانہ نگاہیں سرگیں لانبی لانبی پلکوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی گہری جھیل میں ڈوب ڈوب کر شرمسار ہوتی رہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ نیلم چوہدری کے انداز میں اس قدر والہانہ اور وارفتگی محسوس کی۔ اس کی مست انگڑائیوں نے میرے سینے میں خوابیدہ امنگوں کو جگا دیا تھا۔ میں شاید ایک جگ بیت جانے کے بعد عورت کی رفاقت سے فیضاب ہوا تھا۔ دو گھنٹے کا وقت یوں لگا جیسے پر لگا کر اڑ گیا ہو۔

جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو شام کا دھندلکا رات کی سیاہی کی آغوش میں سما چکا تھا۔

اس نے مجھے اپنی گاڑی میں گھر تک لفٹ دینے کی پیش کش کی۔ اس کے اصرار پر میں نے اس کی پیش کش قبول کر لی۔ یہ سوچ کر کہ کم از کم اس طرح کچھ لمحات اس کی قربت میں گزارے جا سکتے ہیں۔ دوبارہ ایسا سنہرا موقع پھر کہاں نصیب ہوگا۔

مگ بازار کے اعلیٰ رہائشی علاقے سے گزرتے ہوئے اس نے یکایک اپنی گاڑی کا رخ ایک لمبی، سنسان اور قدرے تنگ گلی میں موڑ دیا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ کہاں جا رہی ہے؟ نہ تو میرا گھر اور نہ ہی میرا محلہ۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"میں یہاں نہیں رہتا۔ میں غالباً" آپ کو بتا چکا

ہوں کہ میری رہائش کہاں پر واقع ہے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" اس نے اثباتی انداز میں اپنا خوش نما سر ہلایا اور پھر دلکش انداز سے مسکرا دی "یہ اتفاق ہے کہ ادھر سے گزرتے وقت میرا غریب خانہ پہلے آگیا۔ گھر کا راستہ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میرا چھوٹا بھائی آج صبح چٹا گانگ سے لوٹتے وقت روپ چندا مچھلی لے کر آیا تھا۔ میری چھوٹی بہن شیبا مچھلی اس قدر لذیذ بناتی ہے کہ آپ نے شاید ہی کبھی کہیں ایسی فرائی مچھلی کھائی ہوگی۔۔۔؟ دال بھات کے ساتھ اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور۔۔۔" اس نے سامنے آتی ہوئی گاڑی سے اپنی گاڑی بچانے کے لیے توقف کیا اور پھر دوبارہ اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ "امید ہے رات کا کھانا کھاتے ہوئے آپ کوئی تکلیف نہیں کریں گے۔"

نیلم چوہدری زہر کھانے کے لیے بھی مدعو کرتی تو میں بہ خوشی اس کی دعوت قبول کر لیتا۔ میں نے ذرہ برابر بھی تامل نہیں کیا بلکہ کسی قدر بے تکلفی سے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔ ایسا مرد جو ہوٹلوں کے کھانوں کا ذائقہ زبان پر زہر کی طرح محسوس کرتا ہو وہ عورت کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے۔ اور پھر وہ بنگالی نہیں جو ماس نہ کھائے۔ لہٰذا میں نے قدرے شوخ لہجے میں کہا۔

"اندھے کو کیا چاہیے؟ دو آنکھیں۔۔۔ بنگالی کو ماس والی بھات۔"

"اچھا۔۔۔" وہ مترنم لہجے میں بولی۔ "کیا اندھا ایک آنکھ سے خوش نہیں ہو سکتا؟"

نیلم چوہدری نے کھانے کی میز پر خود کم کھایا لیکن مجھے بڑے چاؤ اور اصرار سے کھلاتی رہی جیسے کوئی محبوبہ یا بیوی اپنے محبوب یا مرد کو کھلاتی ہے۔ میں نے اس کی طرف جتنی مرتبہ دیکھا اتنی ہی بار یہ سوچا کہ نیلم چوہدری آج مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہی ہے؟ اگر اسے میری وجاہت نے متاثر کیا ہے تو اسے بہت پہلے ہی میری جانب پیش قدمی کرنا چاہیے تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور عورتیں وجیہہ اور دراز قد مردوں پر جان دیتی تھیں۔ خصوصاً" فوجیوں پر۔۔۔ اس لیے کہ وہ دراز قد اور چوڑے چکلے سینے اور بے حد چاق و چوبند ہوتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ درمیانہ قد کی ہوتی تھیں۔ چھریرے اور متناسب بدن کی بھی۔

نیلم چوہدری کیا پورے دفتر والوں کے علم میں یہ بات تھی کہ میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔ لیکن وہ جس طرح اور جس انداز سے میری پذیرائی کر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ میں کوئی اہم شخصیت ہوں۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد اس کی چھوٹی بہن شیبا نے میرے لیے مازہ لیموں کا شربت بنایا۔ نیلم چوہدری نے اپنے لیے سبز چائے بنوائی تھی۔ میں کتنی دیر تک اس گھر کے خوش گوار ماحول میں بیٹھا لطف اندوز ہوتا رہا۔ یہ سب لوگ مجھ سے اس طرح بے تکلف ہو گئے تھے کہ میں اس گھر کا فرد ہوں۔ دو حسین و جمیل، طرح دار اور جواں ناز نینوں کی رفاقت بھلا مجھے کب نصیب ہوئی تھی۔ شیبا بھی توبہ شکن سراپا اور نشیب و فراز کی تھی۔ اس نے کالی منی اسکرٹ شرٹ پہن رکھی تھی جو آستینوں سے بے نیاز اور اس قدر کھلے گریبان کی تھی نگاہ ٹھہرتی نہیں تھی۔ جینز میں اس کی کمر ٹانگیں اور سیڈول پنڈلیاں عریاں تھیں کہ وہ بے حد تنگ و چست تھی۔

رات گیارہ بجے جب میں نے دوسری بار جانے کی اجازت چاہی تو مجھے بادل ناخواستہ جانے کی اجازت دی گئی۔ میرے انکار کے باوجود نیلم چوہدری کا بھائی مجھے گاڑی میں گھر تک پہنچانے آیا تھا۔ گاڑی میں نیلم چوہدری تو موجود نہ تھی لیکن اس کے گداز جسم کی مہک اب بھی بسی تھی۔ کپڑے بدل کر جب میں سونے کے لیے بستر دراز ہوا تو احساس ہوا کہ عورت کے بغیر گھر کیسے سونا لگتا ہے۔ اور زندگی کتنی بے رنگ اور بے کیف اور ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جن گھروں میں عورتیں ہوتی ہیں۔

میرے چشم تصور میں نیلم چوہدری کا حسین چہرہ اور سراپا لہرایا تو اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا قرب

لتنا خوش گوار اور دل نواز لگا جس نے مجھے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کا والہانہ انداز۔۔۔ شوخ لہجہ۔۔۔ دل کو برما دینے والی قاتل مسکراہٹ یہ سب کچھ برا دل کش لگ رہا تھا۔ ایک عام شخص کو اتنی عزت اور اس پر اتنی توجہ۔۔۔ آخر کون سا جذبہ کار فرما ہو سکتا ہے؟ میں نے ذہن پر بہت زور دے کر سوچا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھ پر غنودگی طاری ہونی لگی۔ سپنے میں بھی نیلم چوہدری کے سنگ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ان دیکھے چمنستاؤں، شاداب اور حسین ان جانی وادیوں میں اس کے ساتھ بہکتے چہکتے سیر کرتا رہا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دن خاصا نکل آیا تھا۔ مجھے صبح نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا۔ اب اس وقت دس بج رہے تھے۔ صبح سوا نو بجے دفتر پہنچنے کے بعد نہ صرف غیر حاضری لگ جاتی تھی بلکہ پورے دن کی تن خواہ بھی کٹ جاتی تھی۔ یہ میری زندگی کا شاید پہلا اتفاق تھا جو اس قدر دیر سے میری آنکھ کھلی تھی شاید اس لیے کہ میرے سارے وجود پر ایک نشہ سا طاری تھا جو مجھ پر نیلم چوہدری کے سپنے نے طاری کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں آج دفتر گول کر دوں جب کہ میری غیر حاضری لگ چکی ہو گی۔ جب کہ اس وقت دس بج رہے تھے اور تن خواہ بھی کٹ چکی ہو گی۔ اس نقصان کی تلافی یہ ہے کہ کیوں نہ نیلم چوہدری کا سپنا دیکھتا اور چشم تصور میں باتیں کرتا اور یہ سوچتا رہوں کہ اس نے کیوں دعوت دی اور میرے لیے ایک معمہ بن گئی تھی اور مجھے یہ معمہ ہر صورت میں حل کرنا تھا اس لیے کہ اس دعوت کی پراسراریت بڑھتی جا رہی تھی اور میری بہت کچھ سوچنے پر یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔

اچانک مجھے چابیوں کا خیال آیا کہ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ دفتر میں قدم رکھتے ہی میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ مجھے وہاں کی فضا بدلی اور سنگین نظر آئی۔ کسی سیاسی جلسے کی سی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ عمارت کے بیرونی دروازے پر پولیس کے چند مسلح سپاہیوں کو مستعد دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ ان کا یہاں کام۔۔۔ دفتر کے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور سرگوشیاں بھی تیز ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں عورتیں بھی گھبرائی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے خصوصاً لڑکیوں عورتوں کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ جب کہ مرد پریشان یا خوف زدہ نہیں تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔۔۔ ایک خیال آیا کہ کہیں ایسا تو کسی نے دفتر کی کسی لڑکی عورت کی بے حرمتی کر دی ہو۔ زیادتی کے امکان کو اس لیے رد نہیں کیا جا سکتا تھا لڑکیاں عورتیں جس بے حجابی اور جس لباس میں آتی تھیں وہ مردوں کے جذبات کو ابھارتی تھیں۔ قصور مردوں اور جوان لڑکیوں کا نہیں بلکہ لڑکیوں عورتوں کے تنگ و چست لباس کا تھا جس میں بے لباس لگتی تھیں۔

پھر میں نے دفتر کے چپراسی عبدل چاچا سے پوچھا جو کسی کام سے میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"عبدل چاچا۔۔۔! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ دفتر میں کیا ایسا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے جس نے ہر کسی کو پریشان کر دیا ہے؟"

"جی۔۔۔ ہاں صاحب۔۔۔!" اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "رات کسی چور نے چوکی دار کو شدید زخمی کر دیا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ہی پتا سکے گا کہ وہ چور کون تھا اور اس کا حلیہ کیسا تھا۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کس چیز سے بے ہوش کیا گیا ہے۔ اسے جان سے مارنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ معجزانہ طور پر بچ گیا۔ سچ ہے مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔"

ایک انجانے خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں نے خائف اور سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

کہیں دفتر میں چوری تو نہیں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دفتر میں دو تین چور گھس آئے ہوں؟"

"نہیں۔۔۔" عبدل چاچا نے جواب دیا "یہاں سے

کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔ دفتر والوں نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرلیا ہے۔"

"تو چور یہاں کیوں اور کس لیے آیا تھا؟" میں نے سوال کیا "دفتر میں کاغذات اور اسٹیشنری ہوتی ہے۔ چور کے لیے کاغذات کس کام کے وہ ردی ہوئے۔" عبدل چاچا نے لاعلمی کے انداز میں اپنے کاندھے اچکائے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ممکن ہے چوکی دار کی مزاحمت پر اس کے ہاتھ وہ چیز نہ لگ سکی ہو جس کے لیے وہ دفتر میں گھسا تھا اور چوکی دار نے چیخ پکار کی ہو گی۔ وہ اس ڈر اور خوف سے بھاگ گیا ہو گا کہ کہیں کوئی اور چوکی دار نہ دیکھ لے جو اس عمارت کے دفاتر میں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ خالی ہاتھ چلا گیا ہو گا۔"

"اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے آیا وہ موت زندگی کی کش مکش میں مبتلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسپتال میں دفتر کے دو ایک لوگ موجود ہیں جنھوں نے باس سے رابطہ رکھا ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اب کیا صورت حال مجھے نہیں معلوم۔"

فوراً ہی میرا ذہن ذکیہ خانم کی طرف گیا۔ وہ اس فرم میں کمرشل فنانس ڈائریکٹر تھی۔ اس کی عمر پچاس ساٹھ برس کی ہو گی۔ اس کی گہری سانولی رنگت تھی۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی پرکشش بھی تھی۔ چہرے کے خدوخال بڑے تیکھے تھے اور بال بھی لمبے چمک دار اور سیاہ تھے۔ جسم بھی نوجوان عورتوں کی پرشباب اور گداز بھی تھا۔ تناسب اور چھریرے جسم کی تھی اور قد قدرے نکلتا ہوا عام لڑکیوں عورتوں سے دراز تھا۔ جس نے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو قیامت خیز بنا دیا تھا۔ اس کے جسم میں اسپرنگ سی لچک تھی۔

ایک وقت تھا کہ کسی لڑکی عورت کو عریاں اور نیم عریاں اور بے حجاب دیکھنا ہو تو اسے لباس سے بے نیاز کردیا جائے لیکن آج یہ صورت حال نہیں تھی۔ آج کل جو تنگ و چست لباس 'ٹی شرٹ' جرسی اور جینز اور پاجامہ عام سا تھا اس لباس میں وہ بے لباس ہی دکھائی دیتی تھی پورا بدن 'باریک سے باریک خدوخال بھی واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ میں یہ سوچتا کہ کیا یہ لڑکیاں عورتیں اس لباس میں ملبوس ہو کر آئینے میں اپنے آپ کو نہیں دیکھتی ہیں اور وہ بے لباس نہیں دکھائی دیتی ہیں؟ اور پھر ماں باپ 'بھائی اور شوہر کیا اندھے ہوتے ہیں اور بے غیرت.... کہ ان کی لڑکیاں عورتیں کس حالت میں نکل رہی ہیں۔

ایک روز میں ایک فائل لے کر اس کے کمرے میں گیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ واش روم میں تھی اور دروازہ ٹھیک سے بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس کے منہ پر صابن لگا ہوا تھا اور تن پر کچھ نہ تھا۔ تب ایک لمحے میں میں نے اسے اس حالت میں ناقدانہ نظروں سے اچھی طرح دیکھ لیا۔ اس کا چھریرا' روغنی اور متناسب بدن میں جاذبیت' دل کشی اور کشش کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جو نمک تھا وہ اس کے بدن پر بھی تھا۔ بھرا بھرا سینہ' سڈول بانہیں اور کولھے' رانیں اور پنڈلیاں بھی سڈول تھیں۔ جب وہ منہ دھونے لگی میں باہر نکل آیا۔ ذکیہ خانم کو کوئی کالی حسینہ' کالی رانی' زہریلی ناگن' کالی حسینہ' کالی سیکسی' ڈریم وومن اور نہ جانے کیا کیا خطابات سے اسے نوازا ہوا تھا۔ اس کے متعلق یہ بات بھی دفتر میں زدعام تھی کہ نوجوان لڑکے اور مرد اس کی کم زوری ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے جسم کو روغنی' چمک دار بنانے اس کی دل کشی برقرار رکھنے کے لیے دنیا بھر کے لوشنز استعمال کرتی ہے۔

ایک روز دفتر میں جو ٹائپسٹ جاوید تھا وہ فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ دراز قد تھا۔ بنگالیوں میں اتنے دراز قد کم ہوتے ہیں۔ ذکیہ خانم نے سنا کہ دو شادیاں کی تھیں جو ڈیڑھ دو برس سے زیادہ چلی نہیں تھیں۔ بنگالی عورتیں بڑی پیاسی رہتی ہیں۔ میرے ایک دوست انصاری نے دو شادیاں کیں اور سال ڈیڑھ سال بعد طلاق دے دی۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ اس کی بیویاں یہ چاہتی تھیں کہ ہر روز ان کی پیاس بجھائی جاتی رہے۔

بنگالی بیویاں ایسا ہی چاہتی ہیں۔ ورنہ وہ اپنے شوہر کے دوستوں، دیوروں اور نوکروں سے تعلقات استوار کر لیتی ہیں۔ ذکیہ خانم کی ازدواجی زندگی کی ناکامی یہی وجہ تھی۔ اس لیے وہ جوان اور نوجوان لڑکوں کی بھوکی تھی۔ ویسے وہ بڑی محتاط عورت تھی۔

گو کہ اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دفتر میں بھی دو ایک جوانوں سے دل بہلاتی رہتی ہے۔ صرف سنی سنائی باتیں تھیں۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب کچھ اسٹاف لنچ کرنے دفتر کے باہر جو ریسٹورنٹ تھے گیا ہوا تھا۔ جو نمازی تھے دفتر کے اسٹاف روم میں نماز پڑھ کر وہیں لنچ کرتے تھے۔ دفتر کے چوکی دار نے ذکیہ خانم کو اس کی گاڑی کی چابی دینے جو مکینک لا کر دے گیا تھا اس کے کمرے کا دروازہ بغیر کسی دستک کے کھولا۔ ذکیہ خانم اس وقت سرخ روشنی کرنا بھول گئی تھی۔ جب وہ اندر گھسا تو اس نے جاوید اور ذکیہ خانم کو غلاظت کے دلدل میں دھنسا ہوا دیکھا۔ ذکیہ خانم پر دیوانگی اور جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ بڑی مہربانی اور فیاضی سے جاوید پر نثار ہو رہی تھی۔ کمرے میں جو ملاقاتیوں کے لیے بڑا صوفہ تھا وہ بستر بنا ہوا تھا۔ جاوید وحشی بنا ہوا تھا۔

چوکی دار کو ان دونوں نے دیکھ لیا تھا۔ چوکی دار فوراً ہی کمرے سے نکل آیا۔ ذکیہ خانم نے اسے سہ پہر کے وقت بلا کر کہا کہ اگر اس نے کسی کو بھی یہ بات بتائی تو وہ کسی اجرتی قاتل سے اسے مروا دے گی۔ لہٰذا وہ اپنی زبان بند رکھے ... اب میں سمجھ گیا کہ ذکیہ خانم افشائے راز کے خوف سے چوکی دار کی موت کے لیے اجرتی قاتل کی خدمات کر لی تھیں۔ اب معمہ حل ہو گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ چوکی دار ہوش میں آنے کے بعد کیا بتاتا ہے۔ بیان دیتا ہے۔ اگر اس نے راز افشاء کر دیا تو ذکیہ خانم کی شامت آجائے گی۔ چوکی دار نے یہ واقعہ صرف مجھے اعتماد میں لے کر بتایا ہوا تھا۔

میں اپنے کمرے میں سانس لینے بھی نہیں پایا تھا کہ باس کی سکریٹری مس رابعہ نے انٹر کام پر مجھ سے رابطہ کیا۔

"مسٹر سراج! باس کہہ رہے ہیں کہ پارٹی کی پانچ لاکھ رقم جو اس نے کل ایڈوانس دی تھی وہ لے کر فوراً" ان کے پاس پہنچیں کیوں کہ پارٹی رقم لے جانے آئی ہوئی ہے۔ معاملہ اس سے طے نہیں ہو سکا۔ وہ بڑی دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

میں نے جیب سے چابیاں نکالیں اور نسیم چوہدری کی میز کی طرف دیکھا جو سامنے کی میز پر ہوتی تھی۔ وہ نظر نہیں آئی۔ میں نے تجوری کے پاس جا کر اسے کھولا۔ دوسرے لمحے میری آنکھیں دھندلا سی گئیں۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ دل کی دھڑکنیں یک لخت رک گئیں۔ میں اس طرح اپنی جگہ منجمد اور جامد و ساکت ہو گیا جیسے مجھ پر کوئی بجلی سی آگری ہو۔ میں نے بہ وقت خود کو سنبھالا پھر آنکھیں مسل کر اپنے سامنے چھائی ہوئی دھند ہٹانے کی کوشش کی تجوری اس طرح خالی پڑی تھی جیسے پھیر دی گئی ہو۔ چرمی بیگ کے ساتھ دفتر کی تیس ہزار کی رقم بھی موجود تھی۔ یہ رقم چھوٹے اخراجات کے لیے میرے پاس رکھی جاتی تھی۔ میں وائچر پر دستخط کرنے کے بعد رقم دے دیا کرتا تھا۔

میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ ایسا لگا جیسے کوئی بھونچال سا آگیا ہو۔ کمرے کی ہر چیز ڈولتی اور گھومتی محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو باس کے کمرے میں بڑے صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔

میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا مجھے اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔ ہاں اگر میں اس وقت دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتا تو اس کا اندازہ ہو جاتا۔ مجھے ہوش میں لانے کی تدبیر کی گئی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے محسوس کیے تھے۔

کمرے میں میرے علاوہ چار افراد اور تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ باس پر پڑی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ نظر آیا لیکن نسیم چوہدری کسی قدر فکر مند اور اور مضطرب دکھائی دی۔ اس کے چہرے کی شادابیاں ماند پڑ گئی تھیں اور اس کی آنکھوں

کے دیئے بجھے بجھے سے تھے۔ اس تردد کا شکار کہ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچ رہی تھی اور دل میں میرے بارے میں دکھی ہو رہی تھی شاید اس رقم کے متعلق سوچ رہی ہو گی اور دل میں میری اس حرکت پر دکھی ہو رہی ہو گی۔

میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر تیسرے شخص کی طرف دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو بارہ سال شہر کے لیے اس کمپنی کی ایجنسی لینے آیا تھا اور پانچ لاکھ کی رقم پیشگی دے گیا تھا۔ آج وہ رقم مجھ پر ایک افتاد ناگہانی بن کر نازل ہو گئی تھی۔ میں گردن تک دلدل میں پھنس چکا تھا۔ وہ شخص کمرے میں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ مضطرب اور ہونق دکھائی دیا۔ اس پر لرزہ طاری تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے رقم واپس نہیں ملے گی۔ حالاں کہ ایسی بات نہ تھی۔ اس رقم کی واپسی کی ذمے دار کمپنی تھی چوں کہ باس نے مجھ سے رقم وصول کی رسید لکھوا کر دی۔ کیشیئر کل چھٹی پر تھا۔ یہ رقم مجھے اپنی تجوری میں رکھنا پڑی۔ نیلم چوہدری نے خود اپنے ہاتھوں سے رقم والا چرمی بیگ تجوری میں رکھا تھا اور چابیاں اپنے پاس رکھی تھیں اس خیال سے رقم واپس کرنی پڑے اس کے بعد میں کہیں نہیں گیا تھا۔

چوتھا چہرہ میرے لیے قطعی اور اجنبی تھا اور نیا تھا۔ اس کی وردی اس کے پیشے کا تعارف کرا رہی تھی۔ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ اس کے چہرے پر پیشہ ورانہ سختی اور آنکھوں میں سے سنجیدگی جھانک رہی تھی۔ وہ کرخت اور سفاک لگا۔ جیسے پولیس افسر نہیں بلکہ ڈاکو ہو۔

وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا اور میری طرف اس تیزی سے لپکا جیسے میں کمرے سے نکل کر بھاگنے کے لیے پر تول رہا ہوں۔ باقی تینوں بھی اپنی جگہ سے اٹھے اور مجھے اپنے حصار میں لے لیا تاکہ میں کمرے سے نکل نہ سکوں۔ جب کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں ان لوگوں کو دیکھ کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر پہلے کا واقعہ یاد آتے ہی خوف کی لہر میرے سارے بدن پر سنسنی بن کر دوڑ گئی۔

پولیس انسپکٹر کے بارے میں میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ وہ کس قدر بے رحم اور سفاک شخص تھا۔ اس نے نہایت ہی جارحانہ انداز سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی جیسے میں قاتل ہوں۔ خونی ہوں۔ اس کا ایک ایک لفظ دو دھاری تلوار بن کر میرے دل میں اتر رہا تھا۔ اس نے درمیان میں دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن پولیس کو نہیں ..... آپ نے میرا نام سنا ہو گا۔ میں انسپکٹر صبور خان ہوں۔ میرا نام سن کر قاتلوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔"

میں نے واقعی اس کا نام متعدد کیسوں میں سنا تھا جو اخبارات میں چھپے تھے۔ وہ بڑا مشہور انسپکٹر تھا اور مجرم اس کا نام سن کر کانپتے تھے۔ اسے خطرناک سے خطرناک مجرموں سے اقبال جرم کروانا آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے اقبال جرم کروا لے گا۔ اس کے زہریلے ڈنکوں کی طرح چبھتے ہوئے سوالات کو انگاروں کی طرح سہتے ہوئے خود کو قابو میں رکھا۔ اس کے ہر سوال کا جواب تحمل سے دیتا رہا لیکن وہ میرے جوابات سے مطمئن نہیں ہوا۔

وہ اپنی ناکامی پر اندر ہی اندر بری طرح کھولتا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے تھانے لے جا کر روایتی انداز سے ٹارچر سیل میں تشدد کا نشانہ بنائے گا اور ایذا رسانی کرے گا۔ پولیس مجرموں کے ساتھ بلکہ ہر شریف آدمی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے۔ اس نے سوالوں کے بعد دیکھا اور محسوس کیا کہ ٹیڑھی انگلی سے بھی گھی نہیں نکلے گا تو اس نے اپنے رویے میں نرمی سے کام لیا۔

"دیکھئے مسٹر! آپ فوج میں افسر رہ چکے ہیں۔ فوج کی بڑی عزت لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ انہیں عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے باس نہیں چاہتے ہیں کہ فوج کا وقار اور امیج مجروح ہو۔ لہٰذا وہ اس واقعہ کو پولیس کیس بنائے جانے سے پہلے چاہتے ہیں کہ آپ اصل حقائق بتا دیں۔ یہ

ان کی بڑی معقول تجویز ہے جس سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔"

"آپ پولیس کے محکمے کے ایک افسر اعلیٰ ہیں۔ لوگ پولیس کو اچھی نظروں سے اس لیے نہیں دیکھتے ہیں کہ رات کو دن اور دن کو رات ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ جو اور جیسا کیس بنانا چاہیں بنالیں۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نیلم چوہدری کے ہاں رات گیارہ بجے تک رہا۔ پھر ان کے چھوٹے بھائی نے مجھے میرے گھر پر ڈراپ کیا۔ میں چوں کہ رات دیر سے سویا تھا اور اس لیے بھی بیدار دیر سے ہوا۔ میں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ چابیاں میرے پاس تھیں۔ میں حیران ہوں کہ ساری رقم مقفل تجوری سے کس طرح چوری ہوگئی۔ یہ پراسرار سی واردات میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"آپ یہ کہانی رہنے دیں۔ ہر ملزم اپنی صفائی اس طرح پیش کرتا ہے۔" وہ رعونت سے بولا۔ "آپ میری بات غور سے سنیں آپ نے اس پہلو پر غور کیا کہ لوگ اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر کس قسم کی رائے قائم کریں گے؟ آپ اس بات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ ساری شہادتیں آپ کے خلاف جاری ہیں اور وہ سب کی سب اس قدر ٹھوس ہیں کہ آپ جرم سے اپنا دامن بچا نہیں سکتے۔ آپ کے باس اور مس نیلم اس امر کے گواہ ہیں اور آپ بھی یہ اعتراف کرچکے ہیں تجوری کی چابیاں آپ کے پاس موجود تھیں۔ آپ نے دفتر پہنچ کر تجوری کھولی تو وہ اسی مقفل تھی۔ اب میں عینی گواہ کی طرف آتا ہوں۔ چوکی دار نے ہوش میں آکر یہ بیان دیا ہے کہ آپ رات کے دو بجے دفتر کے عقبی حصے سے داخل ہوئے جب بیرونی دروازے سے نکل رہے تھے۔ اس کا اور آپ کا سامنا ہوگیا۔ آپ نے اس پر حملہ کردیا۔ آپ نے اس کے سر پر ہتھوڑی سے ضرب لگائی تھی۔ اپنی دانست میں چوکی دار کو قتل کردیا تھا لیکن قدرت نے اسے بچالیا۔ یہ دوسرا سنگین جرم ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ان شواہد کے باوجود صرف ایک شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے۔"

"شرط...؟" میں نے چونک کر پتھرائی سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ وہ رقم واپس کردیں۔" پولیس انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔ "پھر آپ جیل جانے سے بچ جائیں گے۔"

میرے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ میں نے چند لمحوں کی اذیت ناک خاموشی کے بعد مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ "میرے پاس وہ رقم کہاں سے آسکتی ہے۔ جبکہ میں نے چوری نہیں کی ہے۔ کیا کوئی رقم چوری کر کے دفتر آئے گا۔"

"آپ انتہائی ڈھٹائی سے ان ساری شہادتوں کو جھٹلا رہے ہیں۔" پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "چوکی دار کا بیان آپ کو جیل بھجوا سکتا ہے۔"

"چوکی دار کا بیان نہ صرف بے سروپا' بہتان بلکہ سراسر بکواس ہے۔" میں نے ہیجانی لہجے میں چلا کر کہا۔ "اس نے نشہ کیا ہوا ہوگا۔ وہ اس وقت نشے میں ہوگا جب چور آیا تھا۔ اس ذلیل' کمینے اور مردود نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سارا الزام مجھ پر تھوپ دیا ہوگا۔ ایک بات جس کا آپ کو علم نہیں ہے وہ راتوں کو ایک عورت کو لاتا ہے جس سے اس کے تعلقات ہیں۔ اس کے شوہر نے ان دونوں کو ہم آغوش دیکھ کر چوکی دار کو قتل کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ آپ اس کے متعلق دوسرے دفاتر کے چوکی داروں سے معلوم کرسکتے ہیں۔"

"چیخنے چلانے اور اس بہتان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا مسٹر!" انسپکٹر نے تلخی سے کہا۔ "آپ قانون کی نظر میں مجرم بن چکے ہیں۔ آپ یہ مت بھولیں کہ چوکی دار اس واقعہ کا عینی گواہ ہے۔ آپ اس کے بیان کو کسی صورت میں جھٹلا نہیں سکتے ہیں۔ لہٰذا ہٹ دھرمی اور ضد سے کام نہ لیں۔"

"اگر میں ایک تجویز پیش کروں تو اعتراض تو نہ ہوگا۔" نیلم چوہدری نے حصہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔

"جی نہیں۔" انسپکٹر نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "ہمیں ہر صورت میں دفتر کی رقم بازیاب کرانی ہے۔ اس کے لیے میں ہر تجویز پر غور کروں گا۔"

نیلم چوہدری انسپکٹر کی بات سن کر چند لمحے خاموش رہی۔ وہ شاید میری طرف داری کرنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں نہ آپ ابھی اور اسی وقت چل کر ان کے گھر کی تلاشی لے لیں۔ دودھ کا دودھ.... پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

انسپکٹر اس کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔ میں دل میں خوش ہو گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ نیلم چوہدری نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی لیکن میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تیار نہیں ہو گا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کہتی ہیں تو ان کے گھر کی تلاشی لے لیتا ہوں۔ مس نیلم چوہدری! کوئی بھی احمق سے احمق شخص اتنی بڑی رقم چرانے کے بعد اپنے گھر میں رکھ نہیں سکتا۔ انہوں نے یہ سارا کام ایک منصوبے کے تحت کیا ہو گا۔ یہ بھی ایک رسمی کارروائی جو بے مقصد ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ انہیں کسی وجہ سے کہیں اور رقم چھپانے کا کوئی موقع نہ ملا ہو۔" نیلم چوہدری نے کہا۔ "آخر تلاشی لینے میں حرج کیا ہے۔ یہ آپ کی رسمی کارروائی کا تقاضا بھی ہے اور پھر ان کے جھوٹ سچ کا پتا بھی چل جائے گا۔"

"آپ کی تجویز معقول ہے۔" انسپکٹر اتنا کہہ کر میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ "کیا ہم آپ کے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں؟ میں سرچ وارنٹ لے کر آؤں؟ آپ فوراً اپنا فیصلہ سنائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔"

میں ان چاروں کو لے کر اپنے گھر پہنچا اور انسپکٹر سے کہا۔ "آپ بہ خوشی اپنا فرض ادا کریں۔"

انسپکٹر نے سب سے پہلے میرے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی۔ میرے کمرے میں سامان ہی کیا تھا۔ میں ایک مسافر کی طرح رہ رہا تھا۔ تلاشی کے دوران میرا سوٹ کیس کھلوایا گیا۔ انسپکٹر نے ایک کسٹم افسر کی طرح اسے دیکھنا شروع کیا۔ میرے کپڑوں کی تہہ سے نہ صرف دو چرمی بیگ برآمد ہو گیا جس میں پانچ لاکھ کی رقم موجود تھی بلکہ دفتر کی تیس ہزار کی رقم بھی.... وہ رقم جوں کی توں لفافے میں موجود تھی۔

کاٹو تو میرے بدن میں لہو نہیں تھا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے رقم دیکھنے لگا جو کسی زہریلے ناگ کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اب تو میرے پاس تنکے کا سہارا بھی نہیں تھا نہ ہی فرار کی کوئی راہ رہی تھی۔ میں رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا تھا۔

میری نظروں کے سامنے جیل کی کال کوٹھری کسی چڑیل کی طرح منہ چڑا رہی تھی۔ اس رقم کی موجودگی کے چار گواہ تھے۔ انسپکٹر نے میری طرف دیکھا۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں مسٹر....! اب بھی آپ کو اپنے جرم سے انکار ہے؟"

مجھے قانونی گرفت کی اذیت اور عذاب سے اس طرح نجات ملی کہ ان لوگوں کے کہنے پر ایک ایسی تحریر لکھ کر دینا پڑی جو کسی وقت بھی میرے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ اس تحریر سے میں کسی بھی لمحے قانون کی گرفت میں آ سکتا تھا۔ مجھے نہ صرف کٹھ پتلی بنایا جا سکتا بلکہ بلیک میل بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجبوری تھی کہ مجھے اپنے ہاتھ کٹ کر دینا پڑے اس کے بغیر میرے لیے چھٹکارا پانے کا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں بچا تھا۔

اس دن سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا۔ میری حالت ایک مردے سے بھی بدتر تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ کسی نے میرے خلاف سازش کر کے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس منصوبے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بہت کچھ سوچنے کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے پھنسا کر آخر اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

میرا عہدہ بہت معمولی سا تھا۔ دفتر میں میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی جو میرا عہدہ کسی کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔

میری ملازمت کو صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ اس عرصے میں کسی بھی شخص سے ذاتی دشمنی کس طرح ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس پر میں شک کر سکوں۔ جس کسی نے بھی مجھے پھنسانے کا منصوبہ بنایا تھا اس نے بے انتہا ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ شخص چاہتا تو بغیر ڈکار لیے ساری رقم ہضم کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے ذلیل و خوار کر کے شاید ملازمت سے نکلوانا چاہتا تھا کہ میں نہ صرف دفتر والوں کی نگاہوں میں بلکہ خود اپنی نظروں میں گر جاؤں۔۔۔ لیکن آخر کیوں۔۔۔ اس کا اس سے کیا فائدہ تھا؟ عجیب سی پراسراریت تھی۔

ایک خیال اور یہ آیا تھا کہ کہیں وہ نیلم چوہدری کے حسن و شباب پر ریشہ خطمی تو نہیں تھا؟

اس لیے کہ اسے حسد جلن اور شک و شبہات شاید یہ تھا کہ میں صرف نیلم چوہدری کے کمرے میں ہوتا ہوں۔ دفتر میں سب سے زیادہ دراز قد اور وجیہہ تھا۔ شاید میں نیلم چوہدری سے کمرے کی تنہائی اور قرب سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ نیلم چوہدری خود پردگی سے مجھے من مانیاں کرنے دیتی ہے۔ وہ جس لباس اور جس حالت میں ہوتی تھی کاہلتا شباب متوجہ اور بہکانے والا ہوتا ہے۔ میں کیسے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہوں گا اور پھر نیلم چوہدری غیر شادہ شدہ اور جواں سال عورت تھی۔ ایک بھرپور مرد کے قرب میں بہک سکتی تھی۔

دفتر میں ایسی حسین اور جوان لڑکیاں عورتیں ملازمت کرتی تھیں جو نئے فیشن کے لباس ٹی شرٹ میں آتی تھیں اس کا گریبان اس قدر کھلا ہوتا تھا کہ سینے کے ابھار نظر آتے تھے اور اس کی آستینیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ دفتر کا ہال بہت بڑا تھا اور ان کے ہاتھ زیر جاموں تک بہک جاتے تھے۔ اس نے بھی ایسے سنسنی خیز نظارے دیکھے ہوں گے اور دیکھتا رہا ہو گا۔ اس لیے اسے مجھ پر اور نیلم چوہدری پر شک ہو گیا ہو گا میرے اور نیلم چوہدری کے درمیان تعلقات استوار ہیں۔ اس لیے اس نے میرا پتا کاٹنے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ وہ دفتر میں شاید کسی بڑے عہدے پر فائز اور دولت مند بھی ہو۔ اسے دولت کی ضرورت نہیں بلکہ نیلم چوہدری کے حصول کی تمنا ہو۔ اس لیے کہ نیلم چوہدری شباب کی دولت سے بھری ہوئی تھی۔ ایسی پرکشش اور دل کش سینکڑوں ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ وہ شخص یقیناً "دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہو گا جو اس کے حسن و شباب اور دوشیزگی کا مالک بن جائے۔ اس شخص کو دولت کی نہیں بلکہ نیلم چوہدری کے حصول کی تمنا تھی۔ اس لیے اس نے رقم کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں جیل جانے سے باس اور انسپکٹر کی وجہ سے اس لیے بچ گیا تھا۔ میں ایک ریٹائر فوجی افسر تھا۔ دیش میں فوجیوں کو ملازمت مل جاتی تھی۔

میں سوچتے سوچتے بری طرح چکرا رہا تھا۔ بے شمار سوالات ایسے تھے جو میرے ذہن میں زہریلے کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور میرے وجود پر ڈنک مار رہے تھے اور میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا جو مجھے کسی نتیجے پر پہنچا سکے۔

میں کئی روز تک اس جان و صدمے سے اس قدر دل گرفتہ رہا کہ اپنے گھر سے باہر ہی نہیں نکلا اور یوں بھی مجھے باہر نکل کر کرنا بھی کیا تھا؟ میری دنیا میں تاریکی پھیل چکی تھی اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایسا ذلت اور صدمہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی دوست، مونس اور غم خوار نہیں تھا جو میرے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔ گنتی کے چند شناسا تھے جن سے تعلقات محض رسمی تھے۔ ان میں سے کوئی میرا دکھ درد بانٹ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی میرے دامن پر بدنامی اور ذلت کا جو بدنما داغ لگا تھا اسے دھو سکتا تھا۔ اس لیے ان سے مل کر دکھڑا بیان کرنا فضول تھا۔ بجائے وہ ہمدردی کرنے کے زخموں پر

نمک چھڑک کر اور اذیت پہنچاتے۔

میں بستر پر لیٹے لیٹے چھت گھورتا رہتا اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتا۔ میرے ذہن میں اس واقعے سے جو شبہات ابھرتے رہتے تو ان پر گھنٹوں غور کرتا جن کا سراغ ہی ملتا نہیں جب کہ میں بڑی کوشش کرتا۔

ٹھک ہار کر میں نیلم چوہدری کے بارے میں سوچتا۔ اس کا تراشیدہ پیکر اور دل کش چہرہ میرے چشم تصور میں لہراتا اور اس سے باتیں کرتا تو دل کا بوجھ ہلکا سا محسوس ہوتا اور ایک عجیب سا سکون ملتا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ ایک مرتبہ نیلم چوہدری سے مل لینا چاہیے تاکہ اس سے مل کر اپنی صفائی پیش کردوں۔ اس طرح میری سابقہ پوزیشن بحال ہو جائے گی۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھ دار بھی تھی۔

اس روز اس نے جو میری پذیرائی کی تھی میں ان لمحات کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ میری ذات میں دلچسپی لینے لگی ہے ممکن ہے اس کے دل کسی گوشے میں میرے لیے ہم دردی کے جذبات موج زن ہوں۔ شاید اسے میری بے گناہی کا یقین آجائے۔

اس روز جب اس نے مجھے رات کا کھانا کھلایا تب اس کی شیبا بہن نے نیلم چوہدری سے کہا تھا کہ وہ خالہ کے ہاں چکر لگا دے کر ایک گھنٹے میں واپس آجائے گی۔ اس کے بھائی نے کہا وہ اپنے بیمار دوست کی اس کے گھر جا کر عیادت کر کے ایک گھنٹے کے اندر لوٹ آئے گا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں اور نیلم چوہدری رہ گئے تھے۔ جب نیلم چوہدری میرے پاس سے گزری تو اس کا پلو شانے اور سینے سے پھسل گیا۔ جانے اس کے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اس کا بازو جو سڈول گداز اور عریاں تھا اسے تھام کر اور اس کی عریاں کمر میں ہاتھ ڈال کر دبوچ لیا۔ قابو میں کر کے بے بس کر دیا۔ پھر ایک طوفان آگیا۔ میرا خیال تھا کہ بات آگے نہیں بڑھے گی لیکن جب نیلم چوہدری نے کوئی تعرض نہیں کیا اور میں اسے گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا تھا تو وہ بڑی مہربان ہونے لگی۔ خود سپردگی اور فیاضی سے اس نے اپنا سب کچھ مجھے سونپ دیا۔ میرے ہاتھ اور ہونٹ اس کے چہرے اور جسم کے نشیب و فراز کے انگ انگ پر ثبت ہوتے رہے۔ ہم دونوں اس ان جانے راستے پر دنیا و مافیا سے بے نیاز ہو گئے۔ اس طوفان نے نیلم چوہدری کو تاخت و تاراج کر دیا۔ دو مرتبہ طوفان آیا۔ اس نے نشاط انگیز لمحات میں مجھ سے کہا تھا کہ سنیچر کے دن چھٹی ہوتی ہے اس رات تم آجانا.... تم پہلے مرد ہو جس نے مجھے کلی سے پھول بنایا۔ میں دوشیزہ سے عورت ہو گئی۔ فرش پر اس کا لباس اور زیر جامے بکھرے پڑے تھے۔ طوفانوں کے گزر جانے کے بعد اس نے زیر جامے اور لباس کو تن زیب کیا۔ بال سر اور حلیہ درست کیا۔ اس کی بہن کے آنے تک ہم دونوں کے ہونٹ پیوست ہوتے رہے۔

لیکن میں یہ سب کچھ بڑے دکھ اور کرب سے وہ نشاط انگیز لمحات کی یاد سوچ کر رہ جاتا کہ حالات نے میرے ساتھ کیا سنگین مذاق کیا ہے۔ اس روز ہی تو نیلم چوہدری نے اپنی محبت اور دوشیزگی مائل ہو کر مجھ پر نچھاور کر دی تھی۔ اس کی قربت نے مجھے عجیب و غریب جذبات و احساسات میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی سانسوں کی مہک میرے وجود میں رچ بس گئی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ رات کی بات ہے۔ میں زندگی کے اس رخ کی طرف دیکھنے لگا تھا جو اب تک میری نظروں سے اوجھل رہا۔ میرا خیال تھا کہ میرے اور نیلم چوہدری کے درمیان تعلقات کا سلسلہ روز بروز دراز ہو تا جائے گا لیکن دوسرا ہی دن میری زندگی میں تاریکی لیے طلوع ہوا تھا۔ اس میں میرا سب کچھ کھو گیا تھا۔ یہ میری بدنصیبی اور بدبختی تھی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ایک ہفتہ بعد میں نہ چاہتے ہوئے بھی بڑی امیدیں اور توقعات لیے ہوئے نیلم چوہدری کے ہاں جا پہنچا۔

اس لیے کہ رات کے وقت مجھے نیلم چوہدری کی والہانہ محبت' اس کا فیاضی سے مجھ پر مہربان ہو کر اپنا سب کچھ سونپ دینا۔ اس کا چاندی سا بدن اور کشش

کے خزانے جو بیش بہا ہیروں کی طرح تھے وہ مجھے تڑپانے لگے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چوں کہ میں اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوں۔ اس نے اپنی محبت دوشیزگی اور وجود کو والہانہ پن اور وارفتگی سے نچھاور کیا اس رات کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہو گی۔ وہ مجھے یاد کرتی رہتی ہو گی اور میرا قرب کا تصور اس کے لیے بڑا پرکیف ہو گا۔ اس نے اس عرصہ میں اس واقعہ کو فراموش کر دیا ہو گا۔ میرے لیے پیاسی ہو رہی ہو گی۔ وہ میرا انتظار کرتی ہو گی۔ وہ میری بے گناہی کا یقین کر لے گی۔

وہ میرے سینے میں جو غم گساری کی پھانس چبھی ہوئی ہے نکال سکتی ہے۔ ایسا ہونے کی صورت میں مجھ میں جینے کا حوصلہ پیدا ہو گا۔ وہ میری جھولی میں پھر سے کسی پکے پھل کی طرح ٹپک پڑے گی اور بڑی محبت' خود سپردگی اور والہانہ پن سے مہربان ہو کر خوش کرے گی۔ شکوہ شکایت کے دفتر کھول دے گی۔ ہر طرح سے مجھے خوش کرے گی۔ میں اسے چوم کر نڈھال اور سرشار کر دوں گا۔

لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ میری سوچ اور توقع کے برعکس ہوا تھا۔ میں سیدھا اس کے بیڈ روم میں پہنچا تھا اور اس وقت نہا کر نکلی تھی اور اس نے اپنا مرمریں' سڈول اور گداز بدن ٹرکش تولیا میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تولیا نکال کر پھینک دے گی۔ ایسا نہ ہوا مجھے دیکھتے ہی اس کی شہابی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ وہ میرے ساتھ اس قدر رکھائی سے پیش آئے گی۔ اس کا حسین چہرہ نفرت سے سکڑ گیا اور اس بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں حقارت کی چنگاریاں بھڑکنے لگی۔

"تم کس لیے آئے ہو؟" اس نے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کیا۔

"اس لیے کہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ میری وضاحت سن لو کہ میرے خلاف سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سازش کی گئی ہے۔"

"میں اس واقعہ کے بارے میں کوئی بات اور صفائی سننا نہیں چاہتی ہوں۔" اس نے درمیان میں کہا۔

"پلیز....!" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کیا۔ مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا۔

اس کا ایک ایک لفظ اور لہجہ میرے دل میں زہریلے تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ میرا دل اندر سے ٹوٹ کے کانچ کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔

"نیلم....!" میں نے کہا۔ "وہ رات کتنی حسین اور یادگار تھی۔ کیا تم اسے بھول گئی ہو؟"

"تم نے اس رات میری بے حرمتی کی.... میری دوشیزگی کو تاراج کیا۔ لڑکی سے عورت بنا دیا۔ میں نے اس لیے برداشت کیا کہ تم نیک آدمی ہو.... کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ تم لٹیرے ہو اور تم نے یہاں سے جا کر دفتر کی رقم چرائی۔ اگر ایسا نہ کرتے تو؟"

پھر اک دم سے تولیا اس کے جسم سے پھسل گیا تو اس نے اٹھا کر اپنا جسم ڈھانکنے کی کوشش نہیں کی۔

"خبردار....! جو تم نے مجھے دبوچ کر بے بس کیا۔ میں شور مچا دوں گی کہ تم میری عزت لوٹنے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ۔"

جب میں شکستہ دل اور مایوس لوٹنے لگا تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"آئندہ تم مجھے اپنی شکل مت دکھانا.... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

☆ ☆ ☆

وہاں سے لوٹتے وقت میں نے رکشا ڈریم لاج کے سامنے روکوایا۔ اس میں ذکیہ خانم رہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید مجھ سے ہم دردی کرے گی اور شاید باس سے سفارش کر کے دوبارہ مجھے سابقہ ملازمت پر بحال کرا دے گی۔ میری صفائی پر یقین کر لے گی۔

چوکی دار سے معلوم کر کے اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ اطلاعی گھنٹی بجائی تو چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے اس کے فلیٹ پر افسوس ہوا کہ میں یہاں کیوں آیا۔ وہ تو میری صورت

تک دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔

"تم ..... ؟" اس نے اپنی رسیلی آواز میں کہا۔ "آؤ' آؤ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟"

اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس کا فلیٹ دو کمروں کا تھا جو خوشبوؤں سے معطر ہو رہا تھا۔ اس نے سفید جالی دار نائٹی پہن رکھی تھی جس کے اندر اس کا نیگرو رنگت کا جسم اور نشیب و فراز جھانک رہے تھے۔ سفید لباس نے کالے جسم کو جیسے ڈھانک رکھا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ مجھے بیڈ روم میں لے آئی۔ وہاں ایک بیڈ تھا اور اس کے سرہانے جو میز تھی اس پر طرح طرح کے پرفیوم اور لوشنز لیے ہوئے تھے۔ دیوار پر قد آدم آئینہ تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔

"کیسے آنا ہوا؟ میری یاد کیسے آ گئی! ادھر کا راستہ کیسے بھول پڑے؟" وہ اپنائیت کے لہجے میں بولی۔

"مجھے آپ کی مدد' تعاون اور سفارش کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ بتانے آیا ہوں میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اور ایک سازش تھی۔"

"میں حاضر ہوں تمہاری مدد کرنے۔" وہ بولی۔ "میں نے باس سے کہا تھا کہ تم بے قصور ہو۔ تمہارے خلاف سازش کی گئی ہے۔ لیکن میری اس کو باس نے تسلیم نہیں کیا۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی رقم چوری کر کے اپنے گھر میں چھپا کر نہیں رکھتا ہے۔"

"یہی بات میں نے انسپکٹر' مس نیلم چوہدری اور باس سے کہی تھی لیکن انہوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

"اچھا سنو..... میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتی ہوں کیا تم مجھے سچ سچ بتانا پسند کرو گے؟" ذکیہ خانم نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"نیلم چوہدری اسٹاف کی لڑکیوں عورتوں میں سب سے حسین' پرکشش اور سیکسی عورت ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں سبھی لڑکیاں عورتیں نہایت حسین ہوتی ہیں۔ آپ بھی تو بہت حسین اور پرکشش ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں اپنی نہیں بلکہ نیلم چوہدری کی بات کر رہی ہوں۔ تم اس کے ماتحت ہو اور اس کے کمرے میں بیٹھتے ہو..... تم دفتر کے اسٹاف میں سب سے زیادہ خوب صورت اور وجیہہ اور دراز قد ہو..... فوجی' فوجی ہوتا ہے۔ میں نے تم دونوں کے متعلق لڑکیوں عورتوں سے کچھ باتیں سنی ہیں۔"

"آپ نے کیا سنا ہے؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سنا ہے کہ تم دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہیں۔ بوس و کنار عام سی بات ہے۔ بھٹکتے اور جھکتے ہیں اور وہ کبھی بیڈ روم بھی بن جاتا ہے۔"

"یہ غلط بات ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ میری افسر ہیں۔ میں ایسی حرکت کی جرات کیسے کر سکتا ہوں۔"

"افسر اور ماتحت کی بات نہیں۔ پہلے عورت اور مرد ہو..... بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا بری بات نہیں۔" وہ مسکرا دی۔ "ایک جوان مرد تنہائی میں ایک نیم عریاں عورت کو دیکھتا ہے تو اس کا دل اس پر آ جانا فطری بات اور جوانی کا تقاضا ہے۔"

"میں ان باتوں کو جھٹلا نہیں سکتی..... یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ نیلم چوہدری جیسی پرشباب عورت سے تم نے دل بہلایا؟"

"یہ وہ لڑکیاں عورتیں مجھ پر الزام لگا رہی ہیں کہ میں ان سے دور رہا۔ اس دفتر کا ماحول بڑا پراگندہ سا ہے۔ میں نے کتنی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا کہ مرد ان کے ساتھ من مانیاں کر رہے ہیں۔ جانے کیا حرکتیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا ایک بات سچ سچ بتانا کہ دفتر کے مرد اور لڑکیاں میرے متعلق کیا رائے رکھتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میری کردار کشی ہوتی ہے؟"

"دفتر میں آپ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی

کم زوری نوجوان لڑکے ہیں۔ دفتر میں آپ ان سے کھلونے کی طرح کھیلتی ہیں۔ آپ کو سیکسی بلی کہا جاتا ہے۔ آپ کے حسن کی بھی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ بلیک بیوٹی اور بلیک کوئن کہا جاتا ہے۔"

"اچھا سنو ... میں ایک شرط پر تمہاری سابقہ ملازمت بحال کرا سکتی ہوں؟" ذکیہ خانم نے موضوع بدلا۔

"کیسی شرط ...؟" میں نے ششدر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ اس کے عوض بڑی رقم دوں میرے لیے ناممکن ہے۔"

"میں تم سے رقم کا مطالبہ تو نہیں کیا؟" وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"پھر آپ اس کے عوض کیا چاہتی ہیں! شرط کڑی اور میرے لیے ناقابل قبول تو نہیں ...؟"

"نہیں ..." وہ دل فریب انداز سے مسکرائی۔ "وہ شرط ایسی ہے کہ تم خوشی خوشی اور اشتیاق سے پوری کرو گے۔"

"اگر شرط نرم اور میرے بس اور اختیار میں ہے تو پوری کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "جلدی سے بتائیں کہ شرط کیا ہے؟"

اس نے اپنی نائٹی اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ وہ میرے سامنے بے لباسی کی حالت میں کھڑی تھی۔

"تم ایک ماہ تک میرے ساتھ راتیں گزارو گے۔ میں نہ صرف سابقہ ملازمت بلکہ ترقی بھی دلوا دوں گی۔"

میں اسے فطری حالت میں دیکھ رہا تھا۔ عورت عورت ہوتی ہے۔ اس کا حسن ہر رنگ میں ہوتا ہے۔ ... گوری، سانولی، گندمی اور کالی رنگت میں بھی ... وہ شعلہ مجسم بنی کھڑی تھی۔ اس کا جسم پرشباب تھا۔ ریشم کے سے گداز سے بھرا ہوا۔ فتنہ خیز ... بڑا رسیلا تھا ... اس کے تناسب ہیجان خیز تھے۔ سینے کے ابھاروں میں بڑی دل کشی اور جاذبیت تھی۔

"جی ... جی۔" میں گڑبڑا سا گیا۔ "کیا اور شرط نہیں ہو سکتی؟"

"کیا میں بدصورت اور بے کشش ہوں جو تمہیں تذبذب سا ہو رہا ہے؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ باہم پیوست ہو جاؤں ... میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دو ... یہ کالے اور بھرے بھرے ہیں لیکن ان میں مٹھاس بھری ہوئی ہے ... میرے جسم کے ہر گوشے اور انگ انگ میں رس ہی رس ہے۔ مجھے ایک بار اپنی آغوش میں لے کر چومو تو اندازہ ہو گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے اپنی عریاں بانہیں میرے گلے میں حائل کر دی اور پھر میرے چہرے پر جھک کر اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہی تھی۔ وہ نیگرو کی طرح تھی۔ جتنی کالی تھی اتنی ہی گرم بدن کی تھی۔ نیلم چوہدری کے جسم میں اتنی گرمی نہیں تھی ... میں اس کے ساتھ بہکتا اور ان جانے راستے پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ غیر محسوس انداز سے مزاحمت کی تو اس کے ہاتھ حرکت میں آ گئے اور ہونٹ بھی ساتھ دینے لگے۔ نشاط انگیز لمحات سے میں خود کو بچا نہ سکا تھا۔ غلاظت کے دلدل میں گر پڑا ... اس نے مجھے کسی کتیا کی طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ جب طوفان گزر گیا تو میں نڈھال پڑا تھا۔

وہ صرف کالی ہی نہیں تھی۔ کالا جادو بھی تھی۔ اس کا کالا حسن آتش فشاں تھا ... اس نے مجھے صبح تک روک لیا۔ رات سے صبح تک تین طوفان آئے۔ وہ بلیو فلم کا کردار بنی مجھے کیف و سرور اور لذت سے آشنا کرتی رہی۔

پھر میں نے کبھی اس کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ کالی چڑیل تھی۔ میرا سارا خون پی جاتی۔

☆ ☆ ☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران مجھے کالی جادوگرنی کی یاد آتی اور ستاتی رہی۔ کیوں کہ اس نے ایسے ایک بے کیف اور لذت سے آشنا کیا تھا جو ہر عورت اور طوائف بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ایک کتیا کی طرح ہر

فعل سے اس لیے خوش کرتی رہی کہ میں اس کا اسیر ہو کر رہ جاؤں دفتر میں جو فٹ بال کا کھلاڑی تھا جس سے اس کے تعلقات استوار تھے اس نے ایک روز مل کر مجھ سے کہا تھا کہ یہ بڑی زہریلی عورت ہے۔ کالی ڈائن نے میرا خون چوس لیا جس طرح بھونرا کلیوں کا رس چوستا ہے۔ اب میں ایک ناکارہ اور سراب ہو کر رہ گیا ہوں۔ تم اس سے دور رہنا۔ اس کی تم پر نظر ہے۔

☆ ☆ ☆

آہستہ آہستہ ذہنی طور پر نارمل ہوتا گیا۔ میں ایک حقیقت پسند شخص کی طرح اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا کی سنگلاخ زمین پر آجانا چاہیے۔ تنگ دستی اور فکر معاش نے نیلم چوہدری کا خیال دل سے کافی حد تک دور کر دیا تھا۔ اب مجھے دوبارہ زندگی کے جہنم میں جدوجہد اور مشقت کرنا تھی پنشن کی رقم سے کیوں کر گزارہ ہوتا۔ پس انداز کی ہوئی رقم کب تک اس گرانی میں چلتی۔ گرانی تھی کہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سامنے حقیر اور کم تر ہوتی جارہی تھی۔

ملازمت کے حصول کے لیے میں نے بڑے بڑے اخبارات کے کلاسفائیڈ اشتہارات دیکھے۔ ان میں خالی آسامیوں کے اشتہارات بھرے ہوئے تھے۔ میں نے کوئی پندرہ سولہ فرموں میں درخواستیں ارسال کیں۔ اب میرا کام روزگار کا حصول رہ گیا تھا۔

ایک شام مجھے بڑی وحشت محسوس ہوئی۔ اس کی وجہ بے کاری تھی۔ گو کہ میں اپنا بیشتر وقت رمنا پارک اور بازاروں میں بے مقصد مٹرگشت اور آوارگی کر کے گزارتا تھا۔ میں اس تماش کا نہیں تھا کہ حسین اور نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر دل بہلاؤں۔ نیلم چوہدری اور ذکیہ خانم حادثاتی طور پر میری زندگی میں آئیں۔ لیکن جب بازاروں اور سرراہ ایسی لڑکیوں عورتوں کو دیکھتا جو بے حجابی اور تنگ و چست لباس میں عریاں اور شرمناک دکھائی دیتیں تو وہ دونوں یاد آجاتی تھیں۔ پھر بھی ان کا خیال ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔

میں نے وحشت دور کرنے کی غرض سے گلستان سینما میں کبوری کی ایک پرانی فلم کی نمائش ہو رہی تھی تو میں نے یہ فلم دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ نوجوانی میں کبوری میری پسندیدہ اداکارہ رہی تھی۔ میں نے کبھی بھی اس کی کوئی فلم نہیں چھوڑی تھی۔

جب میں فلم کا آخری شو دیکھ کر پیدل گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ گلیاں ویران اور سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف گہرا طاری تھا۔ میں رینکن اسٹریٹ کے نکڑ پر پہنچا تھا کہ عقب سے کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ اسٹریٹ بلب کی زرد روشنی میں ایک نسوانی چہرہ وحشت زدہ انداز میں میری سمت دوڑتا چلا آرہا تھا۔ میں اک دم سے ٹھٹک کر رک گیا۔

میری رگوں میں ایک عجیب سی سن سناہٹ دوڑ گئی تھی۔

وہ تیزی سے بھاگتے بھاگتے ہوئے پیچھے کی طرف بار بار مڑ مڑ کے بھی دیکھتی جارہی تھی جیسے اس کا تعاقب کیا جارہا ہو۔ اس کے اس انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی چیز کسی گھر سے چرا کے بھاگ رہی ہو۔ وہ خوف زدہ اور ہراساں تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی تو شاید رک جاتی اور اس کے آس پاس جو بغلی گلیاں تھیں ان میں سے کسی ایک میں گھس جاتی۔

میرے قریب سے گزرتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو بڑے زور سے چونکی اور ٹھٹک کے رک گئی۔

میں نے اسے دیکھا وہ نہ صرف نوجوان بلکہ ایک کشش لڑکی تھی۔ رات کے وقت اس کے حصول کے لیے کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا تو اس میں تعجب کی بات نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک پل میں میرا سراپا جائزہ لیا۔ وہ اندازہ کر رہی تھی کہ میں کیسا آدمی ہوں۔

پھر اس نے میرے قریب آکر آہستہ سے لہجے میں کہا۔ ”خدا کے لیے.... مجھے بچائیں۔“

تیز دوڑنے کے باعث اس کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں اور سینے میں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس کے لہجے میں التجا سی بھری تھی۔ اس نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ ”بدمعاش میرے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔“

”کون لوگ ہیں وہ....؟“ میں نے اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آئی تھی اور میں نے سوال کیا۔ ”کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟“

”نہیں.... میں نہیں جانتی۔“ اس نے لرزاں آواز میں کانپتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی ایک بیمار سہیلی سے مل کر گھر جانے کے لیے رکشا تلاش کر رہی تھی کہ انہوں نے مجھے دیکھ کر نرغہ میں لے لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لے جانے لگے تو میں کسی طرح ہاتھ چھڑا کے اور موقع پا کے نکل بھاگی۔ انہیں چکمہ دے کر آئی ہوں۔ پلیز! جلدی سے بھاگ چلیے.... مجھے جلدی سے کہیں چھپا لیجئے۔“ اس کی سانسیں قابو میں نہیں آرہی تھیں۔

”وہ تعداد میں کتنے ہیں؟“ میں نے اس خیال سے پوچھا کہ اگر وہ دو ایک ہیں تو ان سے نمٹ لوں گا۔

”چار ہیں۔“ اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ ”بڑے خطرناک ہیں اور وہ چاقوؤں سے مسلح ہیں۔“ یہ سن کر کہ وہ تعداد میں چار اور چاقوؤں سے مسلح ہیں میرے بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے مخالف سمت دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے.... میری زندگی اور عزت کا سوال ہے۔ میں اپنی عزت آبرو بچانے کے لیے جان پر کھیل کر بھاگی ہوں۔ اگر انہوں نے مجھے اغوا کر لیا تو پھر وہ مجھے پارک یا کسی مکان میں لے جا کے میری اجتماعی بے حرمتی کریں گے۔“

لڑکی نے جو کچھ کہا وہ غلط نہ تھا۔ یہ لمحہ ایسا تھا کہ میں لڑکی سے مزید پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس قدر خوف زدہ اور ہراساں تھی کہ مجھے اس پر ترس آگیا۔ اس گہرے سناٹے میں بہت دور سے کئی آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

میں نے لڑکی کا مرتعش ہاتھ پکڑ لیا اور ہارمنی اسٹریٹ کی طرف لپکا۔ کیوں کہ وہ قدرے محفوظ لگی۔ اب وہ آوازیں برابر کی گلی سے آرہی تھیں۔ شاید ان بدمعاشوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ لڑکی اس برابر والی گلی میں گھسی ہے۔

دفعتاً خاموشی چھا گئی۔ دوسرے لمحے اس گہرے سناٹے میں ایک بھاری آواز گونجی۔

”میرا خیال ہے کہ.... وہ لڑکی.... ادھر واٹر اسٹریٹ کی طرف بھاگی ہے۔ ادھر چل کر دیکھتے ہیں۔“ لڑکی کے منہ سے دبی دبی سی چیخ نکلی۔ اس کا چہرہ متغیر سا ہو گیا وہ سہم کر بولی۔

”غضب ہو گیا۔ وہ بدمعاش اس طرف ہی آرہے ہیں۔ اب ہماری خیر نہیں۔“

خطرہ ہمارے سروں پر موت بن کر منڈلانے لگا تھا۔ اگر دو ایک بدمعاش ہوتے تو آسانی سے نمٹ سکتا تھا لیکن اس لڑکی نے بتایا تھا کہ تعداد میں وہ چار ہیں اور مسلح بھی ہیں۔ میں چوں کہ نہتا تھا لہٰذا بیک وقت ان چاروں مسلح بدمعاشوں سے کیسے لڑ سکتا تھا لیکن ان کے سامنے سینہ سپر ہو کر لڑکی کو فرار کا موقع تو دے سکتا تھا۔ گو اس میں بھی مجھے اپنی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

”گھبراؤ نہیں....“ میں نے اسے دلاسا دیا ”اللہ مالک ہے۔ خود کو قابو میں رکھو اور ہمت سے کام لو۔“

میں لڑکی کا ہاتھ پکڑ کے اسے گھسیٹتا ہوا ایک قریبی بنگلے کی طرف بڑھا۔ یہ بنگلہ ڈاکٹر مشتاق خوند کر کا تھا جو اپنی بیوی اور اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے ایک حصے میں ڈسپنسری بنائی ہوئی تھی۔ صبح کے وقت مریضوں کو دیکھتے تھے۔ بنگلے کا گیٹ بوسیدہ حالت میں تھا۔ وہ کھلا پڑا ہوا تھا۔ ان کے بنگلے کے برآمدے میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کا بنگلا جائے پناہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں لڑکی کے ساتھ

اس بنگلے کے احاطے میں گھس گیا۔ اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ کوئی اور محفوظ جگہ بھی نہیں تھی۔

پورا بنگلا گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن یہ تاریکی ہمارے لیے معاون ثابت ہو رہی تھی۔ وہ تحفظ دے رہی تھی۔ ہم دونوں چوروں کی طرح دبے پاؤں آگے تو اس جگہ جو عقبی حصہ تھا۔ لڑکی چوں کہ بد حواس اور پریشان تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور میں اپنے جذبات پر جو اس کے لمس سے میرے تند ہونے لگے ایک ان جانی خواہش اکسانے لگی کہ میں اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔ اس کے ہونٹوں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کر لوں۔ اس کی گردن اور رخساروں کو بوسوں سے سرخ کر دوں۔ شیطانی خیالات مجھے اکسا رہے تھے کہ اسے بری طرح دبوچ کر قابو میں کر لوں.... میں نے اپنے ہاتھ کو روک لیا جو زیر جامے تک پہنچنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ اس کا گریبان نئے فیشن کا تھا جو بے حد کھلا ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میرے اندر کا آدمی بیدار ہو گیا جو اس کی زندگی اور عزت و آبرو کا تحفظ دینے یہاں لایا تھا۔ میں کیسے بہک کر اس کی کم زوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لڑکی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ میرے لیے بہت بڑی آزمائش تھی خود کو قابو میں رکھنے کی، جوان عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ پڑوس میں جو کوٹھی تھی اس کی بالائی منزل کی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنی ساری توجہ لڑکی کے قرب سے ہٹا کر سڑک کی طرف لگا دی۔ چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ بہت سارے قدموں کی آوازیں ابھریں لڑکی مجھ سے دہشت زدہ ہو کر چمٹ گئی۔ وہ لوگ بنگلے کے بیرونی دروازے کے پاس آ کر رک گئے تھے۔

"آخر وہ گئی کہاں....؟" ایک کرخت آواز گہرے سناٹے میں گونجی یہ کہیں نظر نہیں آ رہی ہے۔ کمینی چکمہ دے گئی۔"

"شاید وہ کسی گھر میں گھس گئی ہو گی؟" دوسری آواز نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا۔

"اتنی جلدی وہ کسی دوسرے گھر میں کیسے پناہ لے سکتی ہے؟" تیسری آواز نے سرگوشی کی۔ "یا تو پھر وہ مدن موہن سباک روڈ کی طرف نکل گئی ہو گی۔"

"نہیں...." دوسری آواز نے تکرار کی۔ "وہ شاید کسی گھر کی دیوار پر چڑھ کر اس میں اتر گئی ہو گی۔"

"کہیں وہ اس بنگلے میں تو چھپ نہیں گئی؟" چوتھی آواز اپنے شک کا اظہار کیا۔ "یہ بنگلہ تاریکی میں ڈوبا ہوا۔ کیوں نہ ہم اس گھر کی تلاشی لیں۔" کوئی میرے ساتھ آئے۔ اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ اس نے تاریکی سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" کرخت لہجے میں تائید کی۔ "جلدی سے تلاشی لے کر دیکھو۔ یہاں نہ ہوئی تو کہیں اور تلاش کریں۔"

لڑکی پر جیسے کوئی بجلی سی گری تھی۔ وہ دہشت زدہ ہو کر میرے اور قریب ہو گئی۔ اس کا پورا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا خوف کم کرنے کے لیے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آگ لگ جائے۔ میں خطرہ محسوس کرنے میں نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے اپنا دفاع کر سکوں اور بد معاشوں سے لڑکی کو محفوظ رکھ سکوں۔ میں نے اسے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسے بازوؤں کے حصار سے نکال کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک ڈنڈا پڑا دکھائی دیا جو تین فٹ لمبا تھا۔ میرے بدن پر خوشی حوصلہ بن کر دوڑ گئی۔ میں اس ڈنڈے سے بیک وقت ان چاروں بد معاشوں سے مقابلہ کر سکتا تھا آخر کو ایک فوجی جو تھا۔ میں نے لپک کر وہ ڈنڈا اٹھا لیا۔ یہ ڈنڈا بہت مضبوط تھا۔ اس کی ایک ہی ضرب نہ صرف ہڈی توڑ سکتی تھی اور کھوپڑی کے دو حصے بھی کر سکتی تھی۔

اس لمحے میرے پیروں تلے کوئی چیز آئی تو میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ کرکٹ کی گیند کے سائز کا ایک

پہاڑی نوکیلا پتھر تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے پتھر اٹھا لیا۔ لڑکی کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس نے چونک کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم اسے کسی بھی بدمعاش کے سر پر دے مارنا۔" میں نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر سرگوشی کی۔

لڑکی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں پتھر کانپنے لگا۔ وہ کسی ان جانے خوف سے بری طرح لرز رہی تھی۔

"کیا تمہیں اپنی زندگی اور عزت و آبرو نہیں بچانی ہے؟" میں نے اس کا شانہ تھپک تھپایا۔ "گھبراؤ نہیں ..... میں ان بدمعاشوں سے تنہا نمٹ لوں گا۔ میں نے تمہیں یہ پتھر اس لیے دیا ہے کہ کہیں کوئی بدمعاش زبردستی لے جانے کی کوشش کرے تو اس کا سر پھاڑ دینا۔"

صرف ایک بدمعاش بنگلے کے احاطے میں گھسا تھا۔ اس کی آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عقبی حصے کی طرف آہستگی سے آرہا ہے۔ میں مستعد ہو گیا۔ میں نے سینے میں سانس روک کر ڈنڈے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی متوقع حملے کے انتظار میں چوکنا ہو گیا۔ لڑکی نے میری پشت پر کھڑے ہو کر مجھے ڈھال بنا لیا۔ شاید کوئی کھڑکی کسی وجہ سے کھولی گئی تھی۔

اچانک کسی کمرے میں کھسر پھسر کی آواز گونجی اور اس احاطے کے ایک گوشے میں روشنی پھیل گئی۔

اس بدمعاش کے قدموں کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تھا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کون ہے .....؟" ڈاکٹر خوند کر مانوس آواز سناٹے میں گونجی۔ پھر اس نے جواب نہ پا کر پھر کہا "کون ہے بھئی؟"

اس آواز کے جواب میں وہ لوگ تیز تیز قدموں سے جانے کس سمت نکل گئے۔

"شاید پلی ہو گی؟" ڈاکٹر خوند کر کی جواں سال بیوی کی آواز گونجی یہ تم نے روشنی کیوں کی! دیکھ نہیں رہے ہو میں صرف زیر جاموں میں ہوں۔ چلو جلدی سے کھڑکی بند کرو ..... اور سو جاؤ کوئی ہوتا اور مجھے اس حالت میں دیکھ لیتا۔"

"اب تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے نیند کہاں آئے گی؟ تم زیر جامے میں کیا غضب ڈھا رہی ہو۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

"اب مجھے سونے دو اور تنگ نہ کرو۔ میں بے حد تھکی ہوئی ہوں۔ میرے پاس نہ آنا۔"

چند ثانیوں کے بعد وہ کھڑکی ہلکے سے شور کے ساتھ بند ہو گئی۔ دوبارہ پھر وہی اندھیرا اور سکوت طاری ہو گیا۔

تاہم میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ اصل خطرہ ٹل جانے کا میں اچھی طرح اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اب ان بدمعاشوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر کھڑے انتظار کر سکتے تھے کہ لڑکی کہیں سے شاید نکل آئے۔ لڑکی ایسی پیاری تھی کہ وہ اسے ہر قیمت پر اغوا کرنا چاہتے تھے۔ خاص دیر گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ کیوں کہ اس دوران کوئی آہٹ یا کسی قسم کا کوئی شور سنائی نہیں دیا۔ فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ آخر وہ کب تک لڑکی کا انتظار کرتے۔ تھک ہار کے اس کی تلاش میں کسی اور سمت لے گئے تھے۔

میں نے گردن گھما کر لڑکی کی طرف دیکھا تاکہ اس سے چلنے کے لیے کہوں۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا اور اس کے چہرے پر طمانیت آگئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے قریب ہو کر احتیاطاً سرگوشی اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر ہدایت کی۔

"تم میرے پیچھے پیچھے دبے پاؤں آنا۔ اب خطرے والی بات نہیں رہی ہے۔ بدمعاش جا چکے ہیں۔ فکر اور پریشانی کی بات نہیں۔"

"لڑکی نے پہلے تو اپنے بکھرے بال درست کیے جو میری آغوش میں پناہ لینے سے بکھر گئے تھے۔ بلاؤز بھی ٹھیک کیا۔ پھر میرے پیچھے سے آکے اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے پیر لڑکھڑانے لگے تو میں

نے اس کی عریاں، لچک دار اور نازک کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا۔

ہم دونوں چند ثانیوں میں سڑک پر پہنچ گئے۔ میں اسے لے کر دائرا سٹریٹ کی طرف بڑھا جہاں میری قیام گاہ تھی۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کے گھر کا پتا معلوم کرتا اور رات کے اس سمے اسے اس کے گھر چھوڑ آتا۔ کیوں کہ اس وقت سواری کا ملنا مشکل تھا۔

اچانک ہی بہت دور سے کئی آدمیوں کی آوازیں آپس میں باتیں کرنے کی جو ہلکی ہلکی سی سنائی دیں، خطرہ دوبارہ سروں پر منڈلانے لگا تھا۔ ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ چند لمحے بعد ہم دائرا سٹریٹ پر آ گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے تالا کھولا۔ لڑکی کو ساتھ لے کمرے میں گھسا۔ لڑکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگا کر زیرو پاور کا بلب روشن کر دیا۔ ٹیوب لائٹ آن کر کے میں کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بدمعاش میرے کمرے میں تیز روشنی دیکھ کر مشکوک ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ اس گلی کے تمام مکانوں میں اندھیرا تھا۔

زیرو پاور کا بلب دودھیا تھا لیکن اس کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ لڑکی کا سراپا واضح اور نمایاں طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ متناسب بدن اور جاذب نظر نقوش کی مالک تھی۔ اس کے بھڑکیلے بدن میں مردوں کو متوجہ کرنے والی کشش موجود تھی۔

اس کے چہرے اور آنکھوں سے جو علامات نمایاں تھیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ لڑکی مشکوک کردار کی ہے۔

مجھے اس لمحے ہلکا سا تاسف اور پچھتاوا سا ہوا۔ ایسے کردار کی لڑکی کا تعلق بدمعاشوں سے ہو سکتا تھا۔ مجھے اب اس بات کا خیال اس پل آیا کہ بدمعاشوں کے خوف سے جب لگ کر کھڑی ہوئی تو میں نے قدرے فاصلہ رکھنا چاہا تو اس نے دہشت کا تاثر دیتے ہوئے میرے ہاتھوں میں اس طرح سما گئی کہ ہم آغوشی کی سی حالت میں ہو گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کمر پر رکھ لیا اور چہرہ اس قدر قریب کر لیا تھا کہ میں اس کے گال اور ہونٹ چوم کر من مانی کروں۔ لیکن میں نے بے اعتنائی برتی اور میرے دل کے کونے میں ذرہ برابر بھی میل نہیں آیا۔ اگر میں اسے بری طرح چومتا، من مانیاں کرتا تو وہ تعرض نہ کرتی۔ ایک ان جانے خوف کا احساس میری ریڑھ کی ہڈی میں کسی خنجر کی نوک کی طرح اتر گیا۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لیے رسوائی کا سبب بن سکتی تھی۔ میری جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اس لڑکی کو بدچلن اور فاحشہ سمجھ کر اس پر ٹوٹ پڑتا اور دل کے ارمان پورے کر کے اسے گھر سے نکال دیا میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی سے جلدی سے چھٹکارا حاصل کرنا اس قدر میرے حق میں بہتر ہو گا۔

لڑکی کا لباس قدرے نامناسب اور بے حجابی کی نمائش کر رہا تھا۔ کوئی بھی ایک اچھی گھریلو لڑکی اس لباس میں رات کے وقت اپنی سہیلی سے ملنے نہیں جا سکتی تھی اور نہ ہی رات کے ایک بجے کے لگ بھگ اکیلی سہیلی کے ہاں سے نکل کر گھر جا سکتی تھی اور اس لباس میں رات کے وقت اسے اکیلی دیکھ قابو میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے بشرے سے لگ رہا تھا کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔ وہ میرے کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی قدرے بے نیازی سے ایک ایک چیز کا طائرانہ انداز میں جائزہ لے رہی تھی جیسے وہ اس کی خریداری کرنا چاہتی ہو۔ میرا گھر ایسا آراستہ نہیں تھا کہ جو کسی کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ میں مسافروں کی طرح مختصر سازو سامان کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اس سپاہی کا یہ گھر تھا اور اس میں کوئی تزئین اور آرائش نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بے مقصد کمرے کی در و دیوار کو تک رہی ہے۔ جیسے اس کا مقصد محض وقت گزاری ہو اور پھر اس کے چہرے پر کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی جھجک۔ وہ اس کمرے میں ایک مرد کی موجودگی سے کوئی ڈر بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ کوئی دو ایک مرتبہ اس کی ساڑی کا پلو شانے اور سینے سے پھسلا تھا جو ایک مرد کے جذبات کو بھڑکا سکتا تھا۔ ایک مرد جو قوی

اور وجیہہ اور دراز قد بھی تھا اسے کسی ناگ کی طرح اس سکتا تھا۔ کوئی اور لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو اس پر ایک ان جانا سا خوف طاری ہو جاتا۔ اسے شاید مجھ پر اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ بے لباسی کی حالت میں بھی آجائے تو اس کی عزت پر آنچ نہیں آسکتی اور نہ ہی گھر کی تنہائی سے فائدہ اٹھاؤں گا۔

کمرے میں ہم دونوں کے درمیان ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے اس سکوت کو توڑنے کے خیال سے کہا۔

تم نے مجھے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ جلدی سے ساری بات بتاؤ تاکہ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچادوں؟"

اس وقت وہ کیلنڈر دیکھ رہی تھی جس میں فلمی اداکارہ کبوری کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے میری بات سن کر مجھے پلٹ کر تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جانے کس انجانے خیال سے سرخی دوڑ گئی۔ اس کی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں ایک ان جانا سا احساس ابھرنے لگا۔ اس کے ہونٹ دل کش انداز سے مسکرانے لگے اور کھل سے گئے۔ اس نے مسکراہٹ کو منجمد سا کر دیا۔ پھر جب وہ بولی اس کے لہجے میں خوف کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں تھا۔

"میں ابھی آپ کو سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر صبر کرلیں۔ میں ذرا اپنا لباس درست کر لوں۔"

اس نے میرے کچھ کہنے سے پیشتر ساڑی کا پلو سینے پر شانے سے ہٹایا اور چند ثانیوں میں ساڑی بدن سے اس طرح اتار دی جیسے کسی مرد کے ہاتھوں نے اتاری ہو۔

اب وہ صرف مختصر بے حد کھلے گریبان کے بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تھی۔ میں فوراً" دوسری طرف منہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔

اس کی اس بے باکی اور بے حجابی کی حرکت پر میرے دل میں نفرت اور غصے کی لہر اٹھی۔ گویا میرا اندازہ اس کے بارے میں درست ثابت ہوا تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جذبات میں کوئی ہل چل پیدا نہ ہوئی۔ اس کا بلاؤز جو مختصر ترین اور کھلے گریبان کا تھا آستینوں سے محروم اور اس کی گداز، سڈول اور مرمریں بانہیں خوب صورت سنگ مرمر کا پتھر لگ رہی تھیں۔ بلاؤز ایک دھجی ہی تھا۔ میں مٹی کا تودہ بن گیا اور اسے دیکھنے اور دبوچ کر بھنوؤں اور ہاتھوں سے کھیلنے کی ذرہ برابر بھی خواہش نہیں ہوئی۔ اسے دیکھنے کے بجائے کبوری کی تصویر دیکھنے لگا۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ اس پل میں نے اپنے کمرے کے باہر گلی میں بہت قدموں کا شور سنا۔ میں حیران ہوا کہ ان بدمعاشوں نے لڑکی کی موجودگی اور میرا ٹھکانا کیسے معلوم کرلیا؟ ان کی جرات اور دیدہ دلیری دیکھو کہ وہ اس لڑکی کو لے جانے کے لیے بلا خوف و خطر آرہے ہیں۔ یہ اغوا کرنے آگئے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو نیم عریاں حالت میں بھی دیکھ کر اس لیے اسے قابو میں کر کے بے بس نہیں کیا۔۔۔ عورت ایسی پرکشش اور دل کش ہوتی ہے کہ تنہائی میں اس کی ذرا سی بھی بے حجابی مرد کو پستی میں گرا دیتی ہے شاید میں نے اس لیے اس سے کھیلنے سے اپنے آپ کو باز رکھا تھا اسے بچانے کا عزم کیا ہو گا۔ کیا کروں! ان بدمعاشوں سے کیسے نمٹوں؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر مکوں کی مسلسل بارش ہونے لگی۔ میں نے پلٹ کر اس خیال سے لڑکی کی طرف دیکھا کہ اسے کہیں چھپادوں۔ لیکن وہ ذرا سا بھی خوف زدہ اور سراسیمہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں نے بدحواس ہو کر دروازے کے پاس جا کر مرتعش لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے۔۔۔؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ دروازہ کیوں پیٹا جارہا ہے؟"

"دروازہ کھولو۔" جواب میں تیز مگر ایک تیر آواز گونجی۔

یہ آواز ہاشم بیگ کی تھی وہ اسی محلے میں رہتے تھے اور ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر تھے۔ وہ جتنے سخت گیر تھے اتنے ہی با اصول بھی۔۔۔ محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ گو وہ ریٹائر ہو چکے تھے لیکن ان کا اب بھی اثر اور رعب

داب قائم تھا۔

میں ان کی آواز سن کر حیران ہوا اور سراسیمہ بھی ... اتنی رات گئے ان کا یہاں آنا خالی از علت نہیں تھا۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ جن کی آواز لحہ بہ لحہ جارحانہ انداز میں تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے سٹ پٹا کر دروازے سے نظریں ہٹا کر دیکھا تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بڑی بے نیازی سے کھڑی ہوئی تھی۔ دستک تھی کہ مسلسل ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہوئی تو دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ کسی نے شاید چیخ کر کہا بھی تھا کہ دروازہ توڑ دو۔ کس بات کی دیر ہو رہی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کیوں کہ مجھے دروازہ کھولنے کے علاوہ کوئی اور صورت دکھائی نہیں دی۔

سب سے پہلے میری نگاہ ہاشم بیگ پر پڑی۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ نفرت سے سکڑ گیا۔ ان کے ساتھ محلے کے ایک بزرگ اور دو اور آدمی بھی تھے جن کے چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے چہروں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ آنکھوں میں درندگی کی سرخی بھی تھی۔ وہ سب دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔

ان سب کی نظریں لڑکی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر لڑکی اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بے حجابانہ انداز سے کھڑی رہی۔ اس نے ناک پٹی کوٹ بستر پر بکھری پڑی ہوئی تھی۔ دیکھنے والا ہم دونوں کے بارے میں غلط رائے قائم کر سکتا تھا۔

ہاشم بیگ نے پلٹ کر ہم دونوں کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جو سوال تھے انہوں نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں رہی تھی کہ ان سے نظریں ملا سکوں۔ انہوں نے کسی قدر توقف کر کے پوچھا۔

"یہ کون لڑکی ہے؟ اس وقت تمہارے کمرے میں کیسے...؟"

میں نے انہیں اس لڑکی کے بارے میں بتانا چاہا لیکن الفاظ حلق میں پھنس گئے۔

میں نے کہتا بھی تو کہتا کیا...؟ لڑکی جس عالم کھڑی تھی اس نے میرے کردار کو ان کی نظروں مشکوک کر دیا تھا۔ بستر پر اس کی ساڑی بے ترتیبی پڑی تھی۔ جس وقت میں دروازہ کھولنے بڑھا تھا اس نے نہ صرف بستر کی چادر پر شکنیں ڈال دی تھ اور بلاؤز کو بھی بے ترتیب کر دیا تھا... اور پھرا رخساروں بانہوں گردن اور سینے کے ابھاروں کو سے نوچ نوچ سرخ کر دیا تھا۔ جیسے میں نے انہیں ہو۔ میں سکتے کے عالم میں گنگ سا کھڑا رہا۔ میرا بدن خشک ہو گیا تھا۔ اس کمینی نے مجھے ذلیل و کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

محلے کے بزرگ مجھے گم صم پا کر تیز نظروں گھورتے ہوئے سخت لہجے میں مخاطب ہوئے۔

"کیا آپ کو اس محلے میں یہ کمرا اس لیے کرا دیا گیا تھا کہ شریفوں کی طرح رہیں گے جب کہ نے اس بات کی ضمانت بھی دی تھی کہ اس محلے بہو' بیٹیاں اور جوان لڑکے رہتے ہیں... کیا آپ ذمے دار آدمی کو زیب دیتا ہے کہ بدکار عورتوں کو کر بستر کی زینت بنائیں... دل بہلائیں... اس شہ بہت سارے بورڈنگ اور ہوٹلز میں فحاشی کے اڈ قائم ہیں۔ وہاں جا کر منہ کالا کریں... آپ نے کس عزت کا کوئی خیال نہیں کیا۔"

یہ ایک ایسا الزام تھا جس پر میں تلملا کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے میرے سینے میں جیسے گرم گرم سا جھونک دی گئی ہو۔ نیکی کا صلہ مجھے ذلت اور رسوا صورت میں مل رہا تھا۔ جب میں اسے ڈاکٹر کے میں چھپا کر کھڑا ہوا تو وہ مجھ سے چمٹ گئی اور ہم آغ کی حالت میں کھڑے رہے۔ اس نے خود سپردگی چاہا تھا کہ میں بہک جاؤں۔ میں نے اپنے ہونٹوں ہاتھوں کو بہکنے سے سختی سے روکا۔ ورنہ زمین پ گھاس تھی اسے بستر بنا کر اپنے جذبات کا نشانہ بنا اسے تہس نہس کر دیتا۔ لیکن میری شرافت کا آئی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے مختصر ا

ں انہیں ساری کہانی سنا دی۔ ان لوگوں کے چہروں
ے یہ بات صاف عیاں تھی کہ انہیں میری اس کہانی
، ایک لفظ پر یقین نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ
بت حسین اور بے حد پرکشش اور نوجوان لڑکی تھی
ر اس سے دل بہلائے نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جس
ت میں تھی اس سے یہ سب محسوس کررہے تھے
، ہم دونوں جذبات کے طوفان کی زد سے گزر چکے
۔ ان کے تبصروں سے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے یہ
ٹی اور من گھڑت کہانی سنائی ہے۔ ان لوگوں نے
بنا لیے ہاشم بیگ پھر سے پولیس انسپکٹر بن گئے۔
ں نے مجھ سے بے رحمانہ لہجے اور سخت الفاظ میں
ح شروع کی۔ میں نے ان تمام سوالات کے جوابات
ے صبر اور تحمل سے دیے جو بڑے معقول تھے۔ پھر
انہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آیا۔ پھر انہوں
لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔
"سچ سچ بتاؤ... کیا یہ سارے واقعات سچ ہیں؟ تم
جھوٹ بولا تو حوالات میں بند کردوں گا؟"
"جی نہیں..." اس لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ
ی کہانی من گھڑت ہے۔ یہ صاف جھوٹ بول
ے ہیں۔ یہ صاحب مجھے پیسوں کے عوض لے کر
ے ہیں اور ہم دونوں جشن منا چکے ہیں۔ دوسرے
ں کی تیار ہو رہی تھی کہ آپ لوگ آگئے۔ میں اکثر
ں آتی رہتی ہوں۔"
یں لڑکی زبان سے ایسا سفید جھوٹ سن کر سناٹے
آگیا۔ دوسرے لمحے میری رگوں میں لہوا بلنے لگا۔
غضب ناک انداز میں لڑکی کی طرف جھپٹا کہ اس
دبوچ کر اس زہریلی عورت سے سچ بلواؤں لیکن
نے میرے تیور دیکھ کر ان لوگوں کے درمیان پناہ
ی۔ پھر بھی میں ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر
ے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ ہذیانی لہجے میں چیخ کر

آپ لوگ مجھے اس ظالم آدمی سے بچائیں...
یہ میری جان لے لے گا۔"
خبردار! جو آپ نے پھر اس لڑکی پر ہاتھ اٹھانے کی

کوشش کی۔" ان دو اجنبیوں میں سے ایک نے تیز
لہجے میں کہا۔
"یہ مکار... ذلیل... کمینی عورت سراسر
جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اسے مزا چکھا دینا چاہتا
ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس سے سچ اگلوانا
چاہتا ہوں۔"
"اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"
دوسرے اجنبی نے کہا۔ "اس کی اس بات کا اس لیے
یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ اس کمرے میں اکیلے
رہتے ہیں اور تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسی
صورت میں ایسی نوجوان لڑکی کو۔"
"میں ایک شریف آدمی ہوں۔ محلے میں کسی سے
بھی میرے کردار کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے؟"
میں نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ "میں
نے آج تک بھی کسی عورت لڑکی کو نظر اٹھا کر نہیں
دیکھا ہے۔ اس بات کی گواہی لڑکیاں عورتیں بھی دے
سکتی ہیں۔"
"آپ کیا ہیں؟ آپ کی سرگرمیاں کیا ہیں! آج
اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹ گیا۔" اس نے میری
بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ اس کا انداز استہزائی تھا۔
"آپ اس دو ٹکے کی عورت کی بات کو سچ مان رہے
ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔
میرے ساتھ وہی کچھ پیش آیا جو میں نہیں چاہتا تھا
اور میرے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ ہاشم
بیگ اور بزرگ صاحبان چوں کہ اس واقعہ کو ہر قیمت پر
دبانا چاہتے تھے اور محلے کی عزت کی خاطر کسی کے علم
میں لانا نہیں چاہتے تھے اس لیے سب سے پہلے اس
لڑکی کو کمرے سے نکال دیا گیا۔ چوں کہ رات کا وقت
تھا اس لیے اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچانے کے لیے وہ
دونوں اجنبی ساتھ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد
بزرگ اور ہاشم نے میرے کردار پر نشتر زنی کی۔ جی بھر
کے لعنت ملامت کی اور نشانہ بنایا گیا۔ میں اس واقعہ
میں اسی طرح ملوث ہو گیا تھا کہ کسی صورت میں
انہیں اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ اس لیے

اس عورت نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"تجرد کی زندگی گزارنے اور اس طرح برائی کی راہ پر چلنے سے بہتر ہے کہ آپ شادی کرلیں۔" ہاشم بیگ نے تجویز پیش کی۔

"میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے صاف صاف جواب دیا۔ "مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں۔ بہتر ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"وہ کس لیے...؟" ہاشم بیگ نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ "یہ ایک عزت سے زندگی گزارنے کا راستہ ہے۔"

"اس لیے کہ میری پنشن نہ ہونے کے برابر ہے اور اس میں صرف ایک آدمی ہی گزارہ کرسکتا ہے اور پھر میں کوئی ایک ماہ سے بے روزگار بھی ہوں۔ آج کل ملازمت کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ملازمت کب ملے! ایک مہینہ یا ایک برس بعد... اس صورت میں شادی کر لوں تو گھر کیسے چلا سکوں گا؟ گرانی اور مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں۔"

"آپ کی بات معقول ہے لیکن یہاں صرف ایک شرط پر رہ سکتے ہیں؟" ہاشم بیگ نے کہا۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کی شرط مان لوں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل آنکھیں بند کر کے سر جھکا کے تسلیم کرلوں۔

مجھے ایک تحریر لکھ کر دینا پڑی جس میں میں نے اپنی بدکاری کا اعتراف کیا اور اس بات کی ضمانت دی کہ آئندہ اس محلے میں ایک شریف آدمی کی طرح رہوں گا۔ اگر میں نے کوئی بدعہدی کی تو قانون کے حوالے کر کے محلے سے نکال دیا جاؤں گا۔ پھر کسی بھی محلے میں رہنے نہیں دیا جائے گا۔

ہاشم بیگ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اس واقعہ کا محلے میں کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا جائے گا لیکن مجھے اپنی تحریر کا پاس کرنا ہوگا۔ جب بھی میرا شادی کا ارادہ ہو تو میں اس کا تذکرہ ان سے کروں۔ کئی حسین نوجوان اور پرکشش لڑکیاں ہیں اور جہیز بھی خاطر خواہ ملے گا۔

میرے لیے نیلم چوہدری، ذکیہ خانم اور یہ فاحشہ جس کا نام نومی تھا میرے لیے منحوس اور زہریلی ثابت ہوئی تھیں۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اگر کسی دن میرا نومی سے سامنا ہو گیا تو اس کے ساتھ سودا کر کے کسی ہوٹل میں لے جا کر اس کا ساتھ ایسا سلوک کروں گا کہ وہ اسے زندگی بھر نہیں بھول سکے گی۔

ان لوگوں کے باہر نکلتے ہی میں دروازہ بند کر کے بستر کے پاس آیا تو مجھ میں اتنی ہمت اور سکت نہیں رہی تھی کھڑا رہ سکوں۔ کسی گرتی ہوئی دیوار کی طرح بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ جیسے کسی نادیدہ طاقت نے بلندیوں سے اٹھا کر پستی میں پھینک دیا ہو۔

میں کچھ دیر تک بستر پر ایسا بے سدھ اور نڈھال پڑا رہا اور پھر اپنی ساری طاقت جمع کر کے اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس ذلت اور رسوائی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ طرح طرح خیالوں کی یورش مجھے بیکل کیے دے رہی تھی۔ کتنی عجیب اور ناقابل فہم بات تھی کہ نیلم چوہدری مجھے جانے کیوں اپنے ہاں رات کے کھانے پر لے گئی۔ بھائی، بہن کے کسی کام سے گھر سے باہر جاتے ہی مجھ پہ فیاضی سے مہربان ہو گئی اور خود کو ہر طرح سے مجھے سرفراز کیا لیکن دوسرے دن مجھ پر چوری کا الزام عائد ہوا۔ نیلم چوہدری مجھ سے ایک زہریلی عورت کی طرح پیش آئی۔ میں ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اگر میں سابق فوجی نہ ہوتا تو جیل کی ہوا کھاتا... ذکیہ خانم بلیک بیوٹی نے مجھ پر ایسا جادو کیا تھا کہ ساری رات وہ مجھ سے کھلونے کی طرح کھیلتی اور ہر طرح سے ایسا خوش کیا کہ ایک عورت ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ رات بھر تین طوفانوں کے بعد وہ صبح کالی چڑیل لگی وہ میرا خون چوس لینا چاہتی تھی۔ ڈسنا چاہتی تھی کہ زہریلی ناگن کی طرح... وہ زہریلی عورت تھی۔ پھر میں اس کی طرف نہیں گیا۔ آج کا یہ واقعہ...

میں ایک مرتبہ پھر ذہنی طور پر الجھ گیا تھا۔ کیوں کہ یہ تیسرا واقعہ کسی قدر مختلف نوعیت کا تھا مگر ان واقعات میں مجھے ذلت اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ میرے

گلے میں جیسے پھندا پڑ گیا تھا۔ ذکیہ خانم بھی مجھ سے دلت کوئی کھیل کھیلنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ خیالوں کی یورش مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ اس پر قابو پانے کے لیے شراب اور شباب کی طلب ہو رہی تھی۔ اس شہر میں شراب خانے، قحبہ خانے، اسکول اور کالج کی طالبات، شادی شدہ عورتوں اور لڑکے بھی میسر آسکتے تھے۔ ہم جنس پرستی یہاں عام تھی۔

میرا دل اس شہر سے اچاٹ ہو گیا۔ قسمت نے میرے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ سارے واقعات کس لیے پیش آرہے ہیں؟ میں سوچتا اور دل مسوس کر رہ جاتا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ ایک ان جانا سا خوف کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈستا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے ایک ہفتے بعد دو تین جگہ سے انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔ ایک فرم نے اپنے طور پر مجھے کشمیر کی ملازمت کی پیش کش کی۔ چوں کہ میں نے توبہ کرلی تھی کہ آئندہ کبھی یہ ملازمت نہیں کروں گا اس لیے میں نے نہایت مودبانہ معذرت کرلی۔

میں چوتھے دن سندر بن جوٹ ملز میں سیکورٹی افسر کے عہدے کے لیے انٹرویو دینے پہنچا۔ انٹرویو بے حد کامیاب رہا اور تن خواہ میری توقع سے بڑھ کر تھی۔ اس کے علاوہ سہولتیں اور مراعات اتنی تھیں کہ جس میں اب میں اپنی خواب ناک زندگی گزار سکتا تھا۔ تیسرے دن اس کمپنی کی جانب سے مجھے تقرر نامہ وصول ہو گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

☆ ☆ ☆

سندر بن جوٹ ملز میں یہ میرا پہلا دن تھا۔ میں اپنا تقرر نامہ لے کر رسمی کاروائی کے طور پر ڈائریکٹر کے کمرے میں حاضری دینے پہنچا۔ ڈائریکٹر اس وقت ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے اور آواز میں خوف سا محسوس کیا۔ پھر اس کی آواز نہ صرف پست ہو رہی تھی بلکہ اس میں لرزش بھی تبدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے لگا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے بچا جیسے اسے دوسری طرف سے تشدد اور قتل کی دھمکیاں دی جا رہی ہوں۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہوتا چلا گیا۔ اسے حد درجہ خائف اور سراسیمگی حالت میں دیکھ کر مجھے کسی قدر حیرانی ہوئی اور اس پر بے حد ترس آیا۔ اس ڈائریکٹر نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ اور تقرر نامہ بھی اسی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ وہ بشرے سے برطانیک اور شریف آدمی لگتا تھا۔

جب اس نے اپنی گفتگو ختم کر کے ریسیور کریڈل پر رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ حالاں کہ کمرا ایئر کنڈیشنڈ تھا اور کمرے میں ایک خوش گوار سی خنکی پھیلی ہوئی تھی جو فرحت بن کر جسم میں رچ بس رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا ہوا ہو۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا اور آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی یہ حالت اور کیفیت فون پر شاید بات کرنے سے ہوئی تھی۔

میں اس کی یہ حالت دیکھ اس کے قریب گیا اور اس سے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"سر..... کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ آپ بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔ کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

ڈائریکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے خوف زدہ انداز سے اوپر سے نیچے تک اس طرح دیکھا جیسے میرے ہاتھ میں کوئی اسلحہ تو نہیں..... پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ پسینہ جو پھوٹ پڑا تھا کسی چشمے کی طرح اسے پونچھنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ دوبارہ کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں پستول کے بجائے بھاری بھرکم ہٹوا تھا۔ اس نے پانچ پانچ سو کے دو

نوٹ نکالے اور میری طرف بڑھا دیے۔ اس کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔ اس کی حالت بدستور غیر ہو رہی تھی۔

میں نے حیرت بھری نظروں سے ان نوٹوں کی طرف دیکھا اور سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"سر...! یہ کس لیے...؟ کیا آپ مجھے پیشگی رقم دے رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"تم اس رقم کو اپنی ایک دن کی تنخواہ سمجھ لو اور اسے رکھ لو۔" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"میں آپ سے تن خواہ لینے تو نہیں آیا سر...!" میں نے اس کی طرف متعجب نظروں سے دیکھا اور اس کے سامنے میز پر اپنا تقرر نامہ رکھ دیا۔ "میں آج ہی اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا ہوں۔ اب کیا حکم ہے میرے لیے؟" اس نے نوٹ میرے آگے ڈال دیے اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تم یہ رقم لے کر ابھی اور اسی وقت یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔" اس کا لہجہ ابھی تک خوف زدہ تھا۔ وہ کپکپا رہا تھا۔ "آئندہ یہاں بھول کر بھی مت آنا۔ اس لیے کہ تمہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ آئی ایم سوری... تمہیں بلاوجہ زحمت اٹھانا پڑی۔"

"مگر کیوں سر...!" میں نے متحیر زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا ہے؟"

اس کے چہرے کی زردی خشونت میں بدل گئی۔ اس نے لرزاں آواز میں بے مہری سے جواب دیا۔ "اس لیے کہ اب ہمیں تمہاری خدمات کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ہم نے دوسرا آدمی رکھ لیا ہے جسے دس برس کا تجربہ ہے۔ تم ناتجربہ کار ہو۔"

وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا... اس کا کھوکھلا اور سپاٹ لہجہ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ یک بارگی میرا دماغ بری طرح جھنجھلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میرے ساتھ ذلت آمیز سلوک کس لیے کیا جا رہا ہے؟ پس پردہ کیا محرکات ہیں؟

اس ایک ماہ کے عرصے میں میرے ساتھ جتنے بھی واقعات پیش آئے تھے ان میں میری اہانت کے پہلو پوشیدہ تھے... میں ہر جگہ رسوا ہوا تھا۔ میری ذات و وقار مجروح کیا جا رہا تھا۔ اس بات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں کوئی خطرناک جرائم پیشہ ہوں۔ قاتل اور درند صفت ہوں۔ میرے ساتھ اس قدر سنگین مذاق کر... کی کیا ضرورت تھی؟ اگر ملازمت نہیں دینا تھی تو صاف طور پر انکار کر دیا جاتا۔ تقرر نامہ ارسال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں خون کے گھونٹ پیتا رہا تھا۔ مجھے رقم کی نہیں ملازمت کی ضرورت تھی۔

میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ملازمت بہت شاندار تھی اور میرا مستقبل بنا سکتی تھی۔ میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"پلیز... سر...! مجھے صاف صاف بتائیں... آپ مجھے ملازمت دے کر انکار کیوں کر رہے ہیں؟"

"زیادہ بحث اور حجت کرنے کی ضرورت نہیں..." اس نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔ "بس یہ میرا حکم ہے۔"

"آخر کیوں...؟" میں وحشیانہ انداز میں چیخا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ "آپ کو بتانا ہو گا۔"

میری اس اچانک اور غیر متوقع حرکت پر وہ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے وہ ہکلایا۔ "تم... میں کچھ نہیں جانتا... بس ایک حکم ہے... میں اس کی تعمیل کر رہا ہوں۔"

"کس کا حکم ہے...؟" میرا سخت لہجہ کمرے میں دھماکے کی طرح گونجا۔ "تمہیں بتانا پڑے گا۔"

ایک پل کے ہزارویں حصے میں میرا ذہن نیلم چوہدری کی طرف گیا شاید اس کا حکم ہو؟ پھر ذکیہ خانم کا خیال آیا پھر ہاشم بیگ کا... لیکن ان میں سے کسی کو کیا معلوم کہ میں نے یہاں انٹرویو دیا ہے اور ملازمت پر رکھ لیا گیا ہوں۔ آج پہلا دن تھا اور ابھی تو ڈیوٹی دینے

نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں کچھ دنوں بعد یہ کاروائی ہوتی ہیں ان پر شک کرنے پر حق بجانب تھا۔ یہ زہریلی عورتیں تھیں۔

اس پر سراسیمگی طاری ہونے لگی ... اس نے سٹ پٹا کے دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میں کسی بھی قیمت پر کچھ نہیں بتا سکتا ... میں مجبور ہوں۔ تم مجھے پریشان مت کرو۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اس کے انکار نے مجھ پر جنون طاری کر دیا تھا۔ میری رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ میں نے بڑی سفاکی سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کے بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا ... تم اسے خالی خولی دھمکی یا گیدڑ بھبکی نہ سمجھنا۔"

اسے شاید توقع نہ تھی کہ میں اس کے ساتھ درندگی سے پیش آؤں گا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے ہزیانی لہجے میں کہا۔

"میری جان نہ لینا ... بتاتا ہوں ... میرا کالر چھوڑ دو ... میری سانس رک رہی ہے۔"

میں نے اس کے کالر پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میرے مقابلے میں وہ بہت کم زور اور ضعیف سا تھا۔ میں بے تابانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک لمبا سا سانس لیا اور پھر اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں اس شخص کو ذاتی طور پر نہیں جانتا ... تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس کا فون آیا تھا کہ میں تمہیں نوکری سے اس وقت برخاست کر دوں اور اس کے عوض تمہیں ایک کوڑی بھی نہ دوں۔ لیکن اس کے باوجود تمہیں ایک ہزار کی رقم ..." اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"جب تم اس شخص سے واقف نہیں ہو تو اس کے حکم کی تعمیل کیوں کر رہے ہو؟ اس سے ڈر کیوں رہے ہو؟ یہ بات میری سمجھ سے بالا تر ہے۔" میں نے اس کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے سے پسینہ پونچھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

"حکم عدولی کی صورت میں مجھے اپنی بیٹی کی عزت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس وقت وہ اس کے پاس یرغمال ہے۔ اس نے فون پر میری بیٹی کی آواز بھی سنائی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میں ان بدمعاشوں کی بات مان لوں۔" اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی اور آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ سچ بول رہا تھا۔ میں نے چکراتے ہوئے سوچا۔ آخر وہ کون شخص تھا۔ اسے مجھ سے کیا اور کس بات کی دشمنی تھی؟ گو میرے ذہن میں پہلے بھی ایک آدھ بار یہ خیال ابھرا تھا کہ پس پردہ کوئی میرا دشمن وجود ہے ... لیکن میں نے اسے اپنا واہمہ تصور کیا تھا۔ شبہے کی بظاہر کوئی بنیاد نہیں تھی۔ دشمنی صرف اس وقت اور اس سے کی جاتی ہے جب کسی کے پاس دولت ہو ... وراثت کا جھگڑا ہو یا کوئی ایسا عہدہ جو کسی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن رہا ہو۔ میرے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ پھر آخر میرا دشمن کہاں سے اور کیوں نکل آیا تھا۔

جب میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس سے ایک غیر ضروری اور بے مقصد سا سوال کیا۔

"اس نادیدہ شخص کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ کیا تم بتا سکتے ہو ...؟"

"یہ بات تم خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہو؟" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ "شاید تمہارے اس کی بیوی یا بہن کے ساتھ تعلقات رہے ہوں۔ آج کل ہمارے ہاں یہ کاروکاری حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔ شاید وہ اس

کا بدلہ لے رہے ہو۔۔۔ خدا کے لیے تم اب گھر جاؤ تاکہ میری پیاری اور نوجوان لڑکی یا عزت گھر آئے۔ اگر اس پر آنچ آگئی تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

☆ ☆ ☆

میں نے فوج کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ڈھاکا شہر میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ اس بڑے شہر میں ملازمت کرکے میں اپنی زندگی آسانی سے بسر کرسکوں گا۔ یہاں ملازمت کے بڑے مواقع تھے۔ کیوں کہ نجی دفاتر، کارخانوں اور فیکٹریوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ شہر بڑی تیزی سے ترقی کررہا تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد یہ شہر میں نہیں پورے دیش نے بڑی روز افزوں ترقی کی تھی۔ اس کا اندازہ نہ صرف بلند و بالا اور شان دار عمارتیں، نئی سڑکیں، کالونیاں، کاروں اور معیشت سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

میں ایک خاص وجہ سے اپنے گاؤں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ماں باپ فوت ہوچکے تھے۔ دنیا میں نہ تو میرے بہن بھائی تھے اور نہ ہی رشتہ دار۔۔۔ میں نے اپنا فنڈ اپنے ایک دوست کی بیٹی کی شادی پر خرچ کردیا تھا۔ میرے دوست نے ہندوستانی سرحد پر ایک جھڑپ میں میری جان بچائی تھی۔ وہ غریب اپنے ایک بازو سے محروم ہوگیا تھا۔ میں اس کا یہ احسان کیسے بھول سکتا تھا۔

ڈھاکا جیسے بڑے شہر میں ایک فوجی کے لیے زندگی گزارنا اس قدر آسان نہیں تھا جیسا کہ میں نے اپنے تئیں فرض کرلیا تھا۔ یہاں مکانوں کے کرائے بہت زیادہ اور عام آدمی کی دسترس سے باہر تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی اندرون دیش سے مرد ڈھاکا کو دبئی شہر سمجھ کر روزگار کے لیے روزانہ ہی ایک بڑی تعداد میں چلے آتے تھے جس کے باعث تیزی سے آبادی میں اضافہ ہورہا تھا اور مکانوں کی قلت بھی ہورہی تھی۔

مجھے قسمت سے بلکہ ہاشم بیگ کی وجہ اور فوجی ہونے کے ناتے یہ مکان جس میں ایک کمرا چھوٹا سا صحن، غسل خانہ، بیت الخلاء اور باورچی خانہ تھا۔ بہت کم کرائے پر مل گیا تھا اور پھر مہنگائی عفریت بن کر لرز براندام کیے دیتی تھی۔ میں نے گزر اوقات کے لیے اپنی ملازمت کا آغاز کیا لیکن اس ان جانے اور نادید دشمن کے ہاتھوں قدم قدم پر ذلیل و خوار ہوتا گیا۔

میں نے اس پراسرار دشمن کے بارے میں بہت سوچا کہ میری یادداشت میں کوئی ایسا مخلص ابھر نہیں سکا جسے میں اپنا دشمن تصور کرسکتا۔۔۔ فوج میں بھی میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اپنی رجمنٹ میں میری ہر دلعزیزی کا اعتراف کور کمانڈر بھی کیا کرتے تھے۔ میرے تمام ساتھی، ماتحت، اور افسران بھی مخلص اور بے لوث تھے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ وہ لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے اپنے گاؤں جا کر آباد ہوگئے تھے کہ وہاں کی زندگی گھر والوں کے ساتھ ہنسی خوشی اور سکھ سے گزار سکیں۔

مجھے بھی اپنا گاؤں بے حد یاد آتا تو دل میں ایک کسک سی ہوتی۔ وہاں جانے کی خواہش تڑپا دیتی۔ لیکن میں وہاں کس منہ سے جاتا اور زندگی گزارنے کے لیے کیا سبیل کرتا۔ زمین، مکان اور جائداد بھی نہیں رہی تھی۔ میں آخری مرتبہ سترہ اٹھارہ برس پیشتر اپنے گاؤں گیا تھا۔ اور انہی دنوں مجھ سے ایسی حرکت سرزد ہوگئی تھی جو میرے ضمیر کے لیے ہمیشہ کا بوجھ بن گئی تھی اور آج بھی وہ اتر نہ سکا تھا۔ ڈھاکا شہر میں میری کوئی خاص راہ و رسم کسی سے بھی نہ تھی۔ مجھے یہاں آئے تین ماہ اور کچھ دن گزرے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کم مدت میں کسی سے دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں اس قدر نفسا نفسی تھی کہ کوئی مفاد اور کسی غرض کے بغیر ملتا نہیں تھا۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا ان جانا دشمن کون ہے؟ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے! اس قدر مکار اور بزدل ہے کہ سامنے ان کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ وہ چھپ کر مجھ پر حملے کررہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے کسی طرح سامنا تو ہوجائے؟

☆ ☆ ☆

ابھی دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ الجھن دور ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی تھی۔

میں ان دنوں بے حد پریشان تھا۔ اس پریشانی نے ایک کرب ناک اذیت میں مبتلا کردیا تھا اس لیے میں پریشانی کے عالم میں گلیوں اور بازاروں میں نکل جاتا اور یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ نازک اندام نوجوان اور حسین لڑکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے دل اچاٹ ہوچکا تھا ہر چیز! گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس عرصے میں بیسیوں جگہ ملازمت کے حصول کے لیے درخواستیں ارسال کرچکا تھا لیکن کہیں سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا دشمن میرا میرے خلاف سرگرم عمل ہے۔ ایک روز ڈاکیے نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے آپ کہیں ملازمت نہیں کررہے ہیں۔ آپ کے نام چھ سات خطوط مختلف کمپنیوں سے آئے تھے۔ پھر بھی آپ نہیں گئے۔ میں نے ڈاکیے سے تو کچھ نہیں کہا اس لیے کہ وہ خطوط میرے ہاتھ نہیں لگ پائے تھے۔ اس کی وجہ میرے دشمن کی کارستانی تھی۔ یہ ان جانا دشمن ہی کرسکتا تھا اور اس نے کی تھی۔ دروازے پر لگے لیٹر بکس سے اس نے وہ خط نکال لیے تھے۔ ایک دن میں معمول کی طرح آوارہ گردی کرکے رات گھر لوٹا اور پھر کمرے میں روشنی کرتے ہی اچھل پڑا جیسے کسی نے میری پشت میں خنجر گھونپ دیا ہو اور میرے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اگر میں فوراً ہی کرسی کی پشت کا سہارا نہ لیتا تو گر پڑتا۔

میرے بستر پر خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ میں چاقو دستے تک پیوست تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً غش کھا کر گر پڑتا مگر میں نے حواس قابو میں رکھے چوں کہ میں ایک سپاہی تھا۔ سرحدی جھڑپوں میں بے شمار خون خرابے کے واقعات سے گزر چکا تھا۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنی رگوں میں دہشت کی لہر محسوس کی۔ میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ میں کتنے ہی لمحے تک بے حس و حرکت کھڑا لاش کو تکتا رہا اور اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔

لیکن اسے پہچانتا کیسے....؟ کیوں کہ لاش منہ کے بل پڑی۔ مقتول کا چہرہ ٹھیک سے نظر نہ آسکا۔ جس حد تک چہرہ نظر آیا تھا اس سے مجھے اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ کون ہے؟ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں تیر کی طرح لگا۔ یقیناً" یہ حرکت میرے ان جانے اور پر اسرار دشمنی کی تھی۔ اس نے مجھ پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ میری جان کا بچنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میرا سر چکرایا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

میں راہ فرار اختیار کرکے مزید مشکلات میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کب تک خود کو قانون سے بچا سکتا تھا؟ گو میں بے گناہ تھا اور قانون اندھا ضرور ہوتا ہے لیکن بے رحم اور غیر منصف نہیں ہوتا.... ہر صورت میں قانون پر بھروسا کرنا چاہیے۔

یہ سب کچھ ایک لمحے میں سوچ کر میری ہمت بندھی۔ میں اپنے حواس جمع کرکے آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھا۔ میں مقتول کی صورت دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے سیدھا کرنے میں دشواری درپیش تھی۔ چاقو اس کی پیٹھ میں اترا ہوا تھا۔ چاقو نکالے بغیر لاش کو کسی صورت میں سیدھا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا چاقو کا نکالنا ضروری تھا۔

میں پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں نے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دفعتاً" میری آنکھوں میں چکا چوند ہوگئی۔ ایک لحظہ کے لیے پورا کمرا تیز روشنی میں نہا گیا۔ میں نے گھبرا کر چاقو کے دستے سے ہاتھ ہٹالیا اور کئی ثانیوں تک حواس باختہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ اس لمحے اسی وقت باہر گلی میں کسی کے تیز دوڑنے کی آواز سنائی دی اور پھر سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔

میرے دشمن نے ایسی حالت میں میری تصویر اتاری تھی کہ اسے دیکھ کر ہر کوئی قاتل تسلیم کرلیتا۔ یہ ایک ایسا ٹھوس ثبوت تھا کہ کوئی اور میں خود بھی جھٹلا

نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ تصویر میرے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے سرعت سے کھڑکی کے پاس پہنچ کر باہر جھانکا۔ گلی کے آخری سرے پر ایک شخص بگٹٹ بھاگتا ہوا نظر آیا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا اور گلی میں اسی سمت اس کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔ چار سو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اندھا دھند بھاگتے ہوئے میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا اور اٹھ کھڑا ہوا اور چوٹ کی پروا کیے بغیر دوبارہ دوڑنے لگا۔ مجھے ہر قیمت پر اس شخص کو پکڑنا تھا تاکہ اس سے کیمرہ اور تصویر حاصل کر سکوں۔ وہ شخص بھی مجھے اپنے تعاقب میں دیکھ کر اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ پھر ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اس کے جوتوں کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار کم نہیں جلدی وہ موڑ طے کر لیا۔ میرے اور اس کے درمیان نصف فرلانگ سے کم رہا ہو گا۔ اچانک کسی اسکوٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ تقریباً" سو گز کے فاصلے پر روشنی پھیل گئی۔ میرا دشمن بھاگتا ہوا ایک اسکوٹر پر سوار ہوا جس پر پہلے ہی سے ایک شخص موجود تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسکوٹر فراٹے بھرتا ہوا میری مخالف سمت میں چلا گیا۔

میں اس کے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ کسی قدر بے بسی اور حسرت بھری نظروں سے اسکوٹر کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ بائیں ہاتھ کی ایک بغلی گلی میں مڑ کے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں کف افسوس ملتا رہ گیا۔

یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اسکوٹر پر پہلے سے موجود میرے دشمن کا ساتھی تھا اور اسکوٹر پر جیسے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ آخر اسے اتنی دور کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تو وہ میرے گھر کے قریب بھی اپنی ساتھی کا انتظار کر سکتا تھا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب واپس ہوا۔ فی الفور اس سے بھی سنگین اور خوف ناک مسئلہ میرے سامنے تھا جو مجھے تختہ دار تک پہنچا سکتا تھا۔ میرے کمرے میں ایک خون آلود لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں دنیا والوں اور قانون کی نظر میں قاتل بن چکا تھا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرانے لگتا۔ ہر چند کہ میں بے گناہ تھا۔ لیکن میری سنتا کون۔۔۔؟ میری بے گناہی پہ کسی کو کیسے یقین آسکتا اور اسے کس طرح یقین دلایا جا سکتا تھا۔ قدم قدم پر میرے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ میں انہیں کسی طور جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میرے سینے میں نفرت اور انتقام کی آگ دہکنے لگی۔ میں دکھ اور افسوس سے ہاتھ ملنے اور سر پیٹنے لگا۔ میرے دل کے گوشے میں کوئی چیز زہریلے کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ میں ایک سپاہی تھا۔ پڑوسی ملک سے نہ جانے کتنی مرتبہ سرحد جھڑپیں ہوتی تھیں۔ وہ ہم سے ہر لحاظ سے طاقت ور اور بہت بڑا ملک بھی تھا۔ اس کے باوجود بھی شکست کی ذلت نہیں اٹھائی تھی۔ دشمن کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ اسی لیے مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک سپاہی جب شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ لیکن اس وقت جو کیفیت طاری تھی وہ شاید کسی شکست خوردہ سپاہی پر بھی طاری نہیں ہوتی ہو گی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ اسے برداشت کر لیتا ہو گا۔

دشمن نے میرے وجود کو جیسے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ میں جس قدر سوچتا دل، دماغ اتنا ہی دکھتا۔ میں نے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر سر رکھ کر دونوں ہاتھ اس پر ٹکا دیے اور غم سے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دانستہ لاش کی جانب دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ نہ جانے میں کب تک اس عالم میں اس کشمکش سے دوچار ہوتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کب تک لاش سے نظریں چراتا رہوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اب مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہیے؟

بڑی دیر میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا پہلے بالائی منزل پر مقیم کرایہ داروں کو اس حادثے کی اطلاع دوں اور اس کے بعد ہاشم بیگ سے رجوع کروں۔ پھر تیسرا

مرحلہ پولیس کو رجوع کرنے کا تھا۔ اس مرحلے میں میرے ساتھ کیا ہونا تھا میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔ مجھ پر ایک قیامت پڑنے کا بھرپور امکان تھا۔ میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ یہ حقیقت پسندی کا تقاضا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے ایستادہ ہو کر دھڑکتے دل سے کمرے میں جھانکا۔ میرا دل اندر سے کٹ رہا تھا۔

جب بستر پر میری نظر پڑی تو میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

بستر خالی پڑا تھا۔ میں سرعت سے پلنگ کے قریب پہنچا بستر پر گہرے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر پر بے شمار شکنیں نظر آ رہی تھیں جیسے کسی جوڑے نے مستیاں کی ہوں۔ ان کے نشاط انگیز لمحات کی کہانیاں سنا رہی تھیں مگر اس پر خون کا ایک دھبا تک نہ تھا۔ حیرت کے اس جھٹکے نے مجھے بدحواس کر دیا تھا۔ یہ واقعہ جتنا پراسرار تھا اتنا ہی خوف ناک اور ناقابل فہم بھی؟ عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ میں دھم سے بستر پر اس طرح گر پڑا جیسے کسی نادیدہ طاقت نے مجھے اٹھا کر پھینک دیا ہو اور میں کافی دیر تک بے جان لاش کی مانند بے حس و حرکت لیٹا رہا مگر میرا ذہن سوچ کے گہرے سمندر میں غرق رہا۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن کے گوشوں سے دھند چھٹنے لگی۔ مجھے اپنے نادیدہ دشمن سے شدید نفرت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود میں دل میں اس کی ذہانت پر اش اش کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ اسکوٹر کس لیے نصف میل کے فاصلے پر کھڑا کیا گیا تھا؟ واضح طور پر دشمن کا مقصد یہی تھا کہ جب میں اس کے تعاقب میں جاؤں تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لاش گدھے کے سینگ کی طرح غائب کر دی جائے۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال سر سرایا۔ ممکن ہے سرے سے کوئی لاش نہ ہو بلکہ اس سارے ڈرامے میں ایک جیتے جاگتے شخص نے لاش کا کردار ادا کیا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت میرے بستر پر گہرے سرخ رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی۔ یقینی طور پر دشمن کا مقصد یہی رہا ہو گا کہ خون کے دھبے میری چادر پر لگنے نہ پائیں۔۔۔ آہستہ آہستہ میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا۔ اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے کسی پرندے کا خون اور اسپرنگ والا چاقو استعمال کیا گیا تھا جس کا پھل دباؤ پڑنے سے دستے میں چلا جاتا تھا۔

میں کافی دیر بستر پر کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا کہ آخر میرے دشمن کا منصوبہ کیا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔۔۔؟ وہ کس لیے میرے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے اور اتنی جدوجہد اور کوشش بھی کر رہا ہے؟ اگر اسے مجھ سے واقعی دشمنی ہے تو کھل کر سامنے کیوں نہیں آتا ہے؟ ایک شبہ میرے ذہن میں یہ بھی پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی غیر ملکی ایجنٹ فوجی راز حاصل کرنے کے چکر میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہو مگر میں نے یہ خیال ذہن سے اس لیے جھٹک دیا کہ آج کل ہی نہیں بلکہ ماضی میں نوجوان، حسین اور پرشباب لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا ہے اس مقصد سے۔۔۔ دوسری بات یہ تھی کہ فوج کے ایک معمولی افسر کی حیثیت سے میں بھلا اسے کیا راز فراہم کر سکتا ہوں۔۔۔ اگر اس نے مجھ سے ایسی کوئی توقع وابستہ کر رکھی ہے تو یہ سراسر اس کی خلل دماغی کا ثبوت تھا۔ ظاہر ہے ایک سبک دوش فوجی اس کے لیے کسی طرح بھی کارآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنا وقت اور محنت ضائع کی تھی۔ اس نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

انہی خیالوں میں الجھتے الجھتے نہ جانے مجھے کس وقت نیند آ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ وقفے وقفے سے دستک دے رہا تھا۔ دستک میں بڑی شائستگی کا انداز تھا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کی راہ سے

سورج نظر آیا تو احساس ہوا کہ دن خاصا چڑھ آیا ہے۔ میں نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں ہڑبڑا کے بستر سے نکلا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا کہ کون ہو سکتا ہے؟ کبھی بھی کسی نے دروازے پر کسی بھی وقت دستک دینے نہیں آیا تھا۔ میں نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا۔

لحظہ بھر کے لیے میری آنکھوں میں روشنیاں ہی روشنیاں اتر آئیں۔

میری نظروں کے سامنے ایک ایسی نوجوان اور دل کش لڑکی کا سراپا لہرا رہا تھا جو سپنوں میں نظر آتی ہے اور جسے سپنوں کی رانی کہا جاتا ہے۔ سفید براق ساڑی اور سفید بلاؤز نے اس کی سانولی رنگت کو نکھار کو مزید فروزاں کر دیا تھا۔ وہ اس سفید لباس میں لپٹی ہوئی تراشیدہ مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی حسین گہری سیاہ آنکھوں میں مسکراہٹ برقی قمقموں کی طرح جگ مگا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے دل کش اور پر شکوہ سراپا میں ارتعاش پیدا ہوا قیامت برپا ہو گئی۔ اس نے اپنی سحر زدہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ جب وہ بولی تو ایسا لگا کہ فضا میں چاروں طرف جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔

کیا آپ کیپٹن سراج کبیر ہیں....؟" اس نے اپنی لامبی لامبی سرنگیں پلکیں جھپکائیں۔

میں اس حسین اور نوجوان لڑکی کی زبان سے اپنا نام سن کر اک دم چونک گیا اور میرے سارے بدن پر میٹھی سنسنی دوڑ گئی۔

میں نے متعجب ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ دشمن نے شاید مجھے پھانسنے کے لیے کوئی نیا جال بچھایا ہے اور اس نے بساط کا مہرہ استعمال کیا ہے۔ وہ مجھے شکنجے میں جکڑ لینا چاہتا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رات کے سنگین حادثے نے مجھے اس قدر بے بس کر دیا تھا.... دشمن مجھے کسی بھی وقت قانون کے حوالے کر کے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ میری حالت ایک معذور اور اپاہج سے بھی بدتر تھی۔ میں فرار ہو کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے بھی کہ دشمن نے مجھ پر نگاہ رکھی ہوئی تھی اور اس کے آدمی شاید مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

اور اب صبح ہوتے ہی ایک اور مصیبت میرے گھر کی دہلیز پر کھڑی ہوئی تھی جو کسی بلا سے کم نہیں تھی۔ میرے سینے میں دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے لڑکی کو کون سا جال دے کر مجھے پھانسنے کے لیے بھیجا تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں....؟" لڑکی نے بڑے نفیس لب و لہجے میں پوچھا۔

لڑکی بظاہر شائستہ اور مہذب دکھائی دے رہی تھی۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ سیدھی سادی اور خوش مزاج لگ رہی تھی۔ وہ طرح دار، بے باک اور بے حجاب لڑکیوں سے یکسر مختلف دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ذات سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چہرے پر نہ صرف بلا کی معصومیت بلکہ سنجیدگی بھی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا لباس بھی مناسب تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اجازت دینا کسی ان جانے خطرے کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔ عورت اور زہریلی ناگن کا کیا بھروسا....؟ کب ڈس لے....؟ کمرے میں گھستے ہی اپنا لباس اور زیر جامے نکال کر پھینک دے اور ہم آغوش ہو کر باہم پیوست ہو جائے۔ اس وقت میں صرف بنیان اور لنگی میں تھا۔ غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے ہوں اور دشمنی اپنا وار کر دے.... اور پھر میں ہاشم بیگ سے نہ صرف زبانی بلکہ تحریری معاہدہ بھی کیا ہوا تھا کہ آئندہ کسی عورت کو وہ میرے ہاں نہیں دیکھیں گے۔ رات کا وقت نہیں تھا۔ دن دہاڑے میرے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ موصوف اسے دیکھ لیتے تو یقیناً" میری شامت آجاتی۔ میں ایک عجیب سی کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ اسے اندر نہ آنے دینا بد تہذیبی بھی تھا۔ اگر وہ کوئی فاحشہ ہوتی تو دن دہاڑے نہ آتی۔

لڑکی نے کچھ لمحے میرے جواب کا انتظار کیا۔ اس نے مجھے متذبذب دیکھ کر شاید یہ محسوس کر لیا تھا کہ میں اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دے رہا ہوں۔ وہ میرے قریب سے ہوتی ہوئی کمرے میں گھس گئی تو اس میں بڑی بے نیازی سی تھی۔ میں مرتا نہ کیا کرتا اسے دھکے دے کر نکالنے سے رہا۔ ایک پل کے ہزارویں حصے میں ایک پراگندہ سا خیال آیا کہ یہ دشمن کا مہرہ ہے۔ کیوں نہ میں اسے بے لباس کر کے اس کی دوشیزگی کو درندگی سے پامال کر دوں۔ کلی سے پھول اور لڑکی سے عورت بنا کر دشمن کو تحفہ دوں لیکن اس زہریلے خیال کو جھٹک دیا۔

میں نے دروازہ اس قدر کھلا رکھا کہ ہاشم بیگ اتفاقیہ آنکلیں تو انہیں کوئی شک نہ ہو لیکن وہ لڑکی پارسا ہی کیوں نہ ہو؟ آخر وہ ایک نوجوان، حسین اور دل برا دینے والی لڑکی تھی۔ ہاشم بیگ کو شک ہو سکتا تھا۔ بد اچھا بدنام برا..... والی بات تھی اور پھر وہ نوجوان لڑکی ذات تھی تنہائی میں مرد کیا زاہد بھی بہک سکتا تھا۔ اس لڑکی نے بے باکی سے کمرے میں گھس کر مجھے جیسے تنور میں ڈال دیا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے ریشمی لامبے لامبے سیاہ بالوں کی مہک اور اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو میرے مشام جاں کو عنبریں کر گئی..... میرے سارے وجود میں عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں۔ مجھے بے اختیار گاؤں کے بھولے بسرے سہانے دن یاد آ گئے۔ میرے سینے میں خوابیدہ تمنائیں مچلنے لگیں۔

میرا کمرا قدرے بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی کو کہاں بٹھاؤں یا پھر اسے رخصت کر دوں۔ اسے آغوش میں لے کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دوں۔ اس کی موہنی صورت اور جسم کو سرخ کر دوں۔ میرے کمرے میں جو کرسی تھی وہ ہرگز اس کے لائق نہیں تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بغیر کسی تکلف اور جھجک کے اطمینان سے کرسی کھینچ کر اس طرح سراپا سمیٹ کر بیٹھ گئی جیسے وہ شاہی تخت ہو۔

"مجھے نیلو فر کہتے ہیں۔" وہ میری گھبراہٹ اور سراسیمگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرائی اور پھر اس نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "پلیز..... آپ بیٹھ جائیے نا..... آپ کا اس طرح کھڑے رہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اگر آپ نہیں بیٹھیں گے تو میں بھی کھڑی ہو جاؤں گی۔"

"آپ کا نام آپ کی طرح خوب صورت ہے۔" میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔ "کیا میں آپ کی تشریف آوری کی زحمت کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟"

"میں آپ کے لیے پیغام لائی ہوں۔" وہ حیا آلود ہو کر بولی۔ جانے اس کے حسن کو ایسا نکھار دیا تھا کہ دل اسے ہونٹوں میں جذب کرنے کو چاہا۔

"کیسا پیغام.....؟" میں نے اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے پوچھا۔

"ایک منٹ صبر کیجئے۔" وہ اپنا سیاہ چرمی پرس گود میں رکھ کر اسے کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

اس کے قیامت خیز سراپا سے اٹھنے والی خوشبو نے پورا کمرا مہکا دیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ دو قدم کا بھی نہیں تھا۔ میں منجمد سا ہو کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے دل میں سوچا وہ جو پیغام لے کر آئی ہے کیا اس کی طرح خوب صورت ہو گا؟

اس نے چند لمحات کی تلاش کے بعد پرس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کے خوب صورت، نازک اور سڈول ہاتھ سے پرزہ لے کر دھڑکتے دل کے ساتھ ایک نظر ڈالی تھی۔ پرزے پر کسی شخص کا نام کوئی پیغام نہیں تھا۔ البتہ پرزے پر ایک گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ یہ کیسا پیغام ہے؟ میں نے سوچا اور پرزہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیا یہ آپ کے گھر کا پتا ہے؟ لیکن اس پر کوئی پیغام نہیں ہے اور نہ مکین کا نام درج ہے؟"

"جی ہاں یہ پتا ہے۔" وہ اپنا خوش نما سر ہلا کر بولی۔"

''یہ پتا مشتاق احمد خان کا ہے۔ انہوں نے آپ آج شام پانچ بجے چائے پر مدعو کیا ہے۔ آپ وقت کی پابندی کریں۔ وہ آپ کے منتظر ہوں گے۔''

''یہ مشتاق احمد خان کون ہیں؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''کیا آپ انہیں نہیں جانتے۔۔۔؟'' اس نے شدید حیرانی سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''حیرت کی بات ہے۔ انہیں کون نہیں جانتا۔''

''جی نہیں۔'' میں نے نفی کے انداز سے سر ہلا دیا۔ ''میں ان کا نام پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔''

''وہ بنگلہ دیش کے بڑے مصروف تاجروں میں سے ایک ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ان کا بڑا شہرہ ہے اور وہ ارب پتی ہیں۔''

''ہوں گے۔'' میں نے بڑی بے نیازی سے شانے اچکائے میں ایک فوجی آدمی ہوں۔ مجھے ارب پتیوں اور تاجروں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ بتائیں کہ وہ ایک عام اور غیر معروف آدمی سے کیوں اور کس لیے ملنا چاہتے ہیں؟''

''ملازمت کے سلسلے میں۔۔۔'' وہ متبسم ہو کر بولی اور اس کا چہرہ دمک سا گیا۔

''ملازمت۔۔۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''لیکن میں نے انہیں کوئی درخواست تو نہیں بھیجی؟''

''آپ اپنے دماغ پر زور دے کر سوچیں۔'' وہ مترنم لہجے میں کہنے لگی۔ ''ایسٹ ویسٹ انٹرنیشنل کمپنی کی جانب سے آپ کو متعدد خطوط لکھے گئے اس میں آپ کا تقرر نامہ بھی شامل تھا۔ جب آپ نے ایک مرتبہ بھی رجوع نہیں کیا تو کمپنی اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید وہ خطوط آپ کو نہیں ملے۔ تب مجھ سے کہا گیا آپ سے رابطہ کروں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔''

مجھے واقعی کوئی خط کسی بھی کمپنی کا موصول نہیں ہوا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ کیوں کہ بڑی اور معتبر کمپنیاں سابق فوجیوں کو ملازمت مختص کرتی تھیں اور عام لوگوں پر اس لیے فوقیت دیتی تھیں کہ فوجی ان کے مقابلے میں زیادہ چاق و چوبند ہوتے ہیں۔

پھر میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ میری راہ میں جو رکاوٹیں ڈال رہا ہے وہ شخص میری درخواستوں کا جواب غائب کرتا اور اڑاتا رہا تھا کہ ملازمت سے محروم ہو کر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاؤں۔ اس طرح وہ اپنے جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا مجھ میں دلچسپی لینا بھی کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پس پردہ کوئی بات تھی جو میرے دماغ میں بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اس کمپنی نے ایک ملازم لڑکی کو خصوصی طور پر بھیجا تھا جب کہ میں کوئی لاٹ صاحب نہیں تھا جس کا ملازمت کرنا نہایت اہم تھا۔ اس لیے میں نے استہزائیہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کیا اتنی بڑی فرم میرے انتظار میں سوکھ رہی ہے۔۔۔ مس نیلوفر۔۔۔!''

''لڑکی میرے لہجے کی گرمی اور طنز کو محسوس کر کے بڑے زور سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی شخص نے اس کی ہنسی یقیناً ضرور سنی ہوگی۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے تھے۔ اس نے کنکناتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''انہیں فوجی افسروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے وہ اپنی فرم میں زیادہ سے زیادہ فوجیوں کو موقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ فوجی ملازمت کے دوران ریٹائرمنٹ کے بعد قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں اس لیے میرے باس نے آپ کے کوائف کو دیکھ کر آپ میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے اور مجھے رابطہ کرنے بھیجا ہے۔''

''وجہ۔۔۔؟'' میں نے قدرے شوخی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا بردکھاوے کے لیے بلایا ہے؟''

اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی بکھر گئی۔ چہرے پر ایک عجیب سا نکھار آ گیا اور آنکھوں میں سینکڑوں دیے جل اٹھے تھے۔ عورت کے کیسے کیسے دلاویز روپ ہوتے ہیں اور کتنی سندر ہوتی ہے یہ لڑکیاں۔۔۔

پھر اس نے بڑے شگفتہ رساں لہجے میں جواب دیا۔

"اس لیے کہ فوجی ایک سویلین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمے داری، مستعدی اور فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وقت کی پابندی کرتے ہیں اور با اصول بھی ہوتے ہیں۔ ہماری فرم میں زیادہ تر سبکدوش فوجی ملازمت کر رہے ہیں۔ کیوں کہ میرے باس ڈسپلن کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے دفتر میں فوجی ملازمین کی اکثریت ہے۔"

"یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ کے باس نے مجھے دفتر کے بجائے اپنی قیام گاہ پر کیوں طلب کیا ہے؟" میں نے مشکوک لہجے میں دریافت کیا۔

لڑکی کے چہرے پر معصومیت بکھر گئی۔ اس نے قدرے تذبذب اور سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے ان سے اس کی وجہ دریافت نہیں کی صرف ان کے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں آج شام ٹھیک وقت پر پہنچ رہا ہوں انہیں بتا دیجئے گا۔"

میں بادل ناخواستہ شام ٹھیک پانچ بجے اس پتے پر پہنچا۔۔۔ دن میں کتنی بار میرے اس شبہے کو تقویت ملی تھی کہ کہیں یہ بھی اس انجانے دشمن کی کوئی گہری چال نہ ہو۔۔۔ اس لیے اس نے مجھے دفتر کے بجائے اپنی قیام گاہ پر بلایا ہے۔

دشمن سے ملنے کے اشتیاق اور حسرت نے میرا خوف کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر دشمن نے مجھے اپنے کسی جال پھنسانے کی کوشش کی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اس سے دو دو ہاتھ کرنے گیا تھا۔ اب میرے نزدیک یہی صورت رہ گئی تھی۔

مشتاق احمد خان کی وسیع و عریض پر شکوہ کوٹھی کسی محل کی طرح دکھائی دی۔ چند لمحات بعد میں ملاقاتی کمرے میں اس شخص کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں مشتاق احمد خان کا جو خاکہ تشکیل دیا ہوا تھا وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔

اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہی ہوگی۔ تاہم اس کے چھریرے بدن سے اس کی صحیح عمر کا پتا لگانا بہت مشکل تھا۔ کیوں کہ سر پر بال بھی سفید نہیں تھے۔ بظاہر وہ مضبوط اور تندرست اور توانا نظر آتا تھا۔ اس کی گول گول آنکھوں سے عقاب کی سی تیزی و تندی جھلک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی اعلیٰ فوجی افسر کی سی سختی اور سرد مہری چھائی ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت ایک رعب اور دبدبہ تھا لیکن میں اس سے ذرا برابر متاثر نہیں ہوا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ضرور مرعوب ہو جاتا۔

اس نے بغیر کسی تمہید اور گھما پھرا کے بات کرنے کی بجائے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم ایسی ملازمت کرنا پسند کرو گے جو عام ملازمت سے یکسر مختلف ہے۔"

"میں ملازمت کی نوعیت معلوم کیے بغیر اپنی پسند بتا نہیں سکتا۔" میں نے حتی الامکان درشتی سے جواب دیا۔

اس نے اپنا سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں یک لخت چمک سی ابھری۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں اس ملازمت کے بارے میں قدرے تفصیل سے بتاؤں گا۔۔۔ یہ ملازمت مختصر یا لمبے عرصے کے لیے بھی ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا انحصار تمہاری اپنی ذات پر ہے۔۔۔ تم چاہو تو اسے ایک ہی دن میں نمٹا دو یا مہینوں لگا دو۔ اس کا معاوضہ تمہارے خواب و خیال سے زیادہ ہوگا جو تمہارے سارے دلدر دور کر دے گا۔"

"یہ کوئی مشن ہے؟" میں نے چونک کر استفسار کیا۔

"اسے ایک طرح سے مشن ہی سمجھو۔" وہ کاروباری لہجے میں بولا۔

"آپ مجھ سے کس قسم کی خدمات لینا چاہتے ہیں بہتر ہے کہ اس کی وضاحت کر دیں اور اندھیرے میں نہ رکھیں۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"میں پہلے تمہیں اس کام کا معاوضہ بتا دینا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات اور تاثرات سے عاری تھا۔ "تاکہ اس کی روشنی میں تمہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو اور فیصلہ کرنے میں تذبذب اور ہچکچاہٹ نہ ہو۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔۔۔" میں نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ مجھے اس کی بات سے خوشی ہوئی۔

"دو لاکھ ٹاکا۔۔۔ بنگلہ دیش کرنسی میں۔۔۔!" اس نے قدرے بے پروائی سے کہا۔ "ایک لاکھ ٹاکا پیشگی آج بلکہ ابھی اسی وقت ادا کر دیے جائیں گے۔۔۔ باقی رقم مشن کی تکمیل کے بعد۔۔۔!"

"دو لاکھ ٹاکا۔۔۔" میں اپنی جگہ چونک پڑا۔ میرے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ یہ رقم میرے لیے بہت بڑی تھی۔ میں اس کے حصول کا خوابوں میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک شخص اتنی بڑی رقم کی ادائیگی میں کوئی پس و پیش، تذبذب اور جھجک محسوس نہیں کر رہا تھا۔ چوں کہ وہ ایک ارب پتی شخص تھا اس کے لیے یہ رقم کوڑی تھی۔

دوسرے لمحے وہ کسی خیال کے زیر اثر سنبھل گیا۔ میں نے اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا اور اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "اس کے عوض مجھے کیا کرنا ہوگا؟ آپ یہ تو بتائیں گے نا؟"

اس کے سپاٹ چہرے پر کسی سفاک قاتل کی سی درندگی ابھر آئی۔ اس نے اپنے جبڑے سختی سے بھینچ لیے۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

"تمہیں ایک عورت کو قتل کرنا ہے جس کا معاوضہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔"

"قتل۔۔۔؟" میں حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہو گیا۔ میرے جسم میں سن سناہٹ بجلی کی طرح دوڑنے لگی۔

"مگر آپ ایک عورت کو میرے ہاتھوں کیوں قتل کروانا چاہتے ہیں؟" میں نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ میں نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

"کیا تمہارے نزدیک کسی شخص کو قتل کرنا مشکل ہے؟" اس نے سرد سفاک لہجے میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔۔۔!" میں نے فوراً ہی اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک فوجی ہوں۔ کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہوں۔ جو بے گناہوں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگتا ہے۔"

اس کا منہ اس طرح بن گیا جیسے اس کے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو۔ پھر وہ ملامت کے انداز میں بولا۔

"کیا تم نے میدان جنگ میں بے گناہوں کو قتل نہیں کیا ہوگا؟ تمہارے ہاتھ خون آلود نہیں ہیں؟"

اس کے جواب نے میرے تن بدن میں آگ بھر دی۔ میں نے غصہ ضبط اور اپنے آپ پر قابو پانا چاہا لیکن میرے لہجے کی تلخی چھپی نہ رہ سکی۔ میں نے ایک دم بھڑک کر جذباتی لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کو دونوں کے فرق کا علم نہیں ہے تو براہ کرم ایک فوجی کے سامنے اپنی زبان کو لگام دیں۔۔۔ فوجی وطن کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی بقا جان سے کہیں عزیز ہوتی ہے۔۔۔ وطن عزیز کی خاطر دشمن تو کیا اگر بیٹا بھی غدار بن جائے تو اسے قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔۔۔ اسے صرف اور صرف وطن کا مفاد عزیز ہوتا ہے جب کہ ایک اجرتی قاتل محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرتا ہے وہ درندہ صفت ہوتا ہے۔ کیا آپ ان دونوں میں کوئی تمیز نہیں کر پاتے ہیں؟"

میری بات اور میرے اس زہرناک لہجے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کسی قدر خاموشی اور تحمل سے میری باتوں کو سنا اور پھر نہایت پرسکون انداز میں کہا۔

"وہ عورت بھی سفاک اور وحشی ہے۔ اس نے گاڑی والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ تم اسے قتل کر کے گاؤں کے ہزاروں باشندوں پر احسان عظیم کرو گے۔ یہ ایک نیک کام اور انسانیت کی خدمت ہے۔"

"مگر گاؤں والے قانون کا سہارا کیوں نہیں لیتے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ایک عورت سے اس قدر

خائف کیوں ہیں؟"

"وہ عورت نہ صرف بے حد دولت مند بلکہ اس قدر اثر و رسوخ رکھتی ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" اس نے کہا۔ "میں اس کے متعلق یہ بھی سنا ہے کہ وہ خون کرنے کے باوجود قانون کے آہنی ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا ہے۔"

"تو پھر یہ نیک فریضہ کوئی پیشہ ور قاتل ہی انجام دے سکتا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیوں نہ آپ اس کی خدمات حاصل کر لیتے؟" اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں اور پیشانی پر ان گنت شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"وہ خطرناک ترین پیشہ ور قاتلوں کو بھاری معاوضہ دے کر اس مشن پر روانہ کیا گیا تھا مگر آج تک ان کا نام و نشان نہیں مل سکا۔ اب لگتا ہے کہ انہیں قتل کر کے ان کی لاشوں کو سمندر برد کر دیا گیا اور وہ مچھلیوں کی خوراک بن گئے۔"

کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی ایک برس ہوا ہو گا۔" مشتاق احمد خان نے بتایا۔

"سنئے جناب!" میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے تقریر کے انداز میں کہا۔ "میں ایک ریٹائر فوجی افسر ہوں اور اپنی بقیہ زندگی آرام و سکون، آزادی اور اطمینان سے گزارنا چاہتا ہوں نہ کہ جرائم پیشہ بن کر۔ میں محض دولت کی خاطر کانٹوں پر کس طرح چل سکتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ دولت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو راس آتی ہے۔ شاید آپ بھی اس خیال سے اتفاق کریں گے؟" مشتاق احمد خان کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے بڑے تکبرانہ انداز سے کہا۔

"یہ ساری کتابی باتیں ہیں جو فلموں اور ڈراموں میں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور دل کو لگتی ہیں لیکن عملی اور حقیقی زندگی میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ دولت کے بغیر زندگی میں کوئی حسن اور آسودگی نہیں ہے۔ اس کے بغیر ہر شخص معذور اور اپاہج ہے بلکہ اپاہج سے بھی بدتر۔ محتاجی کی زندگی سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہے۔ یہ جذباتی باتیں رہنے دو اور حقیقت پسند بن جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اپاہج بن کر اور بھیک مانگ کر زندگی گزارنا پسند ہے لیکن مجرم بن کر نہیں۔"

"پلیز...! ایک منٹ کے لیے رکو اور میری بات ذرا غور اور دھیان سے سنو۔" اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "تم نے یہ فیصلہ کرنے میں جذبات اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ میں تمہیں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے دو تین کی مہلت دے سکتا ہوں تاکہ ٹھنڈے دل سے فیصلہ کر سکو۔"

"میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں اور آخری دم تک رہوں گا۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "تین دن کیا تین ہفتے بعد بھی میرا یہی فیصلہ ہو گا۔"

"سنو برخوردار...!" اس کے لہجے کا طنز میرے لیے زہر بن گیا۔ "تم اس وقت بھی میری مٹھی اور میرے رحم و کرم پر ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو...؟ میں تمہاری زندگی کا ایک دن ہی نہیں بلکہ ایک ایک لمحہ عذاب بنا کر رکھ دوں گا۔ تمہیں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکے گی... قانون کی نظروں میں تمہارا کردار داغ دار ہے۔ تم ایک مجرم اور قاتل ہو۔ میں تمہیں اب بھی چاہوں تو پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتا ہوں۔" میں ایک لمحے کے لیے بدحواس اور خوف زدہ ہو گیا... تو کیا یہی ہے میرا نادیدہ دشمن ہے؟ میں نے دل میں سوچا یا پھر یہ شخص مجھے گیدڑ بھبکیاں دے رہا ہے؟ میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم چاہو تو میری آزمائش کر لو... میں تمہاری ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

وہ معنی خیز زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کمرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھا جہاں ایک بڑی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میز کی ایک دراز سے ایک لفافہ نکال کر میرے سامنے ڈال دیا۔

"اسے دیکھ لو... پھر شاید تمہیں فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری اور پس و پیش اور تذبذب نہ ہو؟"

میں نے کسی قدر متعجب ہو کر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ اس میں میری موت کا پروانہ رکھا ہوا تھا۔ اس لفافے میں ان دونوں اعتراف ناموں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں موجود تھیں جو بلاوجہ میری زندگی کا بدنما داغ بن گئی تھیں۔

تیسری چیز وہ تصویر تھی جو مجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی تھی... تصویر اتارنے والے نے واقعی اپنی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے مجھے نہایت بے دردی سے ایک شخص کی پیٹھ میں چاقو گھونپتے دکھایا گیا تھا... اس تصویر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی میرے قاتل ہونے میں تامل کر سکتا تھا۔ تصویر جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی... تم قاتل ہو... تم قاتل ہو...

میرے پورے بدن میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اس کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تم وہی شخص ہو جس نے قدم قدم پر مجھے پھانسنے کے لیے جال بچھائے تھے؟ یہ ساری ذلالت تم نے کی...؟"

اس کے خشک لبوں پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اس وقت تم جو چاہے سوچ اور سمجھ لو... یہ وقت ہی بتائے گا کہ تمہارا دشمن کون ہے؟ بہتر ہے کہ اب ان فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔ تم انکار کرنے کا انجام سمجھ گئے ہو۔ کیا اب بھی اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میری رگوں میں لہو ابل رہا تھا۔ اس نے میرا جواب نہ پا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا عقل مندی کا تقاضا نہیں ہے کہ میری پیش کش قبول کر لی جائے؟"

"مگر...؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "میرے لیے یہ راستہ بھی موت کے مترادف ہے۔ یہ سمجھو کہ یہ خودکشی ہے۔"

"نہیں... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں... بس یہ سمجھو کہ یہ ایک راستہ رہ جاتا ہے جس پر چل کر تم پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہو؟" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "مشن مکمل ہونے پر یہ تینوں بدنما اور بھیانک داغ تمہارے دامن سے دھو دیے جائیں گے... ورنہ دوسری صورت میں...؟" اس نے تیز لہجے میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"قانون اندھا ضرور ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ ایک بے گناہ کو ضرور تحفظ دے گا۔ کیوں کہ میرے ہاتھ صاف ہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" اس کے چہرے پر مکروہ ہنسی پھیل گئی۔ "ہمارے دیش ہی میں نہیں دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں انسان کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اس قانون میں ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان سے بے گناہی کا یقین دلانے کا نہیں... سمجھے مسٹر!" تم کتنی ہی بڑی قسم کیوں نہ کھالو یہ لا حاصل ہوگی... ٹھوس ثبوت... ٹھوس ثبوت... کھوپڑی میں آیا... شاید تمہیں نہیں معلوم کہ کتنے بے گناہ انسان اس قانون کی وجہ سے تختہ دار تک پہنچ جاتے ہیں... لہٰذا اچھی طرح سوچ لو... جان لو... تم بھی ان میں سے ایک ہو گے... ہمارے پاس یہ تصویر ہی نہیں بلکہ آلہ قتل بھی موجود ہے جس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں جسے دنیا کی کسی بھی عدالت کے سامنے ایک ناقابل تردید ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیا تم ان نشانات کو جھٹلا سکو گے...؟"

"وہ کس طرح...؟" میں نے تحیر زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا وہ چاقو نقلی نہیں تھا؟"

"یقیناً" نقلی تھا..." اس کا لہجہ اک دم شگفتہ سا ہو گیا۔ "وہ قتل بھی ایک ایسا ڈراما تھا جو عموماً" فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس کی لاش کہاں سے کھول کر قانون کے حوالے کرو گے؟ بہرحال یہ مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ فی الوقت میں

تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس رات گیس کے اسپرے کر کے تمہیں گہری نیند سلا دیا گیا۔ اس طرح اصل چاقو پر تمہاری انگلیوں کے نشانات لے لیے گئے۔"

"اوہ۔۔۔" میں ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ میں منہ سے بے اختیار ایک طویل سرد سانس نکل گئی۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ میں اس دن اتنی گہری نیند دیر تک کیوں سوتا رہا تھا جب کہ شروع سے ہی اور فوج میں ملازمت کے باعث فجر کی اذان سے پہلے بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ رات چاہے کتنی ہی دیر تک جاگتا کیوں نہ رہوں۔

میں کسی قدر سنجیدگی سے معاملے کے عواقب پر غور کرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو اس قدر بے بس محسوس کیا کہ اس کے جال سے نکلنا ناممکن سا لگا۔ میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ آپ ایک لاکھ کی رقم ادا کر دیں۔" میرا لہجہ شکست خوردہ سا تھا۔

مشتاق احمد خان کا چہرہ دمک اٹھا۔ اسے شاید امید نہیں تھی کہ میں یہ فیصلہ کروں گا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک پھولا ہوا خاکستری لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"اس میں ایک لاکھ کی رقم موجود ہے۔ گن کر دیکھ لو۔"

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ہزار پانچ سو ٹاکا کے نئے نوٹوں کی گڈیاں چمک رہی تھیں۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں نچاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں اس بات کا خوف اور اندیشہ نہیں کہ میں یہ رقم لے کر فرار ہو سکتا ہوں؟" مشتاق احمد خان معنی خیز انداز سے مسکرایا اور پھر اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

"ہم نے تمہارے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین کر کے یہ مشن تمہارے سپرد کیا ہے۔"

"تمہیں میری ذات پر اس قدر اندھا اعتماد ہے؟" میں نے متعجب لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم اس مشن میں دلچسپی لو گے کہ وہ جگہ بھی تمہارے دل کی دھڑکن اور سندر سپنا رہی ہے۔"

"بہت خوب۔۔۔!" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں تجسس سے پوچھا۔ "وہ کون سی جگہ ہے؟"

"حسن پور۔۔۔!" اس نے میرے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر بتایا۔

"حسن پور۔۔۔؟" میں اپنے گاؤں کا نام سن کر اس طرح اچھل پڑا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔

آج بھی میری سانسوں میں اس گاؤں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک رچی بسی ہوئی تھی میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک وہاں پر پر کیف اور خواب ناک زندگی گزاری تھی۔ ہائے وہ دن بھی کیا دن تھے۔۔۔؟ جب کبھی مجھے اپنے گاؤں کی یاد آتی تھی تو سینے میں میرا دل بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ میری بے شمار یادیں اس کے گوشے گوشے اور چپے چپے سے وابستہ تھیں۔ وہ سہانی یادیں میری اثاثہ تھیں۔ تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی حسن پور جیسے پس ماندہ اور دور دراز گاؤں میں کسی سفاک عورت کی موجودگی اور اس کا راج کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔ آخر وہ کون عورت ہے جو اس گاؤں پر حکمرانی کر رہی ہے۔ آخر اس نے گاؤں کے باشندوں کو کس بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ اس دور دراز پس ماندہ گاؤں میں سونے کی کان نہیں ہے اور نہ ہی کوئی خزانہ دفن ہے ۔۔۔ وہ ایک غیر معروف گاؤں ہے۔ بنگلہ دیش جیسے بڑے ملک اور کسی بھی شہر میں لوگ اس کے نام سے تک واقف نہیں ہوں گے۔

مجھے اس عورت کے تذکرے میں داستان طرازی کا گمان ہونے لگا۔۔۔ اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں کوندا بن کر لپکا۔۔۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو گاؤں والوں کو اس خطرناک عورت سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اس کی موت کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں؟ کچھ دیر بعد میرے خدشات سوال بن کر میری زبان پر آ گئے۔

مشتاق احمد خان نے میرے خدشات کو سنجیدگی سے سنا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"اس دیش میں چند ایسے خدا ترس بندے موجود ہیں جو ظلم و ستم کی کہانیاں سن کر گاؤں والوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ گاؤں کے لوگ اس زہریلی عورت سے بہت عاجز آ گئے ہیں۔ اس عورت سے اس وقت نجات مل سکتی ہے جب اس کے وجود کو دنیا سے پاک کر دیا جائے۔"

مشتاق احمد خان کی یہ بات میرے دل میں نہ بیٹھ سکی کیوں کہ اس کی بات میں وزن نہ تھا۔ اس نے جو جواز پیش کیا تھا وہ مدلل نہ تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اس سارے معاملے کا پس منظر کچھ اور ہے۔۔۔ وہ اصل بات بڑی چالاکی اور خوب صورتی سے گول کر گیا تھا۔ اس نے مجھے تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا تھا اور دوسرا چھپانے میں کون سا جذبہ کار فرما تھا خدا جانے۔۔۔ بہرکیف میں اس لیے اس کی بات کا قائل نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال اب مجھے گاؤں جانا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد سارے حقائق میرے علم میں آجاتے۔ ظاہر ہے میں آنکھیں بند کر کے مشتاق احمد خان کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی میں کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے مجھے اس مشن پر بھیجنے کے لیے مجھے بلیک میل کیا تھا اور میں اس طرح پھنس گیا تھا جس طرح مکڑی کے جال میں مکھی پھنس جاتی ہے۔

میں نے قدرے توقف کے بعد مشتاق احمد خان سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس عورت کے بارے میں بتائیں کہ اس عورت کا کیا نام ہے؟"

"گل ناز۔۔۔"

میں نے زیر لب دہراتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔ نام بہت خوب صورت تھا۔

میری یادداشت میں آج بھی گاؤں اپنے گاؤں کی بہت سی نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے نام موجود تھے۔۔۔ بہت کوشش کے باوجود میرے ذہن میں کسی گل ناز نامی عورت کا تصور ابھر نہ سکا تو میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا اس عورت کا تعلق اس گاؤں سے یا وہ کسی باڑی سے آئی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ وہ کسی باڑی کی عورت نہیں ہے۔۔۔ اس کا تعلق اس گاؤں سے ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا آپ کے پاس اس زہریلی عورت کی کوئی تصویر موجود ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اس کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی کوئی ضرورت محسوس کی۔" اس نے جواب دیا۔ "گاؤں پہنچو گے تو اسے دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور ایک نظر ہی میں پہچان لو گے۔ اس نے حویلی میں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔"

جب میں مشتاق احمد خان کے ہاں سے گھر واپس آیا تو شام ہو چکی تھی۔ میں کپڑے بدل رہا تھا کہ اس وقت ایک اسکوٹر میرے گھر کے سامنے آیا اور میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس اس نے اسکوٹر روکا تھا اور کھڑکی سے ایک لفافہ پھینک کر چلا گیا۔ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک پرزہ اور کچھ تصویریں تھیں۔ پرزے پر لکھا ہوا تھا کہ ان تصویروں کے نیگیٹو میرے پاس موجود ہیں۔ اگر تم نے بدعہدی کی اور رقم لے کر فرار ہو گئے تو یہ تصویریں قانون کے حوالے کر دوں گا۔ تم بدکاری کے الزام میں بھی دھر لیے جاؤ گے۔

یہ تحریر مشتاق احمد خان کی جانب سے تھی۔ میں نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ یہ کل بارہ عدد تصویریں تھیں۔ چھ تصویریں میری سلیم چوہدری کے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں غلاظت کے دلدل میں بے لباسی کی حالت میں دھنسے ہوئے تھے۔ ہر تصویر نہایت صاف، رنگین اور کلوز اپ میں کسی ماہر عکاس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ان چھ تصویروں میں مختلف زاویے تھے۔ ہر تصویر سے یہ واضح ہو رہا تھا کہ میں نہایت وحشیانہ پن اور جنونی کیفیت سے اس کی بے حرمتی کر رہا ہوں۔ ایسی قبیح حرکت جو کسی عورت

کے ساتھ نہیں کی جاسکتی ہے۔ میں ایک بھیڑیئے کی طرح اس کے ساتھ درندگی کررہا ہوں۔ جیسے وہ عورت نہیں بلکہ جانور ہو۔ اس کے چہرے پر کرب ناک اذیت تھی اور آنکھوں میں التجا بھری ہوئی ہے۔ میں اس سے ایک کھلونے کی طرح کھیل رہا ہوں۔

دوسری تصویر میری ذکیہ خانم کے ساتھ تھی۔ اس کالی حسینہ 'بلیک بیوٹی' کالی چڑیل اور ڈائن ہم دونوں نشاط انگیز لمحات میں ان جانے راستے پر خود سپردگی' والہانہ پن اور وارفتگی سے چلے جارہے ہوں۔ وہ مجھے ہر طرح سے سرفراز کررہی تھی۔ یہ بھی کل چھ عدد مختلف تصویریں تھیں جو غلاظت سے بھری ہوئی تھیں۔ ان تصویروں میں وہ نہایت پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کا فیاضی سے مہربان ہونا ایسا تھا کہ وہ اس میدان اور کھیل کی پرانی کھلاڑی ہو۔

میں نے ان تصویروں کے پرزے پرزے کرکے گردمیں پھینک دیے۔ یہ تصویریں مجھے حوالات پہنچا سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

میں نے اعشاریہ پینتالیس کا ایک امریکن ریوالور خریدا جو جدید ترین اور حال ہی میں بازار میں آیا ہوا تھا۔ گو کہ وہ بے حد قیمتی تھا لیکن بہت خطرناک تھا۔ اس کے نشانے کی رینج کا کوئی ریوالور بازار میں کسی قیمت پر دستیاب نہیں تھا۔ میں نے احتیاطاً سو گولیاں بھی خرید لیں۔ جب کہ اتنی گولیاں فضول اور فالتو بھی تھیں۔ کیوں کہ صرف ایک عورت کو ٹھکانے لگانا تھا نہ کہ میں محاذ پر دشمن سے مقابلہ کرنے جارہا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ جانے اس مشن پر کیا حالات پیش آئیں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں نے یہ دونوں چیزیں ایک بہت ہی موٹے لفافے میں رکھ کر ایک ایسا بنڈل بنالیا کہ دیکھنے والوں کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ بازار سے میں نے درمیانے سائز کا ایک سفری بیگ بھی خرید لیا تھا۔ میں نے اس میں چند جوڑے اور زیر جامے رکھ کر اس کے نیچے ریوالور والا پیکٹ چھپا دیا تھا۔ مزید کچھ ضروری تیاریوں کے بعد میں دوسرے رات کے ایٹمبر میل سے بادی سال روانہ ہوگیا۔ مجھے بادی سال پہنچ کر وہاں حسن پور جانے کے لیے لانچ لینا تھی۔۔۔ حسن پور۔۔۔ بادی سال شہر سے کوئی سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

☆ ☆ ☆

ایٹمبر میں بستر پر لیٹا تو میرا دل آئندہ پیش آنے والے واقعات کے تصور سے دھڑکتا رہا۔

ذہن میں طرح طرح کے خیالات کی ایک یورش سی تھی۔ مشتاق احمد خان نے صرف اس زہریلی عورت کا نام بتایا تھا۔ اس کی عمر بتائی تھی اور نہ ہی اس کے شوہر اور بچوں کے بارے میں 'یقیناً' بتاتا۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا۔ ورنہ میں خود ہی دریافت کرلیتا۔

وہ شادی شدہ تھی یا نہیں۔۔۔؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں منتشر خیالات کے گرداب میں پھنسا یہ سوچ رہا تھا کہ میں ایک عورت کو کس طرح قتل کرسکوں گا۔ دشمن مرد ہوتا تو میں اس قدر فکرمند اور متوحش نہ ہوتا۔ میں نے کبھی غارت گری میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔۔۔ میدان جنگ کی اور بات لیکن یہاں احساس جرم پیروں میں بیڑیاں ڈال رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات مجھے اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے میں کسی کو ایک اجرتی قاتل کی طرح بھاری معاوضے پر قتل پر آمادہ ہوجاؤں گا۔

صبح بادی سال پہنچا تو معلوم ہوا کہ حسن پور کے لیے لانچ شام کے وقت جائے گی۔ دن میں تین لانچیں حسن پور جاتی تھیں۔ صبح سات بجے' دوپہر ایک بجے اور شام چھ بجے۔۔۔ ایٹمبر رات کے وقت انجن میں خرابی کے سبب نو بجے پہنچی تھی۔ دوپہر کی لانچ اس لیے نہیں جارہی تھی اس میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے اب میں شام کے وقت ہی روانہ ہوسکتا تھا۔

میں نے سہ پہر تک کا وقت بادی سال شہر میں گھوم پھر کے گزارا۔ لانچ کی روانگی سے ایک گھنٹہ قبل میں گھاٹ پہنچا۔ گھاٹ پر بہت سارے لوگوں کا ہجوم تھا جو مختلف شہروں کو مسافر لانچوں سے روانہ ہونے والے تھے۔ بادی سال شہر ایک طرح سے جنکشن تھا۔ لانچوں، کشتیوں اور اسٹیمر کا..... چاند پور، کھلنا، سندیپ جزیرہ اور جولار کٹی قصبہ.....! ڈھاکا اور کھلنا سے آنے والے مسافر یہاں اتر جاتے تھے۔

اس ہجوم میں میری نظر چار آدمیوں پر پڑی جن کی حرکات و سکنات بہت پراسرار اور مشتبہ انداز کی سی تھیں۔ وہ چاروں ایک گوشے میں بظاہر مجھ سے لاتعلق کھڑے ہوئے تھے لیکن ان کی معنی خیز نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ سی تھی۔

حسن پور جانے والی لانچ چاند پور سے آنے والی تھی۔ میں اس کے انتظار میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا اور اس ہجوم میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو ان کی نگاہوں کو اپنے تعاقب میں پاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی کڑی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ میں اپنا شک دور کرنے کی غرض سے چکمہ دے کر گھاٹ کے باہر جو ہوٹل تھے ان میں سے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے سڑک پر انہیں بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے پایا۔ جب میں نہیں ملا تو وہ ہوٹلوں میں گھس کر مجھے تلاش کرنے لگے۔ اس بات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں نے ڈسنا شروع کیا۔

کہیں یہ لوگ مشتاق احمد خان کے ساتھی تو نہیں ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر یہ کون لوگ ہو سکتے.....؟ مشتاق احمد خان کہیں مجھ سے ایک لاکھ کی رقم چھین لینے کی غرض سے میرے تعاقب میں تو نہیں ہے؟ مگر انہیں رقم چھیننے کے لیے اتنی دور آنے کی ضرورت کیا تھی.....؟ وہ اسی رات میرے گھر پر دھاوا بول سکتے تھے اور یہ لوگ اس قدر احمق بھی نظر نہیں آتے تھے۔

آج تو ایک بچہ بھی اس امر سے واقف ہے کہ کوئی شخص اتنی رقم جیب میں لیے نہیں پھرتا۔ میں نے وہ رقم بینک میں ایک فرضی نام سے اکاؤنٹ کھلوا کر محفوظ کر دی تھی۔ اس ملک میں مفلسی اور غربت پھیلی ہوئی تھی اور یہاں ایک شخص دس ٹاکا کے لیے بھی قتل کر سکتا تھا۔ ایسی متعدد مثالیں موجود تھیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔

میرا ذہن اس ان جانے دشمن کی طرف چلا گیا۔ مشتاق احمد کی باتوں سے میں نے قیاس لگایا تھا کہ میرے ان جانے دشمن نے میرے راز اس کے ہاتھوں فروخت کر دیے تھے۔ مشتاق احمد خان اور ان جانے دشمن کے درمیان کوئی سازباز فرور تھی یا پھر دونوں ہی میرے خلاف سرگرم عمل تھے میرے دشمنوں کے دلوں سے ابھی بھڑاس نہیں نکل سکی تھی وہ اس لیے وہ مجھے مزید زک پہنچانے پر تلے بیٹھے تھے اور انہوں نے چار بدمعاشوں کو میرے تعاقب میں بھیج دیا تھا۔ اب حسن پور تک میرے ساتھ کس قسم کے واقعات پیش آنے والے تھے مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ بہرکیف میں نے تہ کر لیا تھا کہ میں ہر لحہ چوکنا اور ہشیار رہوں تاکہ وہ میرا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔

عابدہ نامی لانچ حسن پور جاتی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں سے کھچا کھچ بھر گئی۔

میرا ارادہ اول درجے میں سفر کرنے کا تھا مگر ان بدمعاشوں کی موجودگی کے باعث میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر میں تیسرے درجے میں ٹھس ٹھسا بیٹھ گیا۔ اس طرح میں وقتی طور پر خطرات سے محفوظ رہ سکتا تھا اور میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

وہ چاروں کسی سازش اور منصوبے کے تحت میرے تعاقب میں تھے لیکن ان کا اس جگہ سازش کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ وہ اوپر عرشہ پر تھے اور چاروں باری باری زیریں گوشے میں آکر ایک چکر لگاتے اور پھر میری طرف تمسخرانہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے دوبارہ اوپر چلے جاتے۔ میں انجان اور بے فکر بیٹھا یہ تاثرات دیتا کہ مجھے اس کی کوئی پروا ڈر اور خوف نہیں۔ پھر میں

بھی غیر محسوس انداز سے معنی خیز انداز سے مسکرا دیتا جو ان انگارہ بن کر گرتی تھی جس کا اظہار ان کے بشرے سے ہو جاتا۔

لانچ ساری رات سبک رفتاری سے چلتی رہی۔ صرف دو تین گاؤں پر کچھ دیر مسافروں کو اتارنے کے لیے رکی تھی۔ میں پوری طرح محفوظ ہونے کے باوجود ایک پل کے لیے بھی سو نہ سکا تھا۔ میرے ذہن میں خوف و ہراس اور اندیشے لہراتے رہے تھے۔ میں دشمنوں سے غافل ہو کر انہیں کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو میں جان گیا تھا کہ وہ لوگ میری جان کے دشمن نہیں ہیں۔ کیونکہ مجھے قتل کرنا لانچ سے چھلانگ لگا کر فرار ہو جاتے البتہ وہ مجھے کسی سنگین واقعے میں ملوث کر سکتے تھے۔ اس لیے میں چوکنا اور محتاط ہو گیا تھا۔

مجھے نیند اس لیے بھی نہیں آ رہی تھی کہ ایک بوڑھی نابینا عورت اور ایک بوڑھے مرد کے درمیان سترہ اٹھارہ برس کی ایک نوجوان لڑکی میرے مقابل والی بنچ پر بیٹھی تھی۔ وہ سانولی رنگت کی تھی۔ بڑی پرکشش اور جاذبیت سے بھرپور تھی۔ چہرے کے نقوش میں تیکھا پن تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بڑی مخمور تھیں اور ان میں جوانی کی مستی اور پیاس جھانک رہی تھی' چھریرے اور متناسب بدن کی ہونے کی وجہ سے بڑی دل کش لگتی تھی۔ شوخ' الھڑ اور چنچل بھی لگ رہی تھی۔ اس نے جو بلاؤز پہن رکھا تھا اس کا گریبان اس قدر کھلا ہوا تھا اس کے سینے کے ابھار عریاں تھے۔ جسے وہ چھپانے کے بجائے ان کی نمائش کر رہی تھی۔ سینے اور کمر کے درمیان اس کا پیٹ نظر آتا تھا۔ اس لیے کہ بلاؤز دھجی لگتا تھا۔ جب بلاؤز اس کی گود میں گر جاتا تو وہ اسے دیر تک اٹھاتی نہیں تھی۔ اس نے اپنی ساڑی کا فال گھٹنوں تک اٹھا رکھا تھا جس سے اس کی سانولی سانولی سڈول پنڈلیاں جاذبیت سے بھری تھیں جو دل کو برما رہی تھیں۔ اس کی ساتھی عورت اور مرد اونگ رہے تھے۔ اس کی وجہ سے مجھے نیند کہاں آتی۔

میری بنچ پر صرف دو بوڑھے اور دو سات دس برس کے لڑکے تھے۔ مجھ سے قدرے ہٹ کر تھے۔ دائیں جانب ایک جواں سال عورت تھی۔ وہ صرف ساڑی میں تھی۔ بنگال میں گاؤں' قصبوں اور پس ماندہ علاقوں کی نوجوان اور ہر عمر کی لڑکیاں عورتیں غربت و افلاس کی وجہ سے صرف ساڑی میں ہوتی تھیں۔ بلاؤز غربت و افلاس کی وجہ سے نہیں پہنتی تھیں۔ کیوں کہ بلاؤز اتنا مہنگا ہوتا تھا کہ اس کی قیمت میں دو ساڑیاں خریدی جا سکتی تھیں۔ وہ زیر جامہ بھی نہیں پہنتی تھیں بلکہ ساڑی کے پلو کو کمر' سینے اور شانے کے گرد اس طرح لپیٹ لیتی تھیں کہ وہ بلاؤز کا کام دیتا تھا۔ ان کی بانہیں عریاں ہوتی تھیں۔ وہ پلو کمر میں اڑس لیتی تھیں۔ وہ لڑکی اپنی ساتھی نابینا عورت سے کبھی کبھی بات کرنے لگتی تھی۔ یہ عورت اس کی ماں تھی۔ یہ بوڑھا مرد اس کا شوہر تھا۔ بوڑھے مال دار مرد ایسی نوجوان غریب لڑکیوں سے شادی کر لیتے تھے۔

اچانک لانچ کا انجن ایک خوف ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا تو یک دم گھپ اندھیرا سا چھا گیا۔ میں اچھل پڑا اور خوف و دہشت کی لہر میری رگوں میں بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید یہ ان بدمعاشوں کی حرکت ہے۔ لیکن اس گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور اندھیرے میں آنا مشکل اور دشوار بھی تھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ عرشہ پر لانچ کے عملے کی آوازیں سنائی دیں جس سے اندازہ ہوا کہ انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ عرشہ کے مسافروں سے کہہ رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں تھوڑی دیر میں انجن ٹھیک کر لیا جائے گا۔ لہٰذا عرشہ پر جو مسافروں کی بھن بھناہٹ تھی وہ دم توڑتی چلی گئی۔

میں نے اک دم سے ایسا محسوس کیا کہ کوئی ہلکا ہوا رسیلا پھل میری گود میں ٹپک پڑا ہے۔ یہ پھل نہیں تھا وہ نوجوان ہم سفر لڑکی تھی جو اپنی ماں اور شوہر کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ میری گود میں بیٹھ کر اس نے اپنی عریاں' گداز اور سڈول بانہیں حمائل کر دیں اور میرے چہرے پر بڑی خود سپردگی اور جذباتی انداز اور والہانہ پن سے جھک گئی اور میرے ہونٹوں میں اپنے

رس بھرے ہونٹ پیوست کردیے۔ میں نے اس کے چہرے کو ہٹانا چاہا اس لیے کہ کسی بھی لمحہ روشنی ہوسکتی تھی۔ یہ جذباتی منظر مسافر دیکھ لیتے۔ اس کی بانہوں کا شکنجہ ایسا تھا کہ میں اسے توڑ نہ سکا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد اسے بازوؤں میں بھرا تو لگا پلو اس کے شانے اور سینے پر موجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ زیر جامہ۔۔۔ پھر وہ ایسی وارفتگی سے من مانیاں کرنے لگی جیسے نجانے کب سے پیاسی ہے۔ ایسی نوجوان لڑکی کی پیاس یہ بوڑھا شوہر کیسے بجھا سکتا تھا۔ وہ شاید تشنہ اور ناآسودہ ہی رہتی ہوگی۔ میں پل پل خوف کھا رہا تھا کہ روشنی آ گئی تو میری شامت آجائے گی لیکن اسے جیسے کسی بات کا خوف' ڈر اور فکر بالکل بھی نہیں تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ میرے ہاتھوں کو اس نے ایسا بہکایا' بھٹکایا اور جانے کس کس حصے اور گوشوں سے سرفراز اور آشنا کیا کہ میں بے بس ہو گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان جانے راستے پر چلتے چلتے ایسی پستی میں گر جائیں کہ نکل نہ سکیں۔ وہ حد سے تجاوز کرنے لگی۔ میں کوئی مٹی کا تودہ نہیں تھا لیکن خود پر قابو رکھ کر من مانیاں کیں اور غلاظت کے دلدل میں گرنے سے بچاتا رہا۔ عرشے پر روشنی پھیلی تو وہ تڑپ کر الگ ہوگئی۔ اس نے فوراً ہی ساڑی درست کی اور اس کا پلو سینے' شانے پر لے جاکر کمر میں ٹھونس لیا۔ زیر جامہ جو فرش پر گرا پڑا تھا اسے اٹھا کر اپنی ٹوکری میں ٹھونس لیا۔ پھر وہ اپنے بال سمیٹ کر درست کر رہی تھی اور مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ نہ صرف اس کے چہرے بلکہ آنکھوں میں بھی خمار بھرا ہوا تھا۔ اس کا شوہر بھی بیدار ہوگیا تھا۔ پھر چند لمحوں کے بعد روشنی ہوگئی۔ پھر دس منٹ کے بعد روانہ ہوگئی۔

ایک گھنٹہ بعد اس کے گاؤں پہنچ گئی۔

وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کے اتر گئی۔ اس نے مجھے ایسے کیف و سرور' لذت اور من مانیوں سے خوش کیا تھا میرے سارے بدن میں آگ بھردی تھی۔ میں اس بات سے خوش ہوگیا تھا کہ حد سے تجاوز نہیں ہوا تھا۔ میرا پیر پھسلا نہیں۔۔۔ دوسری بات یہ کہ جب وہ ہم آغوشی کی حالت میں تھی تب روشنی نہیں ہوئی۔

تیسری بات یہ تھی کہ اس کا گاؤں آگیا۔ میں نے سوچا کاش! اس کا گاؤں پہلے آجاتا۔ مجھے اس لڑکی پر ترس آیا کہ وہ جو پیاسی تھی اور اپنے جذبات کی تسکین کر رہی تھی اس میں اس کا اور اس کی نوجوانی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سارا قصور اس کے بوڑھے شوہر کا تھا جس نے نواسی' پوتی کی عمر کی لڑکی سے شادی کی۔ ایسے بوڑھے شوہر یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ سراب ہوجاتے ہیں۔ لڑکی اپنی جوانی کی پیاس بجھانے کے لیے جوان مردوں سے تعلقات استوار کرتی رہتی ہوگی۔

لڑکی کے شباب کا نشہ شراب کے نشے سے کہیں مدہوش کن تھا لیکن وہ جلد ہی اتر گیا۔ وقت گزاری اور خوف و ہراس سے نجات پانے کے لیے اپنے گاؤں اور گل ناز کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ عورت میرے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ بہرحال اب گاؤں پہنچ کر ہی اس سلسلے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ میرے لیے یہ بات خاص تعجب خیز تھی کہ اس نے رہائش کے لیے ایسی حویلی کا انتخاب کیوں کیا جو ماضی میں گاؤں میں آسیب زدہ مشہور تھی اور مدتوں سے ویران' اجاڑ اور سنسان پڑی ہوئی تھی اور لوگ اس کے اندر جانا تو درکنار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ڈرتے کانپتے تھے جیسے کوئی بدروح دبوچ لے گی۔

میں کم سنی میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے خوف ناک اور دہشت زدہ کرنے والی کہانیاں سنا کرتا تھا۔

انہی میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ ایک ریاست کے مہاراجا نے تعمیر کیا تھا۔ اس حویلی کو اس نے عشرت کدہ بنا رکھا تھا جہاں وہ راتوں کو کنواری لڑکیوں اور عورتوں کے عریاں رقص دیکھتا تھا اور انہیں فحش حرکات پر مجبور کرتا تھا لیکن کبھی اس نے عزت کو پامال نہیں کیا تھا۔ پھر ہندوستان اور میں تحریک آزادی اور انگریزوں کے استحصال کے خوف سے خوف زدہ ہوکر اس حویلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس کی تین بیویاں اور دس لڑکے تھے۔ لڑکوں کی شادی

کے بعد ہی مہاراجا دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے بہت بڑا خزانہ چھوڑا تھا۔ اس خزانے کی تقسیم نے مہاراجا کے بیٹوں اور بیویوں میں باہمی چپقلش پیدا کر دی اور ایک دن ان کے درمیان ایسا خون خرابا ہوا کہ حویلی اجڑ کر رہ گئی۔ پھر کبھی آباد نہ ہو سکی ... روایت کے مطابق مہاراجا کا سب سے چھوٹا بیٹا اس خون خرابے سے اس لیے محفوظ رہا تھا کہ وہ ان دنوں لندن میں زیر تعلیم تھا۔ کئی برس بعد وہ کلکتہ واپس آ کر وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گیا۔ تاہم کبھی گاؤں آ کر اپنے باپ کی نشانی کو تک دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ حویلی رفتہ رفتہ آسیب زدہ مشہور ہوتی گئی۔ ویسے بھی حویلی کے انتہائی سرے پر آبادی سے اس قدر دور تھی کہ کوئی اس کے قریب پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اس حویلی کا آباد ہو جانا ناقابل فہم تھا۔

صبح ہوئی تو میرا خوف اس حد تک کم ہو چکا تھا کہ میں پرسکون ہی نہیں تازہ دم بھی تھا۔ اس ہم سفر لڑکی نے رات میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی وہ میں کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹوں اور جسم کے نشیب و فراز کی جو مٹھاس بھر دی تھی اسے میں اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس لیے بھی اطمینان اور حوصلہ تھا کہ دن کی روشنی میں وہ بدمعاش مجھ پر حملا نہیں بول سکتے تھے۔ وہ دن بھی بغیر کسی مصیبت کے گزر گیا۔

جب لانچ مہتاب نگر پہنچی تو سرمئی شام پھیلی ہوئی تھی۔ اب حسن پور محض تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ یہ مسافت تھوڑی دیر کی تھی۔ مہتاب نگر میں لانچ تقریباً "خالی ہو چکی تھی۔ میں زیریں حصے میں اکیلا تھا اور نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گاؤں کو تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اٹھارہ برسوں کا عرصہ کتنا طویل ہوتا ہے۔ مجھ پر سوچ اور جذبات کی کیفیات ایسی طاری ہوئیں کہ اپنے اردگرد کا بھی ہوش ہی نہیں رہا۔ میں اس وقت چونکا جب چاروں بدمعاش خاموشی سے نیچے آ کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ میں اپنے بیگ سے ریوالور نکال سکتا۔

وہ چاروں بدمعاش مجھے نرغے میں لینے کے لیے بڑھنے لگے۔ ان کے چہروں پر درندگی اور آنکھوں سے سفاکی جھانک رہی تھی۔ لانچ سبک رفتاری سے حسن پور کی طرف جا رہی تھی۔ انجن کا شور اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ اتنی تھی کہ دردو کے لیے چیخنا بھی لاحاصل تھا۔ تاہم میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ اور خوف کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خود کو قابو میں رکھا۔ حوصلہ اس لیے بھی بلند تھا کہ وہ مسلح دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تاہم میں ان چاروں سے بیک وقت مقابلے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

چند ثانیوں کے بعد وہ چاروں بدمعاش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک بدمعاش کو توفوراً "ہی ڈھیر کر دیا۔ میرا گھونسا جو میں نے اپنی قوت سے اس کے پیٹ میں دے مارا تھا وہ ایک چیخ مار کر فرش پر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پھر وہ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھی اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر مزید مشتعل میں آ گئے۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے اور ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ ایک بدمعاش نے میرے پیچھے سے آ کر مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ بقیہ دو بدمعاشوں نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کی ضربوں سے میرے جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ میرے منہ سے دل خراش چیخیں اور کراہیں نکلتی رہیں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اچانک ہی ایک بدمعاش نے کسی سخت چیز میرے سر کے عقبی حصے پر وار کیا۔ سر چکرایا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے لمحے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ ان بدمعاشوں نے مجھے بڑی درندگی سے نشانہ بنایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے سر کے زخم میں درد

کی ہلکی ٹیسیں اٹھتی محسوس کیں.... اس کے ساتھ ہی ایک لطیف سی مہک میرے حواس پر چھانے لگی۔ اس مہک نے کسی حد تک میری تکلیف کو بھلا دیا تھا۔ میں نے چند لمحات کے بعد اپنی ساری پلکیں اٹھا کر کھول دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے جو دھند کی چادر پھیلی ہوئی تھی وہ چند ثانیوں کے بعد کسی بادل کی طرح چھٹ گئی۔

میں نے اپنے اوپر ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی کو جھکا ہوا پایا۔

وہ نہایت حسین و جمیل تھی.... قدرت نے ایسے دل کش پیکر کو کسی قدر توجہ سے تراشا ہوگا کہ اس میں کوئی عیب اور کمی نہ رہ جائے۔ حسن و جمال کے ایسے دل کش نمونے لاکھوں میں ایک اور کہیں کہیں اور کبھی کبھی دکھائی دے جاتے تھے۔

میں نے اس کے دل اور جاذبیت سے بھرے سراپا میں چاندنی چھلکتی ہوئی دیکھی.... اس کی مخملیں اور خوب صورت شانوں پر اس کے ریشمی سیاہ بال گھرے سیاہ بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے دیکھے۔ اس کے بکھرے سیاہ بال بتا رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ یہ مہک اس کے گیسوؤں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی شبابی پیشانی اور فراخ تھی۔ آنکھوں میں کسی جھیل سی گہرائی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس کے حسین شاداب چہرے پر فکر مندی کے آثار دیکھے۔

معاً اس کی نگاہیں میرے چہرے کی طرف اٹھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چراغ جلنے لگے اور رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے دمکتے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بشاش لہجے میں پوچھا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے....! آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

میں نے اپنا ہاتھ بے اختیار زخم کی طرف بڑھانا چاہا کہ لڑکی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے پھول جیسے نرم' نازک ہاتھ کے لمس سے میرے بدن میں اپنائیت کے بے پایاں جذبے کی فرحت کی رو سرایت کر گئی۔ کتنا لطیف اور اچھوتا لمس تھا۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی شاید میں اس کے ہاتھوں لمس کا ایسا ہی راحت انگیز گداز سرور محسوس کرتا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایک انمول جذبے سے آشنا ہوا تھا۔ میں اپنا زخم' درد اور ٹیسیں بھول گیا۔ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ میری رگ رگ میں اس لڑکی کے لیے ان جانی محبت کا جذبہ ایک طوفان بن کر بھرنے لگا تھا جیسے وہ میرا لہو اور میرے جگر کا کوئی ٹکڑا ہو۔

"نہیں.... نہیں! آپ ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

اس کی جھیل سی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ پھر اس نے جل ترنگ سی آواز میں کہا۔

"زخم کچا ہے ابھی.... ہاتھ لگنے سے اتنی تکلیف ہو گی کہ آپ برداشت نہ کر سکیں گے۔ بے حال ہو جائیں گے۔"

میں نے اپنے اندر بڑی کم زوری اور نقاہت سی محسوس کی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا جو اس نے بڑی آہستگی سے میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے پل بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے زخم میں دوبارہ ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ ایک مستطیل کمرا تھا۔ دروازے کے پاس ایک بڑی چوکی پڑوری اور اس پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے بیرونی دروازے کے عین سامنے لمبی چوڑی مسہری دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کے نرم و گداز بستر پر میں لیٹا ہوا تھا۔ بڑا آرام دہ بستر تھا۔ وہ لڑکی مسہری پر میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں کس قدر حبس تھا۔ باہر بھی شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ اس نے میری بے چینی کو محسوس کر لیا اور اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ میرا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی ساڑی کے پلو سے میرے چہرے کا پسینہ صاف کیا اور مسہری سے اتر کے مغربی سمت کی کھڑکی کھول دی۔

ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا اندر آیا۔ میں نے کھڑکی کی راہ سے صاف و شفاف آسمان کو دیکھا۔ باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ دن کس قدر چڑھ آیا۔ میں نے بولنا چاہا مگر پیاس کی وجہ سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ وہ تیر کی طرح کمرے سے نکلی اور اسی طرح واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا بڑا سا کٹورا تھا۔ میں نے پانی پینے کے لیے اٹھنا چاہا۔ سارے بدن میں درد کی لہر سرایت کر گئی۔ مجھ میں سکت نہیں تھی کہ درد کو برداشت کر سکتا۔ میں بے حس حرکت پڑا رہا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ لڑکی نے مسہری پر چڑھ کر کٹورا میرے سرہانے کے قریب رکھا اور دو زانوں ہو کر میرا سر اپنے زانوں پر رکھا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے کٹورا اٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

ٹھنڈے پانی کے گھونٹ میرے حلق کو جیسے آب زم زم کی طرح حلق کو تر کرتے ہوئے جسم میں اترنے لگے۔

میں جیسے کوئی امرت پی رہا تھا۔ میرے جسم میں طاقت سی عود آئی۔ رات کا احساس رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ میں نے سیر ہو کر پانی پیا' پانی پینے کے بعد میں نے سر نہایت احتیاط اور آہستگی سے تکیے پر رکھ دیا۔

میں نے اس پل آنکھیں بند کر کے بڑے جذباتی انداز سے سوچا۔۔۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اسی طرح میری خدمت کر سکتی؟ مجھے اپنی اس زندگی پہ پچھتاوا سا ہونے لگا۔ میں نے شادی کیوں نہیں کی؟ میں نے اور لوگوں کی طرح اپنا گھر کیوں نہیں بسایا۔۔۔ لوگ اس لیے تو شادی کرتے ہیں کہ یہ جذبوں اور محبتوں کو پانے کا ایک سیدھا اور پاکیزہ راستہ ہے۔ جب بچے پیدا ہوتے ہیں تو کتنے چراغ جل اٹھتے ہیں۔۔۔ ان چراغوں کو بجھانے کے لیے کتنے طوفان آتے ہوں گے؟ کیسی کیسی آندھیاں زمانے کے حوادث بن کر اٹھتی ہوں گی۔۔۔ لیکن ماں باپ ان طوفانوں کے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی کا نام محبت اور مامتا ہے۔ یہ لڑکی؟ اس سے میرا کیا رشتہ ہے؟ یہ نہ میری بہن ہے اور نہ ہی میری بیٹی۔۔۔؟ لیکن اس نے مجھے محبت کے رشتے میں پرو لیا۔۔۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ اس دور میں ایسی مخلص' بے غرض اور محبت بھری لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں؟

میں نے آنکھیں کھول کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

اس کے رخسار دمکنے لگے۔ وہ مترنم لہجے میں بولی۔

"میرے گھر میں۔"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"مجھے کس نے بچایا۔۔۔؟ یہاں کون لے کر آیا۔۔۔؟ وہ بدمعاش کہاں ہیں جو میری زندگی کے درپے تھے؟"

اس نے میرے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ وہ اپنی لانچ میں ندی سے گزر رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ بدمعاش مجھے بری طرح مار رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے جان سے مار کر پانی میں پھینک دیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے پانی میں پھینکتے لڑکی اور اس کے ساتھیوں نے شور مچا دیا۔۔۔ بدمعاشوں نے ان کی لانچ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ پانی میں کود گئے اور نہ جانے کس سمت نکل گئے۔ پھر وہ لڑکی مجھے اپنے گھر لے آئی۔ میں کوئی تقریباً" دو دن بے ہوشی کی حالت میں رہا تھا اور وہ میرا خیال رکھتی رہی تھی۔

میں نے لڑکی کو ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ میری آواز جذبات سے مغلوب ہو کر تھرتھرائی۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔۔۔ تم کتنی پرخلوص ہو۔ تمہارے اندر کس قدر عظیم انسانی جذبہ موجود ہے۔"

"دیکھیے۔۔۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔ اس میں احسان کی کیا بات ہے۔" اس نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ "البتہ آپ کو مجھ پر ایک احسان کرنا ہو گا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"احسان تو نہیں البتہ میں تمہاری ہر ممکن خدمت

کرتا رہوں گا۔ تم میری محسن ہو۔" میں نے کہا۔ "تم حکم کرو۔"

"آپ مکمل صحت یابی تک میرے ہاں ہی رہیں گے۔" اس نے کہا۔ "یہ میری آپ سے عاجزانہ التجا ہے۔"

"وہ کیوں....؟ کس لیے؟" میں نے ششدر ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس لیے کہ مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگوں کی مدد کر کے ایک طرح سے عجیب اور ان جانی مسرت ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا "میرا قلب طمانیت سی محسوس کرتا ہے۔"

"کیا میں زندگی بھر کے لیے یہاں نہیں رہ سکتا؟ صرف صحت یابی تک؟ کیوں؟"

"کیا مطلب....؟" اس کے چہرے پر معصومیت بکھر گئی۔

"ایک شخص کو ایسا مخلص اور بیٹی جیسا تیماردار ملے گا وہ یہاں سے جانا چاہے تو کیسے جا سکے گا؟"

"کیا آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے....؟" اس نے مترنم لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

"نہیں...." میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "میں شادی شدہ ہوتا تو شاید تم جیسی میری بھی بیٹی ہوتی۔"

"اچھا تو پھر آپ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"شکریہ...." میں نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا.... کہ میری بیٹی نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"پروین...." اس نے شوخی سے کہا۔ "آپ مجھے صرف پارو کہہ کر بھی پکار بلا سکتے ہیں۔ کیوں کہ مجھے یہاں بھی پارو کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"مجھے اس گھر میں تمہارے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔" میں نے پوچھا "تمہاری امی ابو.... بھائی اور بہن...."

"میرے ابو....؟" اس کا لہجہ اکدم بدل گیا۔ اس نے اداسی سے نفی میں اپنا خوش نما سر ہلایا۔ "آپ یہ سمجھ لیں کہ میرے ابو نہیں ہیں.... کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے۔ صرف ایک امی ہیں اور وہی سب کچھ ہیں۔"

پارو کو اپنے باپ سے شاید بہت زیادہ جذباتی لگاؤ رہا ہو گا۔ اس لیے اس کی حسین آنکھوں کے کنارے نم ناک ہو گئے تھے۔ اسے اچانک مغموم دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے دل میں باپ کی جدائی کا زخم ابھی تک موجود ہے۔ شاید اس کے باپ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس نے ان کے درمیان دائمی جدائی پیدا کر دی تھی۔

میں نے اس کے باپ کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا اور کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"تمہاری امی کہاں ہیں؟ میں نے انہیں نہ تو دیکھا اور نہ ہی ان کی کوئی آواز سنی؟"

اسے فوراً جواب دینے میں قدرے تامل ہوا۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"وہ کسی ضروری کام سے بادی سال شہر گئی ہوئی ہیں۔ شاید دو ایک روز میں لوٹ آئیں اور ہاں۔" وہ اچانک سراسیمہ ہوتی ہوئی بولی۔

"میں تو بھول ہی گئی.... حکیم صاحب نے آپ سے زیادہ باتیں کرنے کے لیے منع کیا تھا۔ آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ آپ دو دن کے بعد ہوش میں آئے ہیں۔ بھوک اور بیماری سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ ٹھہریے! سونا نہیں.... میں آپ کے لیے توس اور دودھ لے کر آتی ہوں۔ آپ کو تین چار دن تک سخت پرہیز کرنا ہو گا۔ میں آپ کو پھلوں کا جوس بھی دیتی رہوں گی۔" اور آپ کے لیے بطخ کا یخنی سوپ بنا رہی ہوں.... وہ آپ کو ایک گھنٹے کے بعد ملے گا۔"

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ لیکن میرے اندر تجسس کی لہر بیدار کر گئی۔

وہ اپنے نفیس اور مشتہ لب و لہجے میں شائستگی اور

لباس کے سلیقے' حجاب سے وہ کسی بھی طرح گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتی تھی اور اس میں ایک شہری اور تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کی بھرپور جھلک تھی۔ اس کی اپنائیت اور خلوص میں ایک بے ساختہ پن تھا۔ اس کا رویہ اور سلوک اس طرح کا تھا جیسے میں اس گھر کا فرد ہوں۔ جب کہ میں اس کے لیے بالکل اجنبی تھا اور وہ میرے لیے ... ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق بالکل بھی نہیں جانتے تھے۔ اجنبیت کی دیوار تھی۔

گاؤں کی لڑکیاں ایسی کہاں ہوتی ہیں۔ شاید وہ لڑکیاں کچھ بے باک اور بے حجاب ہوتی ہیں جو شہروں میں تعلیم حاصل کر کے آتی ہیں لیکن حسن پور جیسے دور دراز اور پس ماندہ گاؤں کی لڑکیاں ایسی کہاں ہو سکتی تھیں۔ اس کے باوجود بنگلہ دیش کے چھوٹے بڑے شہر ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔

کوئی ہفتہ بھر پارو کی نگرانی میں میرا علاج ہوتا رہا۔ وہ جیسے نرس یا ڈاکٹر بنی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہائی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے نرسنگ کی تربیت حاصل کرلی تھی۔ کیوں کہ اسے نرس اور ڈاکٹر بننے کا شوق ہی نہیں بلکہ جنونی بھی تھا۔ وہ ایک ویلفیئر اسپتال میں فرصت کے اوقات میں رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات انجام دیتی تھی اور اب وہ ڈھاکا میں ایڈن گرلز کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی تھی۔ اسے انگلش لٹریچر سے بے حد دلچسپی تھی۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کو وہ متعدد بار پڑھ چکی تھی۔ اس کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ وہ ہوسٹل میں رہتی تھی اور چھٹیوں میں اکثر اپنی ماں کے پاس چلی آتی تھی اور بستی کے مریضوں کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرتی تھی۔

میں نے دانستہ اس سے گل ناز کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس موضوع کو اس نے چھیڑا تھا جس پر مجھے حیرت تھی۔ کیوں کہ وہ ایک زہریلی عورت تھی۔ زہریلی ناگن سے کہیں خطرناک جس سے سارا گاؤں پریشان تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ میں ایک ریٹائر فوجی افسر ہوں۔ ویسے میرے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اس سے گل ناز کی بابت کچھ معلومات حاصل کروں لیکن ہر مرتبہ کسی خیال کے پیش نظر سوچ کر رہ جاتا کہ شاید وہ خود ہی گل ناز کا ذکر چھیڑے۔

پارو کی شخصیت میرے لیے عجیب اور پراسراری ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ اب تک مجھے اس گھر میں پارو کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ میں ان حکیم صاحب کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا۔ جن کے مطب سے میرے لیے دوائیں آتی تھیں۔ حالاں کہ وہ میرے گاؤں کے تھے لیکن ان کا نام بھی میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ ہاں ایک بوڑھی ملازمہ ضرور تھی جو غالباً گونگی بہری تھی۔ صرف اشارے سمجھتی تھی اور کام بھی بڑی مستعدی سے کرتی تھی اور بڑی چالاک تھی۔ میں اشاروں سے کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا تو انجان بن جاتی تھی۔

یہ گھر ایک اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا رقبہ کم سے کم ایک فرلانگ ضرور ہوگا۔ بہرکیف یہ گھر ہر وقت سکون اور سناٹے میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے جب بڑی وحشت سی ہوتی تو وہ مجھے انگریزی کے جاسوسی ناول دے جاتی تھی جو بڑے دل چسپ اور سنسنی خیز اور جرائم کے موضوع پر ہوتے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جاسوسی ناول پسند نہ ہوں تو رومانوی ناول یا پھر شکسپیئر کے ڈرامے لا کر دے دوں گی لیکن مجھے جاسوسی ناول زیادہ دل چسپ لگے تھے۔ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔

میں نے پارو کو ایک موٹر بوٹ میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس ٹیلے سے دو تین میل کے فاصلے پر اطراف میں گاؤں اور درخت اور چھوٹی چھوٹی مٹی کی پہاڑیاں بھی تھیں۔ پارو نے میرے سوالات کا جواب بڑی خوب صورتی سے گول کر دیا تھا۔ میں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ کیوں کہ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص

سروکار نہ تھا۔

میری توانائی رفتہ رفتہ بحال ہو رہی تھی۔ میں بہت تیزی سے روبہ صحت ہونے لگا تھا۔ میرے زخم مندمل ہو گئے۔ اگر مجھے ہر وقت طبی امداد نہ ملتی اور پارو میری جانفشانی سے تیمارداری نہ کرتی تو میں زندگی نہیں پا سکتا تھا۔ ان بدمعاشوں نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ پارو نے مجھے بتایا تھا کہ حسن پور یہاں سے کوئی بیس پچیس میل کی مسافت پر واقع ہے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے اس جگہ سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ یہ کیا کم تھا کہ ایک اجنبی لڑکی نے بڑے خلوص اور محبت سے میرا ہر طرح خیال رکھا تھا۔ دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ پارو مجھ کسی سگی بیٹی کی طرح شدت سے چاہنے لگی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ دیر تک باتیں کرتی رہتی ہے۔ میں بھی اس کی رفاقت کا بے چینی سے منتظر رہتا تھا۔ میں یہ سوچ کر جذباتی ہو جاتا اور افسردگی سے سوچتا کہ کیا میں اس لڑکی سے دور رہ سکوں گا جس نے مجھے ایک انوکھے جذبے سے روشناس کرایا تھا جس سے میں اب تک نا آشنا تھا۔ اس کی چاہت میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس اجنبی لڑکی نے مجھے اتنا پیار اور خلوص کیوں دیا تھا؟ کاش! میں نے اپنے سینے پر جبر کی سل رکھ کر اس سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو اس نے مجھ سے مزید ایک دن ٹھہر جانے کی درخواست کی۔ کیوں کہ وہ بھی ڈھاکا شہر جا کر اپنی تعلیمی سرگرمیاں شروع کرنے والی تھی جو بہت دنوں سے بند پڑی تھیں۔ میں اس کی محبت بھری استدعا کیسے نہ قبول کرتا۔

اس روز وہ نصف رات تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور رخصت ہوتے وقت مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ صبح کے وقت حسن پور جا کر چھوڑ دے گی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز میری آنکھ کھلی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور میں اپنے بستر کے بجائے آسمان کے نیچے مخملیں گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔

میں ایک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور اپنے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ قریب ہی ندی کا کنارا تھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر میرا سفری بیگ رکھا تھا۔ دور دور تک چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور گھاس بھی نظر آ رہی تھی اور پورے علاقے پر گہرا سناٹا کسی آسیب کی طرح مسلط تھا۔

اچانک مجھ پر اس طرح سے سکتہ طاری ہو گیا جیسے مجھ پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔

بہت دور حسن پور کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ مغربی سمت میں مہاراجا سرت چندر کی حویلی کا عقبی حصہ بھی صاف دکھائی دیتا تھا جو رنگ و روغن کے باعث خوب صورت اور شان دار لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ نیا تعمیر شدہ ہے۔

میں حیران و ششدر رہ گیا۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا... کیا وہ کوئی سپنا تھا... کیا سپنے اتنے سندر بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی قمیص کی آستین الٹ کر دیکھی۔ زخم مندمل ہو گئے تھے لیکن زخموں کے نشان باقی تھے۔ سر پر چوٹ کے متاثرہ حصے کو آہستہ آہستہ دبانے پر ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا۔ میں نے ان واقعات کے بارے میں سوچا جو نہ صرف بہت تیزی سے پیش آئے تھے جو نہ صرف پراسرار، عجیب اور ناقابل فہم بھی تھے۔ پارو کا مجھے ان خطرناک بدمعاشوں سے بچانا اور پھر مجھے اپنے ہاں لے جا کر ایک سگی بیٹی سے بھی بڑھ کر میری تیمارداری اتنے دنوں تک کرنا... اور پھر مجھے کشتی یا بوٹ میں حسن پور پہنچانے کے بجائے بے ہوشی کے عالم میں یہاں چھوڑ کر چلے جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ آخر اسے اس قدر پراسرار بننے کی کیا ضرورت تھی؟ اس معصوم سی لڑکی کو کس بات کا خوف دامن گیر تھا؟ کیا کسی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھپ اندھیرے میں دیوانہ وار بھٹک

رہا تھا۔ راستہ تلاش کر رہا تھا۔ عقل تھی کہ اس نے بھی جواب دے دیا تھا۔

لیکن اب یہاں کھڑے رہ کر ان باتوں کے بارے میں سوچنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ دھندلکے گہرے ہونے لگے تھے۔ آبادی اس قدر دور تھی وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو جاتی۔ اندھیرے میں چلنا دشوار ہو جاتا۔ اندھیرے میں چلنا دشوار ہو جاتا۔ راستہ ہموار نہیں تھا۔ کوئی سڑک صحیح سلامت نہ تھی اور مجھے کھیتوں اور پگ ڈنڈیوں سے گزرنا تھا۔

میں نے اپنا سفر بیگ کھول کر اس کا سرسری سا جائزہ لیا۔ اس تھیلے میں تمام چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ کسی چیز کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔ یکایک مجھے اپنے ریوالور کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک مبہم سا اندیشہ ابھرا۔ کہیں اسے غائب تو نہیں کر دیا گیا؟ یہ خیال آتے ہی میرے لہو میں ایک تلاطم سا پیدا ہو گیا۔ میں نے عجلت سے کپڑوں کی تہیں کھولنا شروع کیں اور بیگ کی ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ مجھے ریوالور کا پیکٹ اپنی جگہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ میں نے اندرون بیگ میں جو رقم رکھی تھی وہ موجود تھی۔

میں نے چند لمحوں کے بعد تھیلا کندھے سے لٹکایا اور اپنا سفر شروع کیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاڑی کی سمت چل پڑا تاکہ اندھیرا مجھے آغوش میں نہ لے لے۔ تقریباً ایک میل کی مسافت میں نے ندی کے ساتھ ساتھ چل کر طے کی۔ پھر اپنا رخ اس وسیع و عریض میدان کی طرف موڑ لیا جو جھاڑیوں کے پاس جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ ان جھاڑیوں کی دوسری طرف ایک کچی سڑک تھی، جو بل کھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی گئی تھی۔ اس راستے پر دائیں جانب وہ حویلی تھی جس کا فاصلہ سڑک سے کوئی دو تین فرلانگ تھا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ فی الوقت حویلی کے پاس سے گزرنا مناسب نہیں تھا مجھے گاؤں پہنچ کر سب سے پہلے کسی اپنے دوست کو تلاش کرنا تھا جس کے ہاں میرے قیام کا بندوبست ہو جائے مجھے امید تھی کہ میرا کوئی دوست مجھے بھولا نہیں ہوگا۔ میں نے بچپن کے حوالے سے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یوں تو دوست بہت ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں دوست وہی ہوتا جو ضرورت کے وقت کام آئے۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ایک شبیہ ابھری۔

ایک سنجیدہ اور معصوم سی صورت جس کی آنکھوں میں ہر لمحہ محبت کا عکس لہراتا رہتا تھا۔ ٹوٹ کر چاہنے والا اور ہر مصیبت کی گھڑی میں سب سے پہلے کام آنے والا اور آج بھی وہی ہر طرح سے کام آسکتا تھا۔ بے ساختہ میری زبان پر اس کا نام آگیا۔

"ابوبکر!"

میں ابوبکر کے ساتھ گزارے ہوئے خوش گوار لمحات کی یادوں میں ڈوب گیا کہ وہ دن اور زندگی بھی کیا تھی۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہی نہیں پڑوسی بھی تھا جو ایک طرح سے خاندان ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے اور میرے گھرانے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو گیا تھا اور ہم ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ تیز تیز چلنے سے میں اس قدر تھک گیا تھا اس لیے میرے چلنے کی رفتار آپ ہی آپ کم ہو گئی تھی۔ گاڑی بھی اب دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ گاؤں سے فاصلہ کم ہوتا محسوس کر کے میں مسکراتا ہوا جا رہا تھا کہ کسی کتے کی غراہٹ سن کر میں ایک دم سے اچھل پڑا۔ میرے بدن اور نس نس میں دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ کیوں کہ یہ کسی عام کتے کی غراہٹ نہ تھی۔ یہ کوئی شکاری اور پالتو کتا تھا جو ایک دم حملہ آور ہو جاتا تھا۔ وہ بہت خوف ناک، خطرناک اور خوں خوار ہوتا ہے۔ یہ آواز سامنے والی جھاڑیوں سے آ رہی تھی۔

میرے بدن پر ایک خوں خوار کتے کے تصور سے لرزہ طاری ہونے لگا۔ تاہم میں نے جلدی سے خود پر قابو پالیا۔ کیوں کہ یہ آواز قدرے دور سے آئی تھی۔ میں جلدی سے تھیلا زمین پر رکھ کر کانپتی انگلیوں سے

بند کھولنے لگا۔ میری متوحش نظریں بار بار جھاڑیوں کی طرح اٹھ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کتا جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔ اس خوف کے عالم کی وجہ سے میں نے تھیلے کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دیں۔ سراسیمگی کی کیفیت میں نے ریوالور کا پیکٹ باہر نکال لیا لیکن خوف ابھی بھی میری رگوں میں سنسنا رہا تھا۔ میں نے گولیوں کا ڈبا نکال کر ریوالور کو لوڈ کیا۔ میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں اسے با آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے ریوالور پر گرفت مضبوط کی اور چند لمحوں تک کتے کا انتظار کیا۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ برابر جاری رہی۔ کتے کی غراہٹ آس پاس کو گنجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جیسے اس نے انسانی بو اور آہٹ محسوس کی ہو۔ میں نے جھاڑیوں کی طرف شست باندھی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر اور سرسراہٹ یک لخت بند ہو گئی تھی لیکن میں اس کے باوجود مزید چوکنا اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ کیوں کہ گہری خاموشی نے خطرے کا احساس مزید بڑھا دیا تھا۔ دشمن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ کسی سمت سے مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ جب کئی لمحے خیر و عافیت سے گزر گئے اور سناٹا طاری رہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب سفر جاری رکھنے میں کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

پھر میں زمین پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے بکھرا ہوا سامان جلدی جلدی بیگ میں ٹھونس ٹھونس کر رکھنے لگا۔ آس پاس ابھی تک خطرہ موجود تھا اس امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں سے جتنا جلدی ممکن ہو نکل جانا ہی بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اچانک اور غیر متوقع کتے کا سامنا ہو اور میں اسے موت کی بھینٹ چڑھا دوں۔ ایک طرح سے یہ سیز فائر ہی ہوا تھا۔

پھر میں نے تھیلا کندھے پر لٹکایا اور تیزی سے گاؤں کی طرف چل دیا۔

ریوالور بدستور میرے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اس درندے کا کوئی بھروسا نہ تھا۔ میں بطور احتیاط بار بار پلٹ کر ان جھاڑیوں کی طرف دیکھ لیتا تھا جہاں میں نے کتے کی غراہٹ سنی تھی۔ اس کے علاوہ میری ساری توجہ اس اطراف کی جھاڑیوں پر بھی تھی۔ پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ غالباً کتا کسی شکار کی تلاش میں کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

یکایک مجھے اس سفاک اور زہریلی عورت اور زہریلی ناگن عورت کا خیال آیا جس نے گاؤں والوں کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی۔

ممکن تھا کہ کتا بھی اس نے پال رکھا ہو جب کہ ہمارے گاؤں میں شکاری کتے کا پالنا کسی کے بس کی بات نہ تھی کیوں کہ اس کی نگہداشت اور غذا پر خاصا خرچ آتا تھا۔ جب کہ ایک غریب آدمی کے لیے دو وقت پیٹ بھر کے کھانا بھی مشکل تھا۔ ایسے کتے پالنے کے چونچلے سرمایہ داروں کے ہوتے تھے کیوں کہ ان کے پاس حرام کی آمدنی ہوتی تھی وہ جو کتوں کو کھلاتے تھے ایک عام آدمی خواب میں بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

میں کتوں کی نسلوں سے خوب واقف تھا۔ میرے خیال میں وہ کوئی پالتو کتا تھا۔ اگر وہ جنگلی ہوتا تو یقیناً مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا میں نے اندازہ لگا لیا کہ گل ناز نے اس کتے کی مدد سے گاؤں میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ ہر کسی کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس کتے کی موجودگی سے سراسیمہ اور حد درجہ خائف رہتے ہوں گے۔ شام ہوتے ہی گھروں میں دبک جاتے ہوں گے۔ یہ کتا چوں کہ تربیت یافتہ تھا اپنے مالک کے اشارے پر گاؤں کا ایک چکر لگا کر حویلی یا اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہو گا۔

جب میں گاؤں میں داخل ہوا تو رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ گاؤں کا بازار ویران اور سنسان دکھائی دیا جب میں یہاں تھا تو بازار رات کے دس گیارہ بجے تک اور تہواروں میں رات کے ایک بجے کھلا رہتا۔ کیوں کہ وہ لوگ جو حسن پور کے قرب و جوار میں مسافر لانچوں سے جاتے تھے وہ یہاں خریداری کرتے تھے۔ حسن پور کے بازار میں ہر قسم کے سامان کی دکانیں موجود تھیں۔

(دوسری اور آخری قسط اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

چتوڑ کا چاند

ذوالفقار ارشد گیلانی

شانشتگی کے بھیس میں جب روح درندگی انگڑائی لیتی ہے تو ہوس ملک گیری انسان کے لباس میں شیطان کو بیدار کردیتی ہے اور ایسے ہی قصے جنم لیتے ہیں۔ اسی بر صغیر میں کئی شہنشاہ ایسے گزرے ہیں جو آج بھی تقدس کا مرقع اسلامی زندگی کا پر تو کہلاتے ہیں۔ ٹوپیاں سی کر اپنی گزر اوقات کرتے تھے مگر کچھ شہنشاہ ظلم و جبر میں چنگیز خان کو بھی مات دیتے نظر آتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے ایسی کہانیاں وجود میں آتی ہیں زیر نظر کہانی کسی مستند مسلم تاریخ داں کے حوالے سے مزین نہیں مگر غیر مسلم تاریخ دانوں نے قلعہ چتوڑ گڑھ کی فتح کے اس المیہ پہلو پر بہت زیادہ لکھا۔ بارہ سے زائد ہندی فلمیں بن چکی ہیں۔ مظلوم خواہ کسی بھی مذہب کا ہو وہ ترحم کا مستحق ہے اور ظالم خواہ برادر حقیقی کیوں نہ ہو قابل مذمت ہے۔

اس رانی کا تذکرہ جس نے عزت پر موت کو ترجیح دی تھی

محبت اور ہوس میں نہایت باریک سا پردہ ہوتا ہے جو اٹھ جائے تو سالہا سال کی تپسیا ایک لمحے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ محبت' طلب کا دوسرا نام ہے اور اس کا منطقی انجام حصول ہی ہے لیکن اگر طلب کو خود پر حاوی کر لیا جائے تو پھر محبت' ہوس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور برسوں کی عبادت و ریاضت کو چشم زدن میں گناہ و غلاظت میں غرق کر دیتی ہے۔

آج تک جتنی رومانوی داستانیں ہماری نگاہوں سے گزری ہیں' ان میں محب اور محبوب کے مابین طلب اور حصول کی جنگ اور جذبہ تو دکھائی دیتا ہے لیکن اس ضمن میں کوئی غیر فطری کوشش نظر نہیں آتی' چنانچہ اسی بنا پر ان کہانیوں نے نہ صرف شہرت پائی بلکہ قیامت تک کے لیے امر ہو گئیں کیونکہ ان کے کرداروں نے بھی قانون قدرت کو توڑنے یا دائرہ فطرت سے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو آج یقیناً" ان کا تعلق گناہ کے زمرے میں آتا' محبت نہ کہلاتا اور ظاہر ہے کہ گناہ کار طعن و تشنیع اور باعث شرم و ندامت تو بنتے ہیں وجہ شہرت نہیں ہوتے۔

ہندوستان کے مسلمانوں فرماں روا سلطان علاؤ الدین خلجی اور چتوڑ گڑھ کی خوب رو ہندو رانی پر بدمنی کا قصہ کسی طور پر بھی رومانی داستانوں میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن یہ تاریخ کا حصہ ضرور ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ داستان محض یکطرفہ محبت کی کہانی ہی نہیں بلکہ اس طلب بے جا کی بدترین مثال بھی ہے جسے ہم ہوس کا نام دیتے ہیں۔ عیش و عشرت' ساغر و مینا' محافل رقص و سرور اور حرم میں لاتعداد خواتین سے جائز و ناجائز تعلقات رکھنے کی روش بادشاہوں کے لیے کبھی باعث تنقید نہیں رہی لیکن یہ داستان سلطان خلجی کے کردار پر ایک بدنما داغ ضرور ہے کیونکہ اس نے جس عورت کو اپنے حرم کی زینت بنانے کی کوشش کی وہ نہ صرف کسی دوسرے کی بیوی اور عزت تھی بلکہ خلجی نے اس کے حصول کی خاطر ایک نہایت محترم رشتے کے تقدس کو بھی پامال کیا۔

یہی وجہ ہے کہ رانی پدمنی کو تاریخ میں "ہیلن آف انڈیا" اور "چتوڑ کا چاند" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان علاؤ الدین خلجی کا اصل نام جونا خان تھا اور یہ ہندوستان کے خلجی خانوادے کا دوسرا بادشاہ تھا۔ اس کی اصل تاریخ پیدائش کا علم نہیں تاہم اس نے لگ بھگ بیس سال ہندوستان پر حکومت کی۔

علاؤ الدین' جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ ابتدائی طور پر جلال الدین نے اسے الہ آباد شہر کے نزدیک کارا کا صوبے دار (گورنر) مقرر کیا۔ 1296 میں علاؤ الدین نے اپنے چچا کو قتل کر دیا۔ لیکن جلال الدین کی بیوہ ملکہ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین خلجی کو تخت نشیں کر دیا۔ جب علاؤ الدین کو اس کی خبر ہوئی تو وہ نہایت تیز رفتاری سے ساتھ کارا سے دہلی کی طرف بڑھا اور اس عالم میں شہر میں داخل ہوا کہ اس نے اپنے چچا کا سر اپنے نیزے پر سجا رکھا تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد 3 اکتوبر 1296 کو اس نے خود کو بادشاہ دہلی قرار دے دیا۔ جلال الدین کے بڑے بیٹے اولغ خان اور چند دن کے بادشاہ رکن الدین کو آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا بنا دیا گیا جبکہ ملکہ جہاں کو قید کر لیا گیا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی نے عنان حکومت سنبھالتے ہی جائز و ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرنا شروع کر دیا اور اس کا پہلا نشانہ امرائے دربار اور شرفائے حکومت بنے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی کو قتل کرا دینے یا اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروانے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ اس نے لوٹ مار بازار کچھ اس طرح گرم کیا کہ لوگ اس سے پہلے ہندوستان پر حملہ کرنے والے حملہ آوروں کو بھی بھول گئے۔

1297ء یعنی اپنی تخت نشینی کے اگلے ہی سال اس نے الغ خان اور نصرت خان کی قیادت میں ایک فوج گجرات بھیجی۔ اس فوج کا مقصد ہی چونکہ ریاست کو برباد کرنا تھا چنانچہ اس نے شہر کو لوٹا اور سومنات کے مندر کو تباہ کر دیا۔ وہاں سے قیمتی خزانے اور زر و جواہر

لوٹ لیے اور شولنگ کے بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دہلی کے لیے روانہ ہوگئی۔

فوج ابھی راستے میں ہی تھی کہ جالور کے حکمران کنہار دیو سونگارا نے حملہ کر کے الغ خان کو شکست فاش دی۔ اس نے شولنگ کے ٹکڑے واپس چھین لیے اور انہیں دریائے گنگا میں غسل کے بعد جالور کے مختلف مندروں میں نصب کرادیا۔ کہا جاتا ہے کہ خلجی فوج کے ایک جنرل محمد شاہ نے اس سارے واقعے میں کنہار دیو سونگارا کی مدد کی تھی۔ محمد شاہ ایک نو مسلم تھا چنانچہ اس جنگ کے بعد وہ خلجی افواج کو خیرباد کہہ کر رن تھمبور میں ہمیر سے جاملا۔

الغ خان نے اپنی شکست اور محمد شاہ کی غداری سے علاؤ الدین کو آگاہ کیا تو اس نے الغ کو نصرت خان سے مل کر رن تھمبور فتح کرنے کا حکم دیا۔ 1299ء میں انہوں نے اسی ہزار گھڑ سواروں اور لاتعداد پیدل فوج کے ساتھ اس حملے کا آغاز کیا۔ ہمیر کی فوج نے نہ صرف ڈٹ کر خلجی فوج کا مقابلہ کیا بلکہ الغ خان اس معرکے میں مارا گیا اور نصرت خان فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔

خلجی کو اس شکست سے شدید دھچکا پہنچا اور اس نے بدلہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ 1301ء میں وہ خود فوجیں لے کر رن تھمبور پہنچا اور محاصرے کے دوران خلجی نے بہت کوشش کی اور لاتعداد حملے کیے لیکن قلعے کو سرنگوں کرنے میں ناکام رہا۔ تب خلجی نے سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

شروع میں ہمیر اس معاملے میں خاصا متذبذب تھا لیکن اس کے مشیروں نے اسے قائل کیا کہ تلوار ہمیشہ تمام مسائل کا حل نہیں ہوتی چنانچہ ہمیر نے اپنی دو قابل اعتماد ساتھیوں رتی پال اور رن مل کو گفت و شنید کے لیے خلجی کے پڑاؤ میں بھیجا ان میں سے رن مل کے باپ کو ہمیر 'غداری' کے جرم میں پھانسی دے کر اس کی جائداد ضبط کرچکا تھا۔ رن مل 'ایک بار پھر ہمیر کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بہ ظاہر بڑی بہادری اور رغبت سے ہمیر کی جنگوں میں حصہ لیتا تھا لیکن اندر سے وہ ہمیر کے خون کا پیاسا تھا۔

خلجی کو جب اس حقیقت کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں جنرلوں کو بڑے سبز باغ دکھائے اور بھاری رشوت کی پیش کش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رن تھمبور کا ناقابل تسخیر قلعہ دنوں میں سرنگوں ہوگیا۔ گجرات کی فتح کے بعد سلطان خلجی نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کے خاندانوں کو اپنے سرکاری لیکن مذموم مقاصد پورے کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔

اس کے دور حکومت میں منگولوں نے دو مرتبہ ہندوستان پر حملے کی کوششیں کیں لیکن ان دونوں میں منگولوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی مرتبہ 1297ء میں علاؤ الدین کے ایک جرنیل ظفر خان نے جالندھرے کے قریب منگولوں کو عبرت ناک شکست دے کر اس کے تخت کو بچایا جبکہ اس کے دو سال بعد دو لاکھ منگولوں کا ایک غول دوبارہ ہندوستان فتح کرنے کی غرض سے خلجی بادشاہت کی حدود میں داخل ہوا۔ اس مرتبہ بھی ظفر خان ان کے مقابلے پر آیا اور جنگ میں بے پناہ بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس جنگ میں بھی خلجی افواج کو شکست ہوئی تو درکنار منگول ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پائے۔ لڑائی تو ظفر خان نے جیت لی لیکن وہ اپنی زندگی کی جنگ ہار گیا۔

علاؤ الدین خلجی نے اپنے دور حکومت میں جو سکے کندہ کرائے ان پر اس نے اپنے لیے "سکندر ثانی" کا خطاب کندہ کرایا۔ وہ الیگزینڈر دی گریٹ کی طرح پوری دنیا فتح کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

علاؤ الدین کو مدورائے کی آتش زدگی اور دہلی سلطنت کو ہندوستان میں وسعت دینے کے حوالے سے یاد رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ 300 سال بعد مغلوں نے بھی عین اسی کے نقش قدم پر عمل کیا تھا۔

علاؤ الدین کا انتقال جنوری 1316 میں زہر خورانی کے باعث ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ذمے دار اس کا ایک معتمد ملک نائب تھا۔

علاؤالدین خلجی کے عہدے کا سب سے مشہور بلکہ شرمناک واقعہ 1303ء میں اس کی بادشاہت کے ساتویں سال پیش آیا جب اس نے چتوڑ پر حملہ کیا۔

چتوڑ یا چتوڑ گڑھ' مغربی ہندوستان کی ریاست راجستھان کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہ دریائے بانس کے معاون دریا' دریائے بیراچ کے کنارے آباد ہے۔ آج کے ضلع چتوڑ گڑھ کا ضلعی ہیڈ کوارٹر کسی زمانے میں میواڑ کی بادشاہت کا شاندار دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔

تاریخی اعتبار سے قرار دیا جاتا ہے کہ چتوڑ کو ساتویں صدی عیسوی میں میوریہ عہد کے دوران تعمیر کیا گیا تھا۔ قدیم میواڑی سکوں کے مطابق اس شہر کو ایک راجپوت سردار چترانگ گدموری کے نام پر چترا کوٹ کہا گیا۔ قلعے کی فصیل گول تھی اور اسکے مرکزی حصے میں جانے کے لیے سات عظیم الشان دروازے عبور کرنے پڑتے تھے۔ ان دروازوں کو پول کہا جاتا تھا جبکہ ہر دروازہ نام' ڈیزائن اور سائز کے اعتبار سے مختلف تھا۔

تواریخ میں ان سات دروازوں کے نام پدن پول' بھیروں پول' ہنومان پول' جرلا پول' گنیش پول' لکشمن پول اور رام پول بیان کیے گئے ہیں۔ بعض تاریخ دانوں نے انہیں پدن پل' بھیروں پل' ہنومان پل' جرلا پل' گنیش پل' لکشمن پل اور رام پل بھی لکھا ہے۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ قلعہ پہلے سے مودی خانوادے کے قبضے میں تھا کہ 734ء میں میواڑ کی بادشاہت کے بانی بپا راول نے چتوڑ گڑھ (قلعہ چتوڑ) پر قبضہ کرکے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ کچھ روایات میں ہے کہ بپا راول نے آخری سولنگی شہزادی سے شادی کی تو یہ قلعہ اسے جہیز میں ملا تھا۔ بہرحال اس کے بعد سے اس کی اولاد سولہویں صدی عیسوی تک میواڑ کی حکمران رہی جس کی سرحدیں گجرات سے اجمیر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

چتوڑ کا شمار ہندوستان کی ان راجدھانیوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف طاقت ور ترین تھیں بلکہ اس پر قبضے کے لیے سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئیں۔ چتوڑ میواڑ عہد کے پہلے باقاعدہ اور باضابطہ دارالحکومت کی حیثیت سے بھی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس سے پہلے میواڑ کے حکمران ایدر' بھومت اور نگدہ سے کاروبار حکومت انجام دیا کرتے تھے۔ اسی طرح چتوڑ نے برصغیر پاک و ہند کی طویل جنگ آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

روایات کے مطابق چتوڑ 834 سال تک میواڑ دارالحکومت رہا۔

مختصر وقفوں کے علاوہ چتوڑ کا قلعہ ہمیشہ گوہیلا گہلوت قبیلے کے سودیوں کے قبضے میں رہا جو راجپوتوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ یہی شاخ بپا راول کی اولاد کی کہلاتی تھی۔

1303ء میں دہلی کے سلطان' علاؤالدین خلجی نے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کرکے چتوڑ پر قبضہ کیا۔ اس کے حملے کا مقصد چتوڑ کی رانی اور اپنے وقت کی خوب صورت ترین عورت رانی پدمنی کو اغوا کرنا تھا لیکن رانی نے اپنی بے حرمتی کے بجائے موت کو ترجیح دی اور قلعے کی دیگر خواتین کے ساتھ اجتماعی طور پر آگ میں کود گئی جسے "جوہر" کہا جاتا ہے۔

قلعے کے تمام مرد زعفرانی قبائیں پہن کر جنگ کے میدان میں کود گئے۔ (راجپوت بستی یعنی زعفرانی چولا تب پہنتے ہیں جب وہ مرجانے کی قسم کھالیتے ہیں۔ گویا خود کش دستہ بن چکے ہوتے ہیں) تواریخ اور روایات کے مطابق ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ بزرگوں نے بچ جانے والے بچوں کی پرورش کی۔ 1326ء میں اسی گوہیلا قبیلے نے ایک نوجوان ہمیر سنگھ کی قیادت میں دوبارہ اس قلعے پر قبضہ کرلیا۔ ہمیر سنگھ کے بعد یہ خانوادہ اور قبیلہ سسودی کہلایا کیونکہ ہمیر سنگھ' سسودی نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

سولہویں صدی میں میواڑ ایک طاقت ور راجپوت ریاست بن چکی تھی۔ 1527ء میں میواڑ کے حکمران رانا سانگا نے مغل فرماں روا بابر کے خلاف

جنگ لڑی لیکن اس جنگ کھنوعہ میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1535ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے قلعے پر حملہ کیا اور محاصرے کے بعد نہایت بے رحمی سے قتل عام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ 1303ء میں رانی کے جواہر کی تقلید میں ایک بار پھر قلعے کے تمام 32 ہزار جوانوں نے زعفرانی لباس پہنے اور مرنے کے لیے سلطان بہادر شاہ کے مقابلے پر آگئے جبکہ خواتین نے رانی کرنا وتی کی قیادت میں اجتماعی خودکشی کرلی۔

1568ء میں آزادی سے زندگی گزارنے کی کوشش کے طور پر "جواہر" کا واقعہ تیسری بار پیش آیا۔ اس بار تیسرے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے چتوڑ پر قبضہ کیا۔

اس کے بعد سلطنت میواڑ کا دارالحکومت کوہستان اراولی کے دامن میں چتوڑ کی مغربی جانب ودے پور منتقل کردیا گیا جہاں میواڑ کا ولی عہد رانا اودی سنگھ دوم نے 1559ء میں اپنی رہائش گاہ تعمیر کی تھی۔ 1947ء میں ہندوستان کے ساتھ الحاق تک ریاست کا دارالحکومت اودے پور ہی رہا جبکہ چتوڑ رفتہ رفتہ اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹا۔

چتوڑ گڑھ ہندوستان کی دو تاریخی شخصیات کے حوالے سے بھی بے حد مشہور ہے۔

ان میں سے ایک ہندوستان کی ممتاز مذہبی شاعرہ میرا بائی ہے جس کا کلام آج بھی شمالی ہندوستان میں زبان زدعام ہے۔ اس کی نظموں میں بھگتی روایات کی جھلک ہے جبکہ اسے کرشن کی مہاپجارن تسلیم کیا جاتا ہے۔ داستانوں میں ہے کہ کرشن سے اس کی بے پناہ محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے آخری بار دوارکا میں کرشن کے مندر میں ہی دیکھا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کرشن کے بھجن گاتی ہوئی مندر میں داخل ہوئی اور اس کے بعد دروازے خود بخود بند ہوگئے۔ بعد ازاں جب انہیں کھولا گیا تو میرا بائی کی ساڑی کرشن کے بت کے گرد لپٹی ہوئی تھی جس سے یہ اخذ کیا گیا کہ دونوں کا ملاپ ہوگیا۔

دوسری اہم ترین اور مشہور شخصیت رانا پرتاب کی تھی۔ وہ رانا اودی سنگھ دوم کا بیٹا تھا۔ اسے راجپوتوں کی بہادری اور شجاعت کی مثال قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے اکبر اعظم سے چتوڑ واپس لینے اور سلطنت میواڑ کی عظمت رفتہ بحال نہ ہونے تک جنگلوں میں رہنے اور مسلسل لڑتے رہنے کی قسم کھائی تھی۔ مہارانا پرتاب نے اپنی ساری زندگی اسی خواب کی تعبیر حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس دوران وہ درختوں کے پتے کھا کر زندہ رہا۔ میواڑ کے راجپوت مہارانا پرتاب کو اپنا عظیم ترین ہیرو قرار دیتے ہیں۔

راجپوتوں کے دور زوال میں مہارانا پرتاب تنہا آزادی کی جنگ لڑتا رہا اور اس نے تادم آخر ہیں اس پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا حتیٰ کہ 1597ء میں اسی حالت میں وہ چل بسا۔

چتوڑ گڑھ آج بھی راجپوتوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ایک زمانے میں یہ واقعی ان کی عظمت کا نشان تھا۔ اسے اکثر و بیشتر "بھگتی اور شکتی کی نگری" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ چتوڑ کے قلعے اور شہر میں اب بھی راجپوتوں کا سب سے بڑا تہوار "جواہر میلا" نہایت اہتمام سے منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ میلا رانی پدمنی اور اس کی تقلید میں آگ میں خود کو جان دینے والی بہادر اجپوت عورتوں کو خراج تحسین پیش کرنے اور ان کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ راجپوت شہزادوں کی اولادوں سمیت راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد اس میلے میں شرکت کرتی ہے۔

چتوڑ کے قلعے میں کالی دیوی کا ایک مندر بھی واقع ہے جسے کالی ماتا کا مندر کہا جاتا ہے۔

راول رتن سنگھ چتوڑ کے اسی قلعے کا محافظ اور سلطنت میواڑ کا بیالیسواں حکمران تھا۔ ان دنوں آج کی پوری ریاست راجستھان سلطنت میں میواڑ کا حصہ تھی۔ راول رتن سنگھ جسے راول رتن سین بھی کہا جاتا ہے کا تعلق راجپوتوں کی ذیلی شاخ گوہیلوا گوہیلا سے تھا۔ گووہ ایک نہایت بہادر، شجیع اور نڈر شخص تھا لیکن اس کے باوجود وہ محض دو سال سلطنت میواڑ پر حکمرانی کرسکا۔

راول رتن سنگھ 1302ء میں برسراقتدار آیا لیکن اس سے اگلے ہی سال یعنی 1303ء میں دہلی کے سلطان علاؤ الدین کے ہاتھوں مارا گیا۔ سلطان علاؤ الدین کے چتوڑ پر حملے کی وجہ راول رتن سین کی بیوی رانی پدمنی تھی جسے اللہ نے ملکوتی حسن عطا کیا تھا۔ اس کے حسن و جمال کی دور دور تک شہرت تھی جو سلطان علاؤ الدین تک بھی پہنچی۔ سلطان چونکہ ایک عیاش فطرت اور خوب صورت عورتوں کا رسیا تھا چنانچہ اس نے رانی پدمنی کو حاصل کرنے کے لیے چتوڑ پر حملہ کردیا۔

اس واقعے کا پس منظر بعض اختلافات کے ساتھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ راول رتن سنگھ محض بہادر اور شریف النفس بادشاہ پیار کرنے والا شوہر ہی نہیں بلکہ علم و فنون کا دلدادہ شخص بھی تھا۔ اس نے اپنے دربار میں ایسے کئی افراد کو جمع کر رکھا تھا۔ جو اپنے اپنے علم اور فن میں ملکہ رکھتے تھے۔ ان میں باروبرداران بھی تھے جن کے نام رگھو اور چتن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رگھو اور چتن ویسے تو راول رتن سنگھ کے درباری تھے لیکن اصل میں دہلی کے سلطان علاؤ الدین خلجی کے مخبر اور تنخواہ دار تھے اور وہ چتوڑ میں ہونے والے واقعات کی خبریں اور پل پل کی اطلاعات اسے پہنچایا کرتے تھے۔

راول رتن سنگھ کو کسی طرح ان کی غداری کا علم ہوگیا تو اس نے ان دونوں بھائیوں کو بلا کر سخت سرزنش کی اور اپنی حرکتوں سے باز رہنے کو کہا۔ رگھو اور چتن نے راول رتن سنگھ سے وفادار رہنے کی ہامی تو بھری لیکن اس کے عوض انہوں نے رانی پدمنی کے جہیز کا خاصا بڑا حصہ طلب کیا۔ رانا راول رتن سنگھ ان کے اس مطالبے پر بری طرح سیخ پا ہوگیا اور اس نے ان دونوں کو اپنی ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

بعض روایات میں رگھو اور چتن کو ایک ہی شخص رگھو چتن بتایا گیا ہے۔ ان کے مطابق رگھو چتن درباری گویا تھا۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس درباری گویے کی صورت میں ان کے درمیان ایک شیطان صفت شخص بھی موجود ہے کیونکہ وہ سفلی کا ماہر اور بہت سی شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو زیر کرنے اور ان سے انتقام لینے کے لیے اپنی ان ہی شیطانی قوتوں سے کام لیتا تھا۔

ایک بار رگھو چتن شیطانی کام میں مصروف تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ شاہ رتن سنگھ کو جب علم ہوا کہ اس کا ایک مصاحب ایسے کاموں میں مصروف ہے اسے نہایت تکلیف ہوئی اور اس نے غصب ناک ہو کر رگھو چتن کو کڑی سے کڑی سزا دینے کا حکم سنایا۔ راویوں کے مطابق رگھو چتن کو منہ کالا کر کے ایک گدھے پر بٹھایا گیا۔ پہلے اسے پورے چتوڑ میں گھمایا گیا جس کے بعد اسے ریاست بدر کردیا گیا۔

رگھو چتن اپنی اس بے عزتی پر رتن سین کا دشمن ہوگیا اور اس نے دل میں بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اس دنوں دہلی کے تخت پر سلطان علاؤ الدین خلجی براجمان تھا۔ رگھو چتن کو سلطان کی خصلتوں کا بہ خوبی علم تھا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دہلی کے سلطان کو چتوڑ کے حکمران کے خلاف اکسائے گا اور اسے چتوڑ پر حملے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ پورے ہندوستان میں وہی ایک ایسی قوت تھی جو چتوڑ کے راجپوتوں کے مقابلے پر آسکتا تھا۔

رگھو چتن پورا منصوبہ ترتیب دینے کے بعد دہلی روانہ ہوگیا لیکن وہ شہر میں داخل نہیں ہوا۔ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دہلی کے ایک قریبی جنگل میں ڈیرا ڈال لیا جہاں سلطان علاؤ الدین خلجی اکثر ہرن کے شکار کے لیے آیا کرتا تھا۔ ایک روز اسے علم ہوا کہ سلطان اپنے رفقاء کے ہمراہ شکار کھیلنے آرہا ہے۔ رگھو چتن اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے تیار ہوگیا۔

اس نے ایک بانسری اٹھائی اور نہایت مہارت سے اسے بجانا شروع کردیا۔ وہ اپنے وقت کا ماہر موسیقار اور گویا تھا اس لیے جب اس کی بانسری کی مدھر تانیں جنگل میں بکھریں تو ہر جانب ایک سرور سا طاری ہوگیا۔ بانسری کی آواز جب سلطان کے معتمدین تک

پہنچی تو وہ بھی شکار بھول کر اس میں کھو گئے۔ وہ حیران تھے کہ کون شخص ایسے سحر انگیز انداز میں بانسری بجا رہا ہے۔ سلطان نے خود بھی بانسری سنی اور بے خود سا ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چاروں جانب پھیل جائیں اور پتا چلائیں کہ بانسری بجانے والا کون ہے؟

سپاہیوں نے ذرا سی تگ و دو کے بعد رگھوچتن کو تلاش کر کے سلطان کے سامنے پیش کر دیا۔ رگھوچتن نہایت احترام اور آداب کے ساتھ سلطان سے ملا۔ سلطان نے اس سے بعض سوالات کیے اور اسے درباری موسیقار بننے کی پیش کش کی جسے رگھوچتن نے بہ خوشی قبول کر لیا کیونکہ اس کا تو مقصد ہی سلطان کی قربت حاصل کرنا تھا۔

رگھوچتن، سلطان علاؤ الدین خلجی کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس کی قربت حاصل کرنے کی کوششوں میں لگ گیا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے سلطان کی چاپلوسی کرتا اور خوشامد کرتا اور اپنے فن سے اس کا جی بھی بہلاتا۔ رفتہ رفتہ اس کا شمار سلطان کے منہ چڑھے درباریوں میں ہونے لگا۔ رگھوچتن کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ سلطان کے موڈ کو سمجھنے لگا تھا اور جب اسے کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ مناسب لمحے کا انتظار کرتا۔ سلطان خلجی پر اس کا اثر رسوخ اس حد تک بڑھا کہ پرانے درباری اور امراء رگھوچتن سے حسد کرنے لگے لیکن وہ اپنے کام میں مگن رہا جبکہ دوسروں کا منہ بند کرنے کے لیے شیطانی قوتوں کو بھی بروئے کار لاتا رہا۔

ایک دن دربار میں محفل موسیقی برپا تھی۔ اور سلطان نشہ آور مشروب کے گھونٹ لے لے کر موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چند رقاصائیں بھی سلطان کا دل بہلانے میں مصروف تھیں۔ اچانک سلطان نے حکم دیا کہ رگھوچتن بانسری پر وہی دھن سنائے جو وہ جنگل میں بیٹھا بجا رہا تھا۔

رگھوچتن کو بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا' اس نے وہی دھن چھیڑ دی جبکہ رقاصائیں اس پر رقص میں مگن ہو گئیں۔ سلطان سرشاری کے عالم میں جھوم رہا تھا چنانچہ رگھوچتن مسلسل بانسری بجاتا رہا۔

محفل رقص و سرور تمام ہوئی تو سلطان نے ایک قیمتی ہار رگھوچتن کو انعام کے طور پر بخشا۔

رگھوچتن انعام لینے کے لیے سلطان کے انتہائی قریب گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ آج سلطان کا موڈ ایسا ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی کی جا سکتی ہے۔

"جان کی امان پاؤں' سلطان معظم!" رگھوچتن نہایت خوشامدی انداز میں گویا ہوا "میں اس بیش قیمت تحفے پر آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

رگھوچتن کو رنش بجا لایا تو سلطان نے سر خم کر کے اسے شرف قبولیت بخشا۔

"سلطان معظم! میں ایک بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔"

"اجازت ہے۔" سلطان کی نشے میں ڈوبی آواز ابھری۔

"میں سوچتا ہوں کہ آپ نے مجھ جیسے عام آدمی کو اپنے دربار میں اتنی زیادہ عزت کیوں بخشی ہے۔" رگھوچتن نہایت احتیاط سے الفاظ منتخب کر رہا تھا۔

"اس لیے کہ تمہاری موسیقی سے ہمارے ذہن کو سکون ملتا ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو ایک عام سا موسیقار ہوں۔" رگھوچتن بولا۔

"مگر ہمیں پسند ہو۔" سلطان نے جام سے ایک گھونٹ لیا۔ "اور جو چیز ہمیں پسند ہو' ہم اسے اپنے دربار کی رونق بنانے میں قطعی تاخیر نہیں کرتے۔"

"میں سلطان عالی قدر کی نظر شناسی کا بے حد قائل ہوں۔" رگھوچتن کا لہجہ خوشامدی تھا۔ "اس لیے میری خواہش ہے کہ دنیا کی خوب صورت ترین ہستیاں سلطان عالی مقام کے دربار اور حرم کی زینت بنیں۔"

حرم کے ذکر پر سلطان چونکا "ہمارے حرم میں ایک سے ایک خوب صورت کنیز موجود ہے۔" سلطان نے تیوریاں چڑھائیں "لیکن تمہیں ہمارے حرم سے کیا

سروکار؟"

"مجھے کوئی سروکار نہیں سلطان معظم!" رگھوچتن نے فوراً" ہاتھ باندھ لیے "لیکن آپ سے ہے!"

"کھل کر بات کرو۔" سلطان نے پہلو بدلا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جب تک رانی پدمنی آپ کے حرم کی زینت نہیں بنتی' وہ ادھورا ہے۔"

"رانی پدمنی!" سلطان نے سوالیہ نگاہوں سے رگھوچتن کو دیکھا "یہ کون ہے اور اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"چتوڑ کی رانی ہے سرکار!" رگھوچتن نے جواب دیا۔ "رانا راول رتن سنگھ کی بیوی۔"

"مگر ہمارے لیے اس کی کیا اہمیت ہے؟"

"وہ بے حد خوب صورت عورت ہے' سلطان معظم!" رگھوچتن بولا۔

"کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟" سلطان نے پوچھا۔

"جی سرکار!" رگھوچتن کے لہجے میں کچھ اور مٹھاس آگئی۔ "درجنوں بار..... لیکن آپ یقین کریں کہ میں نے روئے زمین پر اس جیسی خوب رو' دلکش اور حسین و جمیل عورت نہیں دیکھی۔"

"ہمیں اس کے سراپے کے بارے میں کچھ بتاؤ....." سلطان اب مکمل طور پر ہمہ تن گوش تھا "وہ کیا نام بتایا تھا.....؟"

"رانی پدمنی..... سرکار!"

"ہاں' رانی پدمنی۔" سلطان علاؤ الدین خلجی نے دہرایا۔ "ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

رگھوچتن نے رانی پدمنی کے حسن کا کچھ یوں نقشہ کھینچا کہ سلطان علاؤ الدین خلجی اسے پانے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ اس نے فوری طور پر سپہ سالار کو طلب کیا اور چتوڑ پر حملے کی تیاریوں کا حکم دے دیا۔

محض تین دن بعد خلجی افواج پوری رفتار کے ساتھ چتوڑ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

دوسری جانب رانا راول رتن سنگھ کو بھی علم ہوگیا کہ سلطنت دہلی کی افواج آندھی و طوفان کی طرح چتوڑ کی طرف بڑھ رہی ہیں چنانچہ اس نے قلعے کی حفاظت کے کچھ ایسے انتظامات کرے کہ جب سلطان علاؤ الدین خلجی وہاں پہنچا تو اسے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ طاقت و قوت کے ذریعے قلعے پر قبضہ کرنا ناممکن ہے۔ اس نے فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا چنانچہ ابتدائی طور پر دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لیے قلعے کا محاصرہ کرلیا گیا اور تمام راستوں کو ناقابل رسائی بنادیا گیا۔

سلطان نے حکم دیا کہ قلعے کی رسد و کمک کے تمام ذرائع بند کردیے جائیں لیکن سلطان کے جاسوسوں نے اسے جواباً مطلع کیا کہ سات سو ایکڑ رقبے پر محیط قلعے میں اتنے وسائل موجود ہیں کہ کئی ماہ کی مسلسل ناکابندی بھی اندر والوں کے حوصلے پست نہیں کرسکتی۔ قلعہ ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی فصیل کے قریب جانا بھی ممکن نہ تھا۔ سلطان کے بعض فوجی دستوں نے اس کی کوشش کی لیکن فصیل پر موجود تیراندازوں نے اس تیزی سے تیر برسائے کہ خلجی افواج کو اپنے مرنے والے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے کی مہلت بھی نہ مل پائی۔

سلطان کو بتایا گیا کہ چتوڑ کے گودام غلے سے لبالب بھرے ہوئے ہیں جبکہ پانی کی صورت حال یہ ہے کہ قلعے میں پانی حاصل کرنے کے چوراسی ذرائع موجود ہیں۔ ان میں تالاب' کنویں اور سیڑھی دار باؤلیاں شامل ہیں۔ ان میں چار ارب لیٹر پانی ذخیرہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے 50 ہزار نفوس پر مشتمل فوج اور شہری چار سال تک بغیر کسی بیرونی امداد کے زندہ رہ سکتے ہیں۔

قلعے کی تفصیلات سن کر سلطان کے ہوش اڑ گئے لیکن رانی پدمنی کو حاصل کرنے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ اس نے محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔

محاصرے کو کوئی روز گزر گئے لیکن صورت حال جوں کی توں رہی۔ خلجی افواج تو چتوڑ کے کسی ایک آہنی دروازے کی کیل بھی نہ توڑ سکیں لیکن ان کے اپنے درجنوں سپاہی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

سلطان علاؤ الدین خلجی اپنے مشیروں سے

مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مکر و فریب، چال بازی اور سیاست کے بغیر قلعہ چتوڑ پر قبضہ ناممکن ہے۔ طویل صلاح مشورے کے بعد رانا رتن سنگھ کے نام ایک خط بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

خط میں سلطان نے رانا راول رتن سنگھ کو دوستی کی پیش کش کی اور لکھا کہ وہ اہل چتوڑ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اس نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ اگر اسے محض ایک بار رانی پدمنی، جسے وہ اپنی منہ بولی بہن سمجھتا ہے، سے ملاقات کا موقع دے دیا جائے تو وہ بغیر کسی کارروائی کے دہلی لوٹ جائے گا۔

رانا راول رتن سنگھ کو بہ ظاہر یہ خواہش بے حد عجیب سی لگی کہ سلطان دہلی اتنی دور سے اپنی افواج اور کروفر کے ساتھ محض اس لیے یہاں آیا ہے کہ اس کی بیوی سے ملاقات کر سکے۔ گو اس کے ذہن میں کوئی منفی تاثر نہیں تھا لیکن کسی اور کی بیوی سے ملاقات کی خواہش ہی اس کے نزدیک خاصی معیوب بات تھی۔ اس نے خط اور اپنے خدشات کا تذکرہ اپنے مشیروں سے کیا تو اکثریت نے سلطان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ان کا موقف تھا کہ راجپوت ایک غیرت مند اور باعزت قبیلہ ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کی عورتوں سے ملاقات کی خواہش کرے اور نہ ہی وہ اپنی عورتوں کو اس امر کی اجازت دیں گے کہ وہ کسی غیر آدمی کے سامنے جائیں۔ وہ سلطان کے خط اور خواہش کو اپنی بے عزتی اور توہین قرار دے رہے تھے اور یہ ضد تھے کہ خط کا تحریری یا زبانی جواب دینے کے بجائے عملی کارروائی کی جائے۔ سلطان کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا جائے اور قلعے کے دروازے کھول کر راجپوت سپاہی خلجی فوج پر ٹوٹ پڑیں۔

رانا راول رتن سنگھ نے اپنے جذباتی مشیروں کو یاد دلایا کہ خط میں سلطان نے رانی پدمنی کو اپنی منہ بولی بہن لکھا ہے اور کسی تصدیق کے بغیر سلطان کے جذبات پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر بھی جذباتی راجپوتوں کا موقف وہی تھا کہ اتنے دن کے محاصرے اور جنگی چھیڑ چھاڑ کے بعد سلطان کو اچانک ہی رانی کو اپنی منہ بولی بہن بنانے کا خیال کیوں آ گیا۔ اگر اس بات کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان کے ذہن میں کوئی بات نہیں تو وہ رانا راول رتن سنگھ کی جانب براہ راست دوستی کا ہاتھ بڑھاتا اور رانی سے ملاقات کی خواہش کو حذف کر دیتا۔

رانا کے بعض بہی خواہوں نے رانا کو مشورہ دیا کہ سلطانی افواج کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ درست ہے کہ چتوڑ کا دفاع بے حد مضبوط ہے لیکن عددی اعتبار سے ہم اقلیت میں ہیں۔ اگر جنگ میں شکست ہو جاتی ہے تو ہماری عورتوں کا کیا بنے گا۔ ظاہر ہے کہ ان کی عزت فاتحین کے رحم و کرم پر ہو گی۔ اس لیے سلطان سے دوستی کر لی جائے تاہم رانی پدمنی سے ملاقات کا معاملہ چونکہ نہایت ذاتی معاملہ ہے جس میں خود راجا کی عزت و ناموس کا سوال ہے اس لیے اس کا فیصلہ راجا خود کرے۔

الغرض دونوں اطراف سے کچھ ایسے دلائل پیش کیے گئے کہ رانا پریشان ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے پر براہ راست اپنی رانی سے مشورہ کرے گا۔

رانی پدمنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دل کھول کر اسے حسن سے نوازا تھا اسی طرح بے اندازہ عقل و دانش بھی عطا فرمائی تھی۔ اس لیے رانا راول رتن سنگھ اکثر و بیشتر اس سے ریاست کے سیاسی اور دفاعی امور پر مشورے کرتا رہتا تھا۔

لیکن جب اس نے سلطان کا خط رانی کے سامنے رکھا تو وہ آگ بگولا ہو گئی۔

رانی نے نہایت کھل کر نہ صرف سلطان کی نیت پر شک و شبہے کا اظہار کیا بلکہ اسے بے نقط بھی سنائیں۔ رانی کا کہنا تھا کہ سلطان کی جانب سے اسے منہ بولی بہن بنائے جانے پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس بہن سے ملاقات کی خواہش خالص نفسانی اور شہوانی جذبہ ہے۔ اس نے قرار دیا کہ یہ سلطان کی کوئی چال ہے جس کی آڑ میں وہ اہل چتوڑ کو نیچا دکھانا چاہتا

ہے اور راجپوتوں کی عزت پامال کرنا چاہتا ہے۔

اس زمانے میں جنگوں یا طویل مدت کے لیے دارالحکومت سے باہر جاتے وقت بادشاہوں کے حرم ان کے ساتھ جایا کرتے تھے لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے کبھی دشمن کو حرم میں آنے کی اجازت دی ہو۔ تمام ملاقاتیں اس عارضی دربار یا قیام گاہوں پر ہوا کرتی تھیں جو ان مخصوص دنوں میں بہ طور خاص بادشاہ کے لیے لگائے جاتے تھے اور ان ملاقاتوں میں حرم کی کسی خاتون کو شامل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ حرم کو براہ راست کسی بادشاہ یا حکمران کی ذاتی جاگیر اور غیرت و حمیت قرار دیا جاتا تھا۔

اسی طرح سلطان علاؤ الدین خلجی سے پہلے تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہ تھی جس میں کسی بادشاہ نے دوسرے حکمران یا دشمن فرماں رواں کے حرم کی کسی خاتون سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہو تاوقتیکہ مذکورہ خاتون سے اس کی کوئی قریبی رشتے داری، تعلق یا قرابت داری نہ ہو۔ اخلاقی طور پر بھی یہ نہایت معیوب تھا کہ بادشاہ وقت کسی دوسرے فرماں روا کی بیوی سے ملاقات کا خواہشمند تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ان دونوں کی آپس میں کوئی خونی رشتے داری نہ تھی اور وہ ایک دوسرے کے مقابل جنگ کے لیے موجود تھے۔

رانی پدمنی نے یہ تمام دلائل اپنے شوہر کے سامنے رکھے اور یہ بھی پوچھا کہ کیا وہ یعنی سلطان علاؤ الدین خلجی اس ملاقات کے لیے اپنے حرم کی خواتین کے ساتھ آنے کا خواہش مند ہے یا تنہا لیکن خط میں اس قسم کی کوئی صراحت موجود نہ تھی۔ رانا راول رتن سنگھ نے جب لاعلمی کا اظہار کیا تو رانی کا یقین پختہ ہو گیا کہ سلطان کی نیت میں کھوٹ ہے۔ منہ بولی بہن کا رشتہ بنانا محض ایک بہانہ ہے بلکہ اس کی آڑ میں وہ اس کے حسن سے سیراب ہونا چاہتا ہے اور راجپوت ملکہ کی حیثیت سے وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

رانی پدمنی نے اسے اپنی توہین اور اس عمل کو اپنے شوہر سے بے وفائی قرار دیا۔ کسی غیر مرد کے سامنے سج سنور کر جانا، شوہر کی جگہ کسی اور کو دینے کے مترادف تھا۔ وہ سلطان کے اس عمل کو اپنے شوہر کی بے عزتی سمجھ رہی تھی۔ اسے خود اپنی خوب صورتی کا علم تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ سلطان علاؤ الدین خلجی کسی خوب صورت عورت کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

سلطان علاؤ الدین خلجی کی بہ ظاہر اہل چتوڑ سے کوئی دشمنی نہ تھی اور دونوں ریاستوں کے حکمران اپنی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر رہے تھے۔ کم از کم رانا راول رتن سنگھ کی جانب سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا گیا تھا جو سلطنت دہلی یا سلطان کے لیے کسی اشتعال کا باعث بنتا۔ اس لیے رانی کے خیال میں سلطان علاؤ الدین خلجی کی چتوڑ آمد اور حملے کا مقصد سوائے اس کے حصول کی کوشش کے کچھ نہ تھا۔

رانی پدمنی نے اپنی قدرتی ذہانت سے تمام واقعات کا نہایت تفصیل سے تجزیہ کیا اور سلطان کے ساتھ ملاقات سے حتمی طور پر انکار کر دیا۔

تاہم رانی پدمنی نے اپنے فیصلے میں یہ گنجائش رکھی کہ اس کے ذاتی انکار کے باوجود اگر اس کا شوہر اس ملاقات کی اجازت دے گا تو وہ ایک فرماں بردار بیوی کی حیثیت سے اس کی تعمیل کرے گی۔ اس نے رانا راول رتن سنگھ کو مشورہ دیا کہ اس صورت میں وہ ایسا بندوبست کرے کہ سلطان براہ راست اس کے بدن یا سراپا کو نہ دیکھ سکے چنانچہ سوچ بچار کے بعد میاں بیوی میں طے پایا کہ رانی اپنے سولہ سنگھار کے ساتھ بہ ذات خود سلطان کے سامنے نہیں جائے گی بلکہ سلطان کو اس کا حسین سراپا کسی تالاب کے پانی یا آئینے میں دکھایا جائے گا۔

یعنی سلطان علاؤ الدین خلجی کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ رانی پدمنی کا بدن نہیں دیکھ پائے گا ہاں اس کے عکس سے اپنی نظروں کو سیراب کر لے۔

لیکن رانا کی جانب سے سلطان کو یہی پیغام بھیجا گیا کہ رانی پدمنی اس سے ملاقات کے لیے تیار ہے

کیونکہ رانا کو خدشہ تھا کہ اگر عکس دکھائے جانے کی بات پہلے کی گئی تو ممکن ہے کہ سلطان اشتعال میں آکر حملہ عام کا حکم دے دے اور وہ اس مرحلے پر جنگ کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

رانا کا پیغام پاکر سلطان علاؤالدین خلجی کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ وہ جس مقصد کے لیے چتوڑ آیا تھا وہ پورا ہونے جارہا تھا۔ اس نے رانا کو جوابی خط لکھا جس میں اس نے رانی پدمنی اور رانا راول رتن سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی جانب سے دوستی کی تجدید کی اور اس وعدے کو دہرایا کہ رانی پدمنی سے ملاقات کے بعد وہ اپنی افواج سمیت واپس دہلی کوچ کر جائے گا اور اہل چتوڑ کو دوبارہ تنگ نہیں کرے گا۔

باہمی مشاورت سے ملاقات کی تاریخ اور مقام طے پایا گیا۔ دونوں فریقین اس امر پر متفق ہوگئے کہ ملاقات قلعے کے اندر رانا کے محل میں ہوگی۔ رانا، سلطان دہلی کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کرے گا جس میں سلطان اپنے چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ شریک ہوگا۔ ضیافت کے بعد سلطان کو رانی پدمنی سے علیحدگی میں ملاقات کا موقع فراہم کردیا جائے گا۔ سلطان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے مسلح پہرے دار ساتھ لاسکتا ہے لیکن ان کی تعداد اس قدر زیادہ نہ ہو کہ قلعے کے راجپوت مشتعل ہوجائیں۔ سلطان کو یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ قلعے کے اندر اس سے ایک دوست اور رانی پدمنی کے منہ بولے بھائی کی حیثیت سے سلوک کیا جائے گا۔

سلطان نے کوشش کی کہ وہ رانا اور رانی پدمنی کو اپنے پڑاؤ میں آنے پر آمادہ کرسکے لیکن رانی پدمنی کی جانب سے سلطان کو پیغام بھیجا گیا کہ بھائی اتنی دور سے اپنی بہن کے ساتھ ملاقات کے لیے آیا ہے اس لیے یہ بہن کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ اپنے محل میں بھائی کا استقبال کرے۔ یوں بھی رانا راول رتن سنگھ قلعے کو چھوڑ کر دشمن افواج میں تنہا جانے کو تیار نہ تھا جبکہ خود رانی پدمنی نے بھی اس کی مخالفت کی۔

ضیافت کے روز سلطان علاؤالدین خلجی اپنے چند پہرے داروں کے ہمراہ قلعے کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے یہ چالاکی کی کہ اپنے اصل پہرے داروں کے بجائے فوج کے نہایت ماہر اور مایہ ناز جرنیلوں کو پہرے داروں کے روپ میں ساتھ لیا جبکہ روانگی سے پہلے اس نے اپنے ان جرنیلوں کے ساتھ طویل مشاورت بھی کی۔

اہل چتوڑ خصوصاً فوجی افسران کو سلطان علاؤالدین خلجی کی بہ حیثیت دوست قلعے میں آمد سے مطلع کیا جاچکا تھا چنانچہ کسی قسم کا تعرض کیے جانے کے بجائے اس کی آمد سے پہلے ہی قلعے کا مرکزی وزراء، مشیروں اور فوجی جرنیلوں کے ساتھ خود مرکزی دروازے پر موجود تھا۔ سلطان کا نہایت والہانہ اور پرتپاک استقبال کرایا گیا اور راجپوت بچے بچیوں نے منوں پھول اپنے مہمان پر نچھاور کیے۔ سلطان کو وہاں سے ایک جلوس کی صورت شاہی محل لے جایا گیا جو شہر کے تقریباً وسط میں قلعے کی سب سے بلند جگہ تعمیر کیا گیا تھا۔

دسترخوان پر انواع و اقسام کے لوازمات موجود تھے جولذت میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے لیکن سلطان کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ اس نے نہایت بے دلی کے ساتھ تھوڑا بہت کھایا اور مشروب سے جی بہلانے لگا۔ اسے اب رانی پدمنی سے ملاقات کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔

ضیافت کے بعد سلطان کے ہمراہی چہل قدمی کے بہانے باہر نکل آئے۔ ان کا اصل مقصد قلعے کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔ سلطان اسی لیے انہیں ساتھ لایا تھا کہ وہ جائزہ لے کر بتاسکیں کہ کس طرف سے حملہ کیا جائے تو کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ سلطان کے جرنیلوں نے نہایت عقابی نگاہوں سے شہر کی حفاظت کے لیے کیے جانے والے اقدامات اور فصیل پر موجود سپاہ کی پوزیشنوں کا جائزہ لیا تاکہ بعد میں سلطان کو اس سے آگاہ کیا جاسکے۔

محل کے کمرائے خاص میں اب سلطان علاؤالدین خلجی اور رانا راول رتن سنگھ تنہا موجود تھے۔ چتوڑ

کے امراء اور فوجی جرنیل دوسرے ہال میں تھے۔ سلطان اور رانا کچھ دیر مے نوشی کرتے رہے جس کے دوران گفتگو بھی جاری رہی۔ سلطان کا خیال تھا کہ رانی پدمنی سے اس کی ملاقات یہیں ہوگی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ اس سلسلے میں رانا سے بات کرے کیونکہ بے تابی اب حد سے بڑھ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رانی یہیں کہیں اسی محل میں اس کے قریب موجود ہے اور یہی سوچ اسے ہیجان میں مبتلا کررہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس حسن کی دیوی کو وہ دیکھنے کے لیے یہاں آیا ہے اس کا جلد از جلد دیدار ہوجائے تاکہ اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔

ذرا دیر بعد ایک کنیز اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ پہلے اس نے سلطان کو آداب کیا اور بعد ازاں اپنے رانا کے حضور تعظیم بجالائی۔

"سلطان معظم کو رانی نے یاد فرمایا ہے۔" کنیز کے مختصر سے جملے سے سلطان کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ وہ گھڑی آپہنچی تھی جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

سلطان نے رانا راول رتن سنگھ کی جانب دیکھا لیکن رانا نے نہایت رسیلے انداز میں جواب دیا کہ سلطان کو اس ملاقات کے لیے تنہا جانا ہوگا۔ وہ نہیں چاہتا کہ بہن بھائی کے رازونیاز میں مخل ہو۔

سلطان خود یہی چاہتا تھا لیکن اس نے ظاہر یہی کیا کہ وہ صرف رانا کے کہنے پر تنہا اس ملاقات کے لیے جارہا ہے۔ بہرحال وہ ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کنیز کی رہنمائی میں محل کے اندرونی حصے کی جانب چل دیا۔

سلطان کو ایک وسیع کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں نشست تو کوئی نہیں تھی البتہ کنول کے پھول کی صورت کا ایک بڑا سا تالاب اس کے وسط میں موجود تھا۔ ابھی سلطان صورت حال پر غور ہی کررہا تھا کہ تالاب کے شفاف پانی میں ایک نہایت خوب صورت اور دل کش عورت کا سراپا ابھرا۔ سلطان اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ جس عورت کا عکس اتنا حسین و جمیل ہے وہ خود کس قدر جاذب نظر رہی ہوگی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

سلطان کو فوری اندازہ ہوگیا کی یہی رانی پدمنی ہے اور وہ اس وقت اس کے عقب میں بالکونی پر موجود ہے۔ وہ پلٹا تاکہ رانی کو دیکھ سکے لیکن عین اسی وقت بالکونی کی چلمن گرادی گئی۔۔۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ کمرے کے سامنے والی دیوار شیشے کی تھی اور رانی پدمنی کا عکس سلطان کو آئینے میں دکھایا گیا تھا لیکن رانی خود سامنے نہیں آئی۔

سلطان سمجھ گیا کہ ملاقات کرانے کی آڑ میں اس کے ساتھ چال چلی گئی ہے۔ اسے رانا راول رتن سنگھ پر شدید غصہ آیا لیکن اس وقت اس کا اظہار مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ مکمل طور پر دشمنوں کے نرغے میں تھا۔

تاہم اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی اس منہ بولی بہن کو لازمی طور پر اپنے حرم میں شامل کرے گا خواہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ہی کیوں نہ چکانی پڑے۔

سلطان بوجھل قدموں سے باہر نکلا اور اسی کنیز کی سربراہی میں واپس اسی کمرے میں آگیا جہاں رانا اس کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد سلطان نے مہمان نوازی پر رانا کا شکریہ ادا کیا۔ رانی کے نام نیک خواہشات کا پیغام بھجوایا اور رخصتی کی اجازت چاہی۔ اس نے اپنے عمل سے کسی قسم کا کوئی شکوہ یا کبیدگی ظاہر نہ ہونے دی جس سے رانا راول رتن سنگھ یہی سمجھا کہ سلطان مطمئن واپس جارہا ہے۔

اس عرصے میں سلطان کے جرنیل بھی حفاظتی انتظامات کا بھرپور جائزہ لے چکے تھے اور انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلطان کو بتادیا تھا کہ اب کوئی مشکل نہیں۔ سلطان نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اور اطمینان سجایا اور جلوس کی صورت واپس روانہ ہوگیا۔ سلطان نے رانا کو یقین دلایا کہ اس کی خواہش چونکہ پوری ہوگئی ہے اس لیے وہ پہلی فرصت میں دہلی لوٹ جائے گا اور دوبارہ کبھی چتوڑ کا رخ نہیں کرے گا۔

رانا راول رتن سنگھ نے جواباً" سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ آداب میزبانی نبھانے اور اپنی جانب سے سلطان کی دوستی کے احترام میں اس نے شہر کے مرکزی دروازے پر سلطان کو الوداع کہنے کے بجائے کچھ دور تک ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ رانا کے بعض امرا نے اسے اس سے باز رہنے کو کہا لیکن رانا نے انہیں بتایا کہ وہ مطمئن رہیں۔ سلطان کی خواہش پوری کردی گئی ہے اور اب اسے یا اہل چتوڑ کو سلطان سے کوئی خطرہ نہیں۔

رانا نے جب سلطان کو بتایا کہ وہ کچھ دور تک اس کی ہمراہی کرنا چاہتا ہے تو وہ خوش ہوگیا۔ اس کے شیطانی ذہن نے فوراً" ہی ایک منصوبہ بنالیا۔ رانا کو سلطان پر اس قدر اعتماد ہوگیا کہ اس نے دو چار محافظوں کے سوا کسی کو ساتھ لینے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ قلعے کے مرکزی دروازے سے کچھ دور آنے کے بعد جب رانا نے سلطان کو الوداع کہنا چاہا تو سلطان کے مسلح پہرے داروں نے رانا کے محافظوں پر حملہ کردیا۔ وہ تعداد میں بے حد کم تھے چنانچہ چند ہی منٹ میں ان کا صفایا ہوگیا۔ اب رانا تنہا رہ گیا۔ اس نے بھی تلوار سونت کر مقابلے کی کوشش کی لیکن سلطان کے کئی تنومند ساتھی بیک وقت اس پر آپڑے اور وہ بے بس ہوگیا۔

رات کی تاریکی میں کسی کو خبر ہی نہ ہوسکی کہ کیا قیامت گزر گئی ہے۔

سلطان رانا کو اپنے پڑاؤ میں لے آیا اور ایک خیمے میں قید کرکے اس پر پہرا بٹھادیا گیا۔

کچھ دیر بعد سلطان کے پڑاؤ سے ایک قاصد چتوڑ کے مرکزی دروازے کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے پاس ایک خط تھا جس میں بعض روایات کے مطابق اہل چتوڑ کو مخاطب کیا گیا تھا کہ اگر وہ اپنے بادشاہ کو زندہ واپس چاہتے ہیں تو رانی پدمنی کو اس کے حوالے کردیا جائے۔

بعض تاریخ دانوں کے مطابق خط براہ راست رانی پدمنی کو لکھا گیا کہ اس کے شوہر کو یرغمال بنالیا گیا ہے۔ خط میں مطالبہ کیا گیا کہ رانی پدمنی خود کو سلطان کے حوالے کردے۔ بہ صورت دیگر رانا کو قتل کردیا۔ خط میں سلطان نے واضح طور پر رانی کی تعریف کی۔ اس کے حسن و جمال کو سراہا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ چتوڑ چھوڑ کر اس کے پاس آجائے۔ خط میں رانی پدمنی کو دعوت دی گئی کہ وہ اس کے ساتھ دہلی چلے جس کے بدلے میں سلطان نہ صرف اس کی بدعہدی معاف کردے گا بلکہ اس کے شوہر رانا اول رتن سنگھ کو رہا کرکے چتوڑ اس کے حوالے کردے گا۔

سلطان کے خط سے رانی پدمنی کے ان تمام بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوگئی جو اس نے سلطان کی نیت کے حوالے سے اپنے شوہر کے سامنے کیے تھے۔ پہلے وہ اپنے اور اپنی عزت کے لیے پریشان تھی اور اب شوہر کے لیے۔ وہ غیرت مند راجپوتوں کی بیٹی تھی اس لیے خود کو کسی ہوس پرست کی بھینٹ چڑھانے کو تیار نہیں تھی لیکن رانا راول رتن سنگھ اس کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ اس کے لیے کسی بھی حد سے گزر سکتی تھی۔

سلطان کا قاصد جواب لے جانے کے لیے موجود تھا۔ رانی پدمنی نے سلطان کی شرائط ماننے کا فیصلہ کیا۔ وہ خط کا جواب لکھنے بیٹھی تو اچانک اسے خیال آیا کہ اب تک تو اہل چتوڑ اور رانا کے درباریوں کو بھی اس سانحے کی اطلاع ہوچکی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ عزت بیچ کر شہر کا سودا کرنے کے فیصلے سے انہیں بھی آگاہ کردیا جائے۔ اس نے سلطان کے قاصد کو طلب کیا اور چہرے پر ممکنہ متانت اور صبر و سکون سجا کر اسے حکم دیا کہ وہ اپنے پڑاؤ میں واپس جائے اور سلطان کو رانی کی جانب سے نیک تمناؤں کا پیغام پہنچائے جبکہ سلطان کے خط کا جواب کچھ ہی دیر میں چتوڑ کے پیغامبر کے ذریعے سلطان کی خدمت میں پہنچادیا جائے گا۔

قاصد کی روانگی کے بعد رانی نے اپنے ماموں گورا (بعض جگہوں پر اسے گورا بھی لکھا گیا ہے) کو بلا بھیجا جو چوہان راجپوت تھا۔ اسے رانا کی گرفتاری کی اطلاع مل

چکی تھی تاہم ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ یرغمال کی رہائی کے لیے شرائط بھی پیش کی جاچکی ہیں۔ رانی بے تابی سے گوہرا کی منتظر تھی چنانچہ جب وہ آیا تو رانی نے اسے تمام صورت حال سے مطلع کیا۔ گوہرا کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کا مالک ایسی رکیک حرکت کرسکتا ہے لیکن سلطان کے تحریری خط کا ایک ایک لفظ رانی پدمنی کے بیان کی تصدیق کررہا تھا۔

رانی پدمنی نے اسے بتایا کہ اس نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے سلطان کی شرائط تسلیم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے کیونکہ بہ ظاہر اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ گوہرا اپنی بھانجی کی بات سن کر پہلے تو بھڑکا لیکن پھر خاموش ہوگیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ رانی پدمنی نے اس کے طویل استغراق میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔

"راجپوتوں کی غیرت مند عورتیں اپنی عزت کا سودا نہیں کرتیں، پدمنی!" گوہرا بول اٹھا۔

"تو اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟" رانی پدمنی کے خوب صورت چہرے پر فکر و تردد کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ "سلطان کی فوجیں طویل عرصے سے باہر موجود ہیں اور مجھے علم ہوا ہے کہ قلعے کے اندرونی حالات خراب ہوتے جارہے ہیں۔ شاید ہم اس محاصرے کو مزید برداشت نہ کرسکیں۔ اس لیے..."

"نہیں۔" گوہرا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے رانی پدمنی کی بات کاٹ دی "ہم اس طرح ہار نہیں مانیں گے۔ اب تک ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ کسی راجپوت عورت نے اپنی عزت کے بدلے شہر یا شوہر بچایا ہو۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" رانی نے مختصر سا سوال کیا۔

"تم اپنے حوصلے مضبوط رکھو اور باقی مجھ پر چھوڑ دو!" گوہرا نہایت اطمینان سے بولا۔

رانی نے اس مرتبہ محض سوالیہ انداز سے ہی اپنے ماموں کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"میں صبح خود سلطان خلجی کے پڑاؤ میں جاؤں گا۔" گوہرا کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ "راول رتن سنگھ کو رہا کرانے... میرا نہیں خیال کہ سلطان اس قدر بہادر ہوگا کہ میرا راستہ روک سکے۔"

"مگر یہ سب ہوگا کیسے؟" رانی کا ایک ہی سوال تھا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" گوہرا نے جواب دیا۔ "تیاری کے لیے میرے پاس پوری رات باقی ہے۔"

اسی اثنا میں رانی کا بھائی بادل (بعض جگہ اسے رانی کا بھانجا یا بھتیجا بھی لکھا گیا ہے) بھی آگیا جس کی عمر محض سولہ سال تھی۔ وہ بھی شریک گفتگو ہوگیا جب اسے صورت حال کا علم ہوا تو اس نے بھی گوہرا کی تائید کی اور رانی سے کہا کہ اب اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ باقی کام وہ خود سنبھال لیں گے۔

"میں خود بھی صبح گوہرا کے ساتھ جاؤں گا اور سلطان کو بتاؤں گا کہ راجپوت عورت کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کے خواب دیکھنے والوں کے ساتھ ہم کیا سلوک کرتے ہیں۔" بادل دانت پر دانت جما کر بولا۔

رانی پدمنی کے حوصلے بھی بلند ہوگئے تھے۔ اب اسے امید پیدا ہوچکی تھی کہ نہ صرف اس کی عزت محفوظ رہے گی بلکہ اس کا شوہر بھی بہ خیر و عافیت لوٹ آئے گا۔

گوہرا اور بادل کے ساتھ مشورے کے بعد رانی نے اپنی حکمت عملی ترتیب دے لی جبکہ وہ دونوں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کی ضروری تیاریوں کے لیے واپس چلے گئے۔

ذرا دیر بعد رانی پدمنی کا قاصد سلطان علاؤالدین خلجی کے پڑاؤ کی جانب جارہا تھا۔

قاصد کے پاس رانی پدمنی کا ذاتی خط موجود تھا جس پر سلطان کو آگاہ کیا گیا تھا کہ اسے سلطان کی شرط منظور ہے اور وہ کل صبح اپنی سات سو باندیوں کے ہمراہ اس کی قدم بوسی کے لیے آرہی ہے۔ خط میں تحریر تھا کہ تمام خواتین پالکیوں میں سوار ہوں گی اور پردہ ہوں گی اس لیے کسی مسلمان سپاہی کو پالکی میں جھانکنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ رانی پدمنی نے لکھا تھا کہ اب

چونکہ میں سلطان کے حرم میں شامل ہونے جارہی ہوں اس لیے کسی اور کا مجھے یا میری باندیوں کو دیکھنا سلطان کو پسند بھی نہ ہوگا۔ مسلمان سپاہیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے سلطان کی عزت کو دیکھنے کے بجائے اس کی حفاظت کریں۔

رانی پدمنی نے اپنے خط میں لکھا کہ اب وہ چتوڑ اور چتوڑ کے رانا کو خیرباد کہہ رہی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میں سلطان کی خدمت میں حاضری دینے سے قبل آخری بار اپنے شوہر رانا راول رتن سنگھ سے ملاقات کرلوں۔ امید ہے کہ سلطان میری اس خواہش کو رد نہیں کریں گے۔

خط سلطان کے پاس پہنچا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے خوابوں کی رانی اس کے پاس آرہی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا وہ اسے حاصل ہورہا تھا چنانچہ اس نے رانی کے قاصد کے ہاتھوں جواب بھیجا کہ اسے رانی کی کسی شرط پر کوئی اعتراض نہیں۔ اسے مکمل عزت و احترام دیا جائے گا اور کوئی اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ وہ ابھی سے خود کو شاہی حرم کا حصہ سمجھے اور جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرے کیونکہ سلطان بے قراری سے اس کا منتظر ہے۔

اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے ایک سو پچاس شاہی پالکیاں قلعہ چتوڑ کے مرکزی دروازے سے باہر برآمد ہوئیں جنہیں راجپوت سپاہیوں نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ ویسے تو ہر پالکی قیمتی کپڑے سے ڈھکی اور خوب سجی سنوری تھی لیکن درمیان کی ایک پالکی کو یہ طور خاص سجایا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ یہ چتوڑ کی مہارانی پدمنی کی پالکی ہے۔ ہر پالکی کو دو کہاروں نے اٹھا رکھا تھا اور وہ ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کا رخ خلجی افواج کے پڑاؤ کی جانب تھا۔

سلطان علاؤالدین خلجی نے رات ہی اپنے ایک رسالے کو رانی پدمنی کی آمد سے آگاہ کردیا تھا چنانچہ سلطان کا ایک گھڑ سوار دستہ محفوظ فاصلے پر قافلے کا منتظر تھا۔ ابھی چونکہ روشنی بھی نمودار ہونا باقی تھی اس لیے سلطان کی فوج کے صرف پہرے دار جاگ رہے تھے جبکہ باقی سپاہی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ سلطان نے البتہ رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ وہ لباس فاخرہ زیب تن کیے اپنی سلطنت کی سب سے حسین و جمیل عورت کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

چتوڑ کے سپاہیوں نے دور سے ہی سلطان کے گھڑ سوار دیکھ لیے تھے چنانچہ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر وہ رک گئے اور پالکیاں زمین پر رکھ دی گئیں۔ سلطانی گھڑ سواروں نے آگے بڑھ کر پالکیوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ سلطان نے چونکہ حکم دیا تھا کہ پالکیوں کے اندر وہ خواتین موجود ہیں جو اس کے حرم میں شامل ہونے کے لیے آرہی ہیں اس لیے ان کا احترام کیا جائے اور کوئی سپاہی پالکی کے اندر جھانک کر شاہی خواتین کی بے حرمتی نہ کرے۔

سلطانی سپاہ نے ایسا ہی کیا۔ کہاروں نے پالکیاں دوبارہ اٹھالیں اور سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ اب ان کے محافظ سلطان کے گھڑسوار تھے۔

سلطانی افواج کے پڑاؤ میں خبر ہوگئی کہ چتوڑ کی رانی پدمنی، سلطان علاؤالدین خلجی کے حرم میں شامل ہونے کے لیے آرہی ہے چنانچہ وہاں بھی استقبال کی تیاریاں شروع کردی گئیں لیکن معاملہ چونکہ خواتین کا تھا اس لیے مخصوص سپاہیوں کے علاوہ کسی اور کو قافلے کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔

رانا راول رتن سنگھ کو چونکہ رانی پدمنی کے بدلے رہا کیا جانا تھا اس لیے اسے بھی جگا دیا گیا۔ اس نے اپنے خیمے سے جب شاہی پالکیوں کو خلجی افواج کی جانب تے دیکھا تو دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے رانی پدمنی کی پالکی بھی صاف دکھائی دے رہی تھی جسے وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی رانی نے اس پر سلطان کو ترجیح دے دی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ پدمنی نے ایک ہی رات میں اتنا بڑا فیصلہ کرڈالا۔

رانی پدمنی نے سلطان کی خدمت میں حاضری

سے پہلے چونکہ اپنے شوہر سے الوداعی ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اس لیے پالکیوں کا قافلہ پہلے اس خیمے کے دروازے پر پہنچایا گیا جس میں رانا راول رتن سنگھ کو قید رکھا گیا تھا۔ سلطانی افواج کا گھڑ سوار دستہ پیچھے رہ گیا تاکہ رانی اور اس کی کنیزوں کی بے پردگی نہ ہونے پائے۔ کہاروں نے پالکیاں خیمے کے باہر زمین پر رکھ دیں لیکن پدمنی کی پالکی کو رانا راول رتن سنگھ کے خیمے کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اس وقت خیمے میں رانا تنہا تھا۔

اس سے پہلے کہ رانا راول رتن سنگھ کچھ بولتا یا کہتا' پالکی کا پردہ اٹھا اور کپڑوں میں لپٹی رانی پدمنی باہر نکل آئی۔۔۔ لیکن جب رانی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا تو رانا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ رانی نہیں بلکہ اس کا ماموں گوہرا تھا۔

مارے حیرت کے رانا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

گوہرا کے دونوں ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ اس نے رانا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"میرے ساتھ ڈیڑھ سو پالکیاں ہیں۔" گوہرا نے سرگوشی میں رانا کو آگاہ کیا "ہر پالکی میں میری طرح دو تلواریں لیے ایک راجپوت جنگ جو موجود ہے جبکہ ہر پالکی کے ساتھ آنے والے دونوں کہار بھی سپاہی ہیں۔" رانا خاموشی اور حیرت سے گوہرا کی گفتگو سن رہا تھا۔ "اب یہ تمام پالکیاں سلطانی حرم کے پاس لے جائی جائیں گی اور فطری طور پر سب کی توجہ اسی طرف مبذول ہوگی۔ آپ نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر پڑاؤ سے فرار ہونا ہے۔ آپ کا گھوڑا اب بھی خیمے کے باہر موجود ہے لہٰذا ہماری فکر کیے بغیر آپ چتوڑ پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہم زندہ رہے تو آپ سے آملیں گے۔"

گوہرا' حیران و پریشان رانا کو چھوڑ کر دوبارہ پالکی میں جا بیٹھا اور کچھ ہی دیر میں تمام پالکیوں کو اس جانب لے جایا گیا جہاں سلطان اور اس کے حرم کے خیمے استادہ تھے۔

گوہرا کے تجزیے کے عین مطابق تمام فوج اور محافظ قافلے کی آؤ بھگت میں لگ گئے۔ رانا راول رتن سنگھ نے اپنے حلیے میں ذرا سی تبدیلی کی تاکہ کوئی پہلی نظر میں اسے پہچان نہ سکے۔ باہر اس کا گھوڑا موجود تھا وہ ایک ہی جست میں اس کی پشت پر تھا۔ گھوڑا اپنے سوار کو پہچانتا تھا۔ جیسے ہی رانا نے اس کی باگوں کو جھٹکا دیا وہ کسی آندھی کی طرح اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہوگیا جو کہ ظاہر ہے کہ چتوڑ تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی اور پھرتی سے ہوا کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔

رانا راول رتن سنگھ بہ حفاظت سلطانی افواج کے پڑاؤ سے نکل آیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چتوڑ کے سپاہیوں نے پالکیاں سلطانی افواج کے حوالے کی تھیں۔ سپاہی وہیں موجود تھے چنانچہ انہوں نے بڑھ کر راجا کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

دوسری جانب گوہرا کے اشارے پر تمام پالکیوں سے راجپوت جنگ جو تلواریں سونتے باہر نکل آئے۔ کہاروں نے بھی تلواریں اٹھالیں اور سلطان کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔

بعض روایات میں ہے کہ ہر پالکی میں چار چار جنگ جو سوار تھے اور چار افراد نے ہی پالکی اٹھا رکھی تھی جبکہ کچھ تواریخ میں ہے کہ پالکیوں میں چھ چھ راجپوت موجود تھے۔ بہرحال فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سلطان کی فوج چونکہ اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی اس لیے قدرتی طور پر اس کا ابتدائی نقصان زیادہ تھا۔ بعض تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس "شب خون" میں سلطان علاؤالدین خلجی کے سات ہزار بہترین سپاہی مارے گئے جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ مرنے والے راجپوتوں کی تعداد سات ہزار سے زائد تھی۔

گوہرا اور بادل بے حد بہادری سے لڑے۔ بادل تو سلطان کے خیمے کے باہر موجود سپاہیوں سے لڑتا رہا لیکن گوہرا ننگی تلوار لیے سلطان کے خیمے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ نہتا سلطان اس کے سامنے تھا۔ گوہرا نے سلطان کو قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن اس لمحے سلطان نے اپنی ایک کنیز کو اپنے

سامنے کرکے ڈھال بنالیا۔ اس کا تلوار بہ دست ہاتھ فضا میں ہی معلق تھا اور وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ سلطان کو کنیز سمیت موت کے گھاٹ اتار دے یا چھوڑ دے۔

بس یہی چند ثانیے سلطان کی زندگی بچا گئے۔

اتنی دیر میں سلطان کے محافظ خیمے میں داخل ہوگئے اور بیک وقت کئی تلواریں عقب سے گوہرا کے بدن کو چیرتی چلی گئیں اور دلیر راجپوت کئی ٹکڑوں میں تبدیل ہوکر زمین پر آرہا۔

موت ٹلی تو سلطان کو باہر کی فکر ہوئی۔ وہ مسلح ہوکر باہر آیا۔ تب تک راجپوتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاچکا تھا لیکن خود اس کے بھی ہزاروں جاں نثار گوشت اور خون کے لوتھڑوں میں تبدیل ہوچکے تھے۔ سلطان' رانا اول رتن سنگھ کے خیمے کی جانب لپکا لیکن خالی خیمے نے اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

غصے میں بپھرے ہوئے سلطان نے چتوڑ پر بھرپور حملے کا حکم دے دیا چنانچہ سلطانی افواج پوری قوت کے ساتھ چتوڑ پر ٹوٹ پڑیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ معرکہ کئی روز جاری رہا لیکن فریقین میں کسی کو فتح حاصل نہ ہوسکی۔ دونوں جانب سے ہزاروں افراد اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے لیکن چتوڑ کا قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ اس جنگ میں سلطانی افواج چونکہ قلعے سے باہر تھیں اس لیے انہیں ہر طرح کی رسد اور کمک دستیاب تھی لیکن قلعہ بند اہل چتوڑ رفتہ رفتہ کمزور پڑتے جارہے تھے۔ رانا اول رتن سنگھ کی فوجوں نے گو مکمل بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن سلطانی افواج کی تعداد بہت زیادہ تھی اور قلعے کے وسائل ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتے جارہے تھے۔

رانا اول رتن سنگھ نے اپنے امرا اور درباریوں سے دگرگوں ہوتی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا تو سب نے بیک زبان ہوکر صرف اور صرف لڑتے رہنے کا فیصلہ سنایا۔ راجپوت سرداروں نے حتمی طور پر اپنے راجا کو آگاہ کردیا کہ ہتھیار کسی بھی صورت نہیں ڈالے جائیں گے اور جب تک قلعے میں آخری راجپوت بھی موجود ہے' جنگ جاری رہے گی۔

مزید دو ہفتے گزر گئے اور صورت حال بد سے بدترین ہوگئی۔

اہل چتوڑ کے نقصان میں بے اندازہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف ان کی تعداد کم ہورہی تھی بلکہ قلعے کے وسائل بھی ختم ہونے کے قریب تھے۔ رانا اول رتن سنگھ نے ایک بار پھر اپنے سرداروں کا اجلاس طلب کرلیا۔ صورت حال کا پوری تفصیل سے جائزہ لیا گیا لیکن اس بار بھی ہتھیار ڈالنے کو خارج از امکان قرار دے دیا گیا۔ اس کے بجائے فیصلہ کیا گیا کہ قلعے کے تمام جنگ جو اور جوان افراد قلعے کے دروازے کھول کر کھلے میدان میں موجود سلطانی فوج پر حملہ کردیں اور آخری راجپوت کے زندہ رہنے تک اس جنگ کو جاری رکھا جائے۔

رانی پدمنی کو جب علم ہوا کہ اہل چتوڑ نے قلعے سے باہر جاکر لڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس نے بھی اپنے تئیں یہ سوچ لیا کہ وہ اپنے انداز سے یہ جنگ لڑے گی۔ اسے علم تھا کہ چتوڑ جنگ ہار جائے گا لیکن وہ اپنی جنگ نہیں ہارنا چاہتی تھی۔ رانی نے اپنے قابل اعتماد سرداروں اور جرنیلوں کی بیگمات کو بلا بھیجا اور طویل مشورے کے بعد انہوں نے ایک ایسا متفقہ فیصلہ کرلیا جو ان کی دانست میں راجپوتوں کی غیرت و عزت کے عین مطابق تھا۔

باہر جنگ جاری تھی جبکہ سلطانی افواج نے قلعے کا محاصرہ بھی کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود بعض خفیہ راستے ایسے تھے جہاں سے نکلا جاسکتا تھا۔ رانی پدمنی کی ہدایات کے عین مطابق شاہی خاندان' امرائے دربار' راجپوت سرداروں اور سپاہیوں کے ننھے بچوں کو قلعے سے باہر لے جانے کا عمل شروع ہوگیا۔ ہر خاندان کے معمر ترین افراد کو ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا فرض سونپا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ ان بچوں کو راجپوتوں کے تمام تر وقار اور رسوم و رواج کے ساتھ پروان چڑھائیں' انہیں ذہن نشین

کرائیں کہ بڑے ہو کر انہوں نے اپنے اجداد کا بدلہ لینا ہے جنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر جانیں قربان کرنے سے ذرا بھی دریغ نہیں کیا۔

بچوں کی قلعے سے منتقلی مرحلہ وار عمل میں آئی تاکہ قلعے سے ہونے والی نقل و حرکت کو دشمنوں سے پوشیدہ رکھا جاسکے۔ پہلے مرحلے میں عام سپاہیوں کے بچوں کو قلعے سے باہر بھیجا گیا۔ اس کے بعد سرداروں اور امرائے دربار کے بچے اور سب سے آخر میں شاہی خاندان کے بچوں کو محفوظ مقامات پر پہنچایا گیا۔

اس وقت تک جنگ کے حوالے سے خبریں یہ تھیں کہ قلعے میں موجود خوراک کے ذخائر تقریباً ختم ہوگئے تھے البتہ پانی باقی تھا لیکن پانی کے سہارے کتنے دن جیا اور لڑا جاسکتا تھا۔ رانا راول رتن سنگھ کے سپاہیوں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی تھی چنانچہ رانا نے حتمی طور پر حکم دے دیا کہ قلعے کے دروازے کھول دیے جائیں اور چتوڑ کے تمام افراد تلواریں سونت کر باہر موجود دشمن پر حملہ کردیں۔ رانا نے اپنے سپاہیوں پر واضح کردیا تھا کہ چتوڑ سے نکلنے والا کوئی شخص زندہ شہر میں واپس نہیں آئے گا۔ دشمن فتح مند رہا تو وہ چتوڑ پر قبضہ کرلے گا اور اگر میدان اہل چتوڑ کے ہاتھ رہا تو پھر آنے والی کئی صدیوں تک انہیں اس شہر سے بے دخل کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ مگر رانا کو علم تھا کہ دشمن ہی فتح مند ہوگا۔

پدمنی بھی جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی شکست اب ایک دو دن کی بات ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ دشمن ان سے کوئی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ شکست کے بعد خواتین کے ساتھ جو سلوک ہونا تھا پدمنی کو اس کا بھی علم تھا۔ صدیوں سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ فاتحین، مفتوح خواتین کی آبرو ریزی کرتے تھے اور ان سے وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا لیکن رانی پدمنی اپنی عصمت دری اور چتوڑ کی تباہی کا تماشا دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ تمام بچے قلعے سے باہر بھیجے جاچکے تھے اور اس تک یہ پیغامات بھی پہنچ چکے تھے کہ وہ سب محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ بعض خواتین بھی بچوں کے ساتھ گئی تھیں لیکن وہ معمر یا ادھیڑ عمر خواتین تھیں جبکہ جوان عورتیں اب بھی قلعے میں موجود تھیں۔

26 اگست 1303ء کو صبح کا سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے رانی پدمنی نے اپنے قابل اعتماد خدمت گاروں کو بلا کر ایک بہت بڑی چتا روشن کرنے کا حکم دیا۔

چتا کے لیے رانا راول سنگھ کے محل کے ایک وسیع و عریض کمرے کو منتخب کیا گیا جس کا ایک ہی دروازہ تھا۔ رانی نے چند محافظوں کو دروازے پر تعینات کیا اور خود تیار ہونے چلی گئی۔ اس نے قلعے کی تمام خواتین کو حکم بھیجا کہ وہ بھی جلد از جلد محل پہنچنے کی کوشش کریں۔ جب صبح کے آثار نمودار ہوئے تو طلب کی جانے والی تمام خواتین نے محل پہنچنا شروع کردیا۔ ان میں راجپوت، سرداروں اور امرائے دربار کی بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں شامل تھیں۔

ان خواتین کے ننھے بچے پہلے ہی قلعے سے باہر بھیجے جاچکے تھے جبکہ اپنے جوان بچوں، شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں سے وہ آخری ملاقات کر کے محل پہنچی تھیں۔ تمام شادی شدہ خواتین اپنے عروسی جوڑوں میں ملبوس تھیں اور سب نے دلہنوں کا سنگھار کیا ہوا تھا۔ کنواری لڑکیاں بھی زرق برق ملبوسات پہنے ہوئے تھیں جبکہ وہ بھی سجی سنوری ہوئی تھیں۔ ذرا دیر بعد رانی پدمنی بھی آپہنچی۔ اس نے بھی وہی کپڑے زیب تن کر رکھے تھے جو محض چند سال قبل اس نے اپنی شادی کے موقع پر پہنے تھے۔ اس نے بھی دلہنوں کا سا سنگھار کیا ہوا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور نمی تھی۔ راجپوت عورتوں کی طرح اس کا سر فخر سے بلند تھا لیکن اپنے شوہر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا بہرحال اسے دکھ تھا۔

رانا راول رتن سنگھ نے آخری اور الوداعی ملاقات میں اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ پدمنی محض اس کی بیوی نہیں بلکہ محبوبہ بھی تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کے لیے سب کچھ کرسکتا تھا لیکن پدمنی نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ جس جسم کو اس

نے چھوا ہو وہ اسے کسی اور کے حوالے کرنے کے تصور بھی نہیں کر سکتی۔

رانا کو اندازہ ہو گیا کہ پدمنی اپنے فیصلے پر اٹل ہے چنانچہ اس نے اپنی بیوی کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دے کر رخصت کی اجازت مرحمت فرمادی۔

رانی نے چتا والے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک بار الوادعی نگاہوں سے وہاں موجود لوگوں کو دیکھا اور پلٹ کر اندر داخل ہو گئی۔ تمام عورتوں نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کا واحد دروازہ بند کر دیا گیا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ کمرے سے ایک چیخ بھی بلند نہیں ہوئی تاہم گوشت کی بو اور جلنے سے پیدا ہونے والی چراند سے علم ہوا کہ اندر کیا ہو گزرا ہے۔

چتوڑ کے حسن نے خود کو آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اب راجپوت اپنے فیصلے کے لیے آزاد تھے۔ ان کی زنجیروں کو شعلوں نے نگل لیا تھا۔ رانا راول رتن سنگھ کے حکم پر تمام مردوں نے زعفرانی کپڑے پہن لیے اور قلعے کے دروازے کھول کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

گھمسان کی جنگ ہوئی تھی لیکن کوئی راجپوت زندہ نہ بچ سکا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی نے چتوڑ فتح کر لیا اور سلطانی افواج ندیدے گدھوں کی طرح شہر میں داخل ہو گئیں۔ سپاہیوں کو مال و دولت کے علاوہ حسین راجپوت عورتوں کی تلاش تھی جن سے وہ اپنی بھوک کو مٹا سکتے لیکن انہیں کوئی عورت نہ مل سکی کیونکہ وہ سب کی سب آگ میں کود کر راکھ بن چکی تھیں۔

سلطان خلجی کو اجتماعی خودکشی کی بابت بتایا گیا تو وہ بھی ول مسوس کر رہ گیا۔ اس نے پدمنی کی خاطر چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن پدمنی اس سے بہت دور جا چکی تھی..... اس نے پدمنی کے شہر کو تو قبضہ کر لیا تھا لیکن خود پدمنی کو حاصل نہ کر پایا۔

چنانچہ سلطان علاؤ الدین خلجی کو کامیاب ہو کر بھی چتوڑ سے ناکام لوٹنا پڑا۔

رانی پدمنی کی کہانی کئی روایات، حکایات اور ناولوں کے علاوہ فلموں کا موضوع رہی ہے لیکن بدقسمتی سے اس بہادر ملکہ کی کوئی تصویر یا عکس کہیں محفوظ نہیں۔

☆ ☆

ستر سالہ دل

ایک دولت مند آدمی کا دل کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اپنا دل تبدیل کرالیں۔

اس کی رضا مندی پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''میرے پاس تین افراد کے دل دستیاب ہیں۔ اب ان میں سے آپ کون سا دل پسند کریں گے؟ ایک سولہ سالہ نوجوان کھلاڑی کا دل۔ ایک بیس سالہ رقاصہ کا دل اور ایک ستر سالہ انکم ٹیکس آفیسر کا دل۔

''انکم ٹیکس آفیسر کا دل۔'' مریض نے انکم ٹیکس آفیسر کا دل پسند کیا۔

آپریشن کامیاب رہا۔ جب ان سے پوچھا گیا انہوں نے ستر سالہ دل کیوں پسند کیا تو اس نے جواب دیا۔

''میں وہ دل چاہتا تھا جو پہلے استعمال نہ ہوا ہو۔''

تیری دیوانی

سدرہ محمود

محبت ایک ناقابل فراموش جذبہ ہے۔ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ کس کو چاہے اور جواباً اسے بھی چاہا جائے کچھ لوگ اس قدر حقیقت پسند ہوتے ہیں کہ وہ محبت جیسے طاقت ور جذبے کو وقت کاریاں سمجھتے ہیں۔ لیکن محبت اپنا آپ مزدور منوالیتی محبت جیسے لافانی جذبے پر ہر شخص کا تجربہ الگ ہے۔

ایک حساس دوشیزہ کی کتھا جوہر صورت محبت آشنا ہونا چاہتی تھی

"کیا ہوا سارہ بیگم ابھی تک علیزے اور دانش نہیں آئے۔" عارف کھانے کے ٹیبل پر آنے لگا تھا۔ لیکن وہاں سارہ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔

"ہاں وہ آتے ہی ہوں گے۔ لو دانش تو آگیا۔" سارہ کی نظر سامنے سے آتے دانش پر پڑی۔

"گڈ مارننگ پاپا۔" دانش بولتے ہی کرسی آگے کر کے بیٹھ گیا۔ "اتنی دیر کہاں لگادی ٹائم دیکھا ہے آٹھ بج رہے ہیں۔" عارف نے ہاتھ اٹھا کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری ڈیڈ! چلیں ناشتہ شروع کرتے ہیں پھر آفس بھی جانا ہے۔"

"ہاں آپ ناشتا کریں وہ بھی آجائے گی۔" سارہ نے دونوں باپ بیٹے کو کھانا دینے کے بعد اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگی۔

"ہائے ماما گڈ مارننگ ڈیڈ۔" علیزہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ہی آئی تھی اور خود ہی بیٹھ کر گلاس میں جوس ڈال کر پینے لگی۔ "کیسی چل رہی ہے پڑھائی۔" عارف نے علیزہ کی طرف دیکھا۔

"اچھی جا رہی ہے ساحر سے تو روز ملتی ہوگی۔" علیزہ نے ساحر کا نام سنتے ہی چمچہ نیچے رکھ دیا۔ "دیکھو علیزے میں نے تمہیں پورا ایک مہینہ دیا تھا۔ سوچنے کے لیے تو اب بتاؤ کیا ہے تمہارا جواب۔"

"ڈیڈ پلیز میں ابھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ تم کیا چاہتی ہو کیا نہیں مجھے تمہاری شادی جلدی کرنی ہے پہلے ہی اتنے مہینے گزر گئے ہیں۔"

"اوکے ماما مجھے دیر ہو رہی ہے۔" عارف ابھی بات کر ہی رہا تھا کے اس نے غصے سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف چل دی۔

"رکو علیزے بہت ہوا تمہارا ڈرامہ میں اگلے مہینے تمہاری شادی پکی کر رہا ہوں۔" عارف نے اسے پیچھے سے ہی بولا تھا۔ لیکن وہ بنا سنے ہی باہر نکل گئی۔ دیکھا تمہیں کیسے اگنور کر کے چلی گئی۔" اس کے جاتے ہی عارف غصے سے سارہ کو باتیں سنانا شروع کر دیں۔ "اسے سمجھاؤ ورنہ یہ نہ ہو کے مجھے اس کی شادی زبردستی کروانی پڑے سمجھیں تم۔" عارف نے زور سے چمچہ پلیٹ میں مارا تھا جس سے سامنے بیٹھی سارہ ڈر گئی۔

☆ ☆ ☆

"دانش کہاں ہے جلدی بلاؤ اسے مجھے کالج کے لیے نکلنا ہے۔"

"بندا حاضر ہے بیگم صاحبہ۔" اذان آتے ہی بولا تو اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔ "کہاں رہ گئے تھے تم چلو جلدی سے پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔" اس نے بولتے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ اذان بھی اس کے بیٹھتے ہی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ "کیا ہوا بیگم صاحبہ آج پھر کوئی بات ہوئی ہے۔" اذان نے شیشے سے اسے دیکھا جو اپنے فون میں مصروف تھی۔

"اور کوئی بات ہو تو بتاؤں ایک ہی بات شادی کرلو شادی کرلو۔" علیزہ کے کہتے ہی سامنے بیٹھا اذان ہنسنے لگا۔

"تو کرلو شادی اس میں کیا خرابی ہے۔" تم بھی تو میرے دوست ہو، میری سائیڈ پر ہونے کی بجائے تم ڈیڈ کی سائیڈ لے رہے ہو کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"

"شادی تو ہر کسی کو کرنی ہے۔"

"اچھا تو پھر تم نے ابھی تک کیوں نہیں کی۔" کی ہے نہ ماشا اللہ سے دو بچے ہیں میرے اتنی خوب صورت بیوی ہے میری۔" اذان کی بات سنتے ہی علیزہ ہنسنے لگی۔

"اچھا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پتا ہے جتنا میں تمہیں جانتی ہوں شادی کیا لڑکی بھی نہیں دیکھی ہوگی آنٹی نے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ سب مجھے ہنسانے کے لیے بول رہے ہو۔" اذان نے بیچ میں اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا تھا۔

"اذان پتا ہے تم سے بات کرنے کے بعد میرا موڈ

ایک دم ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اب آپ کا موڈ خراب ہونے والا ہے۔ کیوں کے ہم پہنچ گئے ہیں۔" اذان نے اس کے کالج کے سامنے کار روکی تو وہ باہر نکل کر کالج کا گیٹ پار کر گئی وہ ابھی بھی وہی کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بیگ میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے جا رہی تھی کہ اچانک ساحر سامنے آ کھڑا ہوا۔ "کہاں رہ گئی تھیں ہونے والی بیوی صاحبہ۔" علیزہ نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور اس کے ساتھ دو اور اس کے لفنگے دوست آج بھی اس کے ساتھ تھے۔

"ہاں تو میں نے کہا کہ تم انتظار کرو تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے جو روز راستہ روک لیتے ہو۔"

"ارے میری جان اب تو تمہارے علاوہ کیا کام ہو سکتا ہے۔" ساحر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑتا اذان نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" ساحر نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ جانتا تھا کے وہ علیزہ کا ڈرائیور ہے۔

"یوں سب کے سامنے کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑنا اچھی بات نہیں ہے۔" علیزہ نے اذان کو دیکھتے ہی اس کے پیچھے چھپ گئی۔

"شاید تم جانتے نہیں کہ یہ لڑکی نہیں میری ہونے والی بیوی ہے۔" ساحر نے غصے سے بولتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہونے والی ہے ابھی ہوئی تو نہیں اور تب تک یہ ہمارے بڑے صاحب کے گھر کی عزت ہے اور ان کی عزت میں کوئی آنچ نہ آنے دیں یہ ہمارا فرض ہے۔"

"ابے تیرے فرض کی تو میں۔" ساحر غصے سے اس کی طرف بڑھا تو اس کے دوستوں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک پل کو تو پیچھے کھڑی علیزہ بھی ڈر گئی تھی۔

"ارے علیزے تم یہاں کیا کر رہی ہو چلو کلاس شروع ہو گئی ہے پیچھے سے اس کی کسی دوست نے اسے آواز دی تھی تو اذان نے اسے آنکھوں کے اشارہ سے جانے کو بولا۔ وہاں کھڑے ساحر نے کلاس شروع ہونے کا سن کر ایک نظر غصے بھری اذان پر ڈالی اور علیزے کے پیچھے چل دیا۔ اذان بھی اس کے جاتے ہی گاڑی میں بیٹھا اور اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل پڑا۔

"اذان وسیم کا بیٹا تھا جو عارف کے ہاں اس کا ڈرائیور تھا۔ اس کی وفات بھی کار ایکسیڈنٹ سے ہی ہوئی۔" اذان کبھی کبھار وسیم کے ساتھ آجایا کرتا تھا۔ علیزہ اور اذان کی دوستی بھی وہیں سے شروع ہوئی لیکن وسیم کے مرنے کے بعد اپنے باپ کی جگہ اس نے لے لی تھی عارف نے اسے اپنے بجائے علیزہ کا ڈرائیور بنا دیا اور اب تک صرف اسے لے جانے اور لانے کا کام وہ کرتا تھا کیا

"آج پھر ساحر نے تمہارا راستہ روکا تھا۔ اور کلاس ختم ہوتے ہی اس کی دوست مونا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میرا تو دل کرتا ہے کہ منہ توڑ دوں اس کا۔"

اچھا اس لیے تم ڈر کر اپنے ڈرائیور کیا نام ہے اس کا اذان اس کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ مونا نے مسکراتے ہی اسے چھیڑا۔

"اوہو میں کسی سے نہیں ڈرتی وہ تو بس اذان کو دیکھنے کے لیے کہا تھا۔"

"کیوں؟" مونا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس طرح وہ سمجھے گا کے ساحر مجھے تنگ کرتا تھا یہاں جو بھی کچھ ہوا مجھے یقین ہے کہ وہ ڈیڈ کو ضرور بتائے گا اور ڈیڈ اس کی بات پر بہت یقین کرتے ہیں تو وہ اس شادی سے انکار کر دیں گے۔ اس نے اپنا سارا پلان اسے بتایا۔

"شاید تم بھول رہی ہو کے یہ شادی ایک بزنس کے طور پر ہو رہی ہے جس سے دونوں کو فائدہ ہونے والا ہے اور تمہارے بھائی دانش کی تو ان کی بیٹی سے انگیج منٹ بھی ہو گئی ہے تو اس طرح تمہاری شادی ساحر کے ساتھ پکی ہے۔" مونا کی بات سن کر علیزہ برا سا منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

گھر واپس پہنچ کر رات کو اسے پھر وہی سننا پڑا جو وہ کبھی بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ سارہ اس کے کمرے میں عارف کے کہنے پر اسے منانے آئی تھی۔

"میں نہیں کرنا چاہتی ساحر سے شادی آپ کیوں نہیں میری بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی۔"

"دیکھو علیزے تمہاری اس ضد سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا اس لیے تم یہ ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتیں' علیزے سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"یہ ضروری نہیں ہے کہ بھائی کی شادی وہاں ہو رہی ہے تو میں ان کی بہو بن کر ان کے گھر چلی جاؤں۔ یہ میری زندگی ہے میں کس سے شادی کروں گی کیسے گزاروں گی اس کا فیصلہ صرف میں کروں گی آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتیں۔"

"علیزے تمہیں پتا ہے کے جب دانش کا رشتہ وہاں طے ہوا تھا تو تمہارے ڈیڈ نے زبان دی تھی کے تم ان کے گھر کی بہو بنو گی اور وہ اپنی زبان کے پکے ہیں وہ جو کہتے وہ بات پتھر پر لکیر کے برابر ہوتی ہے۔" سارہ بھی اس کے پاس بیٹھ کر اسے مسلسل منانے کی کوشش میں لگی تھی۔

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کے ڈیڈ نے کیا کہا ہے اور اگر آپ نے مجھے زیادہ ٹارچر کرنے کی کوشش کی تو میں بھاگ جاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی میں بھی ان کی بیٹی ہوں میں نے صرف کہا نہیں موقع آنے پر کروں گی بھی۔" علیزے نے بولتے ہوئے سارہ کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"اور میں تمہارا باپ ہوں میں جو کبھی کہتا ہوں کر کے ہی دیکھتا ہوں۔" عارف نے دروازے پر کھڑے ہو کر ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ علیزے کے چپ ہوتے ہی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آ کھڑا ہوا اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی صرف اور صرف ساحر سے ہو گی چاہے وہ جیسا بھی ہو۔"

"آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے ڈیڈ" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کرنے کو تو ابھی تمہارا نکاح پڑا سکتا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کروں گا۔ اور ابھی میں بھی فیصلہ لیا ہے کے تمہاری شادی اسی مہینہ ہو گی۔" عارف نے اپنا فیصلہ بتاتے ہوئے ایک نظر علیزے اور ایک نظر سارہ پر ڈالتے ہی باہر چل دیا۔ "آپ ایسا نہیں کر سکتے ڈیڈ!" علیزے اس کے پیچھے ہی سے بول رہی تھی لیکن وہ ان سنی کر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن جب اذان اسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ جو وہ بہت غصے میں بیٹھی کبھی باہر کی طرف دیکھتی تو کبھی اذان کی طرف۔ "آپ پوچھو گے نہیں کہ کیوں غصے میں کیوں ہو۔" اذان نے شیشے سے اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"اچھا بتاؤ کیا ہوا کل رات' وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ لیکن اس بار میں خاموش نہیں رہی میں نے بھی صاف صاف بول دیا کے اگر انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کی تو میں بھاگ جاؤں گی۔"

"پھر تو آپ نے بہت غلط کیا۔"

"ہاں میں جو بھی کرتی ہوں تمہیں غلط لگتا ہے۔ انسان اگر اپنے ماں باپ کے سامنے بولے تو وہ غلط ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی بات کیوں نہ ہو۔ بیگم صاحبہ وہ جو بھی کرتے ہیں۔ ہماری بھلائی کے لیے کرتے ہیں انہوں نے بچپن سے ہماری پرورش کی ہوتی ہے۔ بہت امیدیں ہوتی ہے ہم سے۔ آپ ہی بتا یئے آپ نے کبھی پیار سے بات کرنے کی کوشش کی نہیں۔ اگر آپ پیار سے سمجھاتیں گی تو مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات ضرور سمجھ جائیں گے۔" اذان اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی بات سمجھ رہی تھی۔

"مجھے امید ہے کہ میرے جانے کے بعد اس بات کو ضرور سمجھیں گی پوری بھی کریں گی۔" علیزے نے جانے کی بات کرکے اسے چونکا دیا۔

"کیا مطلب کہیں جا رہے ہو۔"

"ہاں میں گاؤں جا رہا ہوں اور امی سے بھی مل لوں گا۔ اور دوسرا عرفان کو بھی ہوسٹل چھوڑنا ہے مجھے پتا

ہے جب تک اسے چھوڑنے نہ جاؤ وہ نہیں جاتا۔"

"اچھا وہ گھر آیا تھا۔"

"جی اور اب تو اس کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔"

"مجھے کون چھوڑے گا۔" آپ کو اکرم چھوڑ دے گا اور ویسے بھی ایک دن کی تو بات ہے میں کل رات کو واپس آجاؤں گا۔

"اکرم چھوڑ دے گا۔ اس کے ساتھ جانے سے تو اچھا ہے میں دو دن کی چھٹی کر لوں۔

"کیوں کیا ہوا ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہے اور تو اس کا رکھنا اور دوسرا وہ اپنی مونچھوں کو ہر وقت بل دیتا رہتا ہے۔ اور اس راستے سے لے کر جاتا ہے جس کا پتا ہی نہیں ہوتا پوچھنے پر کہتا ہے چھوٹے راستے ہیں جلدی پہنچ جائے گا بیگم صاحبہ مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے اس سے۔" اس نے ایک ہی سانس میں سبھی باتیں اسے سنا ڈالی۔ "اچھا لینے تو آؤ گے نہ۔"

"جی آجاؤں گا۔" اذان نے ہنستے ہوئے گاڑی روک دی تو وہ بیگ اٹھائے ہوئے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اذان علیزے کالج کو چھوڑ کر۔ واپس گھر میں گاڑی کھڑی کر کے جانے ہی والا تھا کے دروازے پر کھڑے عارف نے اسے آواز دی۔

"جی بڑے صاحب کوئی کام۔"

"نہیں کام تو نہیں بات کرنی تھی۔ آؤ بیٹھ کر کرتے ہیں۔ دانش تم بھی آجاؤ۔" عارف نے ساتھ ہی دانش کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جا کر گارڈن میں بیٹھ گئے۔

"دیکھو اذان میں چاہتا ہوں کہ تم علیزے سے بات کرو وہ تمہیں اپنا دوست مانتی ہے وہ تمہاری بات ضرور مانے گی۔"

"ہاں اذان اگر تم کہو گے تو وہ مان جائے گی۔" عارف کے چپ ہوتے ہی دانش نے اس سے کہنا شروع کر دیا۔"

"جی اگر آپ کہتے ہیں تو میں ضرور بات کروں گا۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو وہ لڑکا کچھ میں اس قابل نہیں ہے کہ چھوٹی بیگم صاحبہ کی شادی اس سے ہو۔ وہ لڑکا صحیح نہیں ہے۔" عارف نے اس کی بات سن کر دانش کی طرف دیکھا۔

"ارے اس میں کیا بات ہے پہلے سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد سدھر جائے گا۔ عارف نے بولتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" میں کروں گا بات فی الحال مجھے گاؤں جانا ہے اور آپ کی اجازت چاہیے۔" "ہاں ہاں کیوں نہیں جاؤ اور گاڑی بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بڑے صاحب۔" اذان نے صاف انکار کر دیا۔ "گاڑی تمہیں لے کر جانی پڑے گی اور یہ میرا حکم ہے۔" عارف انگلی اٹھا کر بولا تو اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

علیزے نے بیچ میں اس کے جانے کے بعد رات کو اس کی باتوں پر غور کیا تھا اور صبح اٹھتے ہی ایک پرچی لکھ کر چھوڑ گئی۔ وہ جب پہنچی تو ساحر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"آگئیں تم کیا ہوا؟ آج تمہارے ساتھ وہ عزت دار نہیں ہے۔" ساحر اس کے سامنے آتے ہی بولا اس نے غصے بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "ہائے یہی تو تمہاری ادائیں ہیں جو مجھے مار دیتی ہیں۔" ساحر نے کہتے ہوئے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ آگے چل پڑی تھی لیکن ساحر نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے نزدیک کر لیا۔ "کیا بدتمیزی ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ سب دیکھ رہے ہیں۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی سب کھڑے ہو کر انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

"تو کیا ہوا اپنی ہونے والی بیوی کا ہاتھ پکڑا ہے۔"

"ہاتھ چھوڑو ساحر میرا میں آخری بار بول رہی ہوں۔"

"تو کیا کرو گی اس کے بولتے ہی اگلے پل علیزے کا ہاتھ اس کے گالوں کو چھو کر گزر گیا۔ ایک زوردار تھپڑ ساحر کے منہ پر مارا تھا" سمجھتے کیا ہو خود کو لو یہ کہا کیا ہے۔ ہونے والی بیوی۔ کیا رشتہ ہوا ہے یا ہماری انگیج منٹ ہوئی ہے بولو۔ اگر آئندہ میرا ہاتھ پکڑا تو

مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" سارے ہی ان کا ہونے والا ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی اچھی بھلی بے عزتی کر کے گئی تھی۔

"یہ کیا یار یہ شیرنی کے ہاتھ بھی کھل گئے ہے۔" ساحر کے دوست پاس آن کھڑے ہوئے "ایک بار شادی کر لے پھر اس کا وہ حال کرنا۔" ان میں سے ایک بول ہی رہا تھا کہ ساحر نے ہاتھ آگے اٹھا کر اسے روک دیا۔ "شادی کون کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تو بس اپنے کام سے مطلب ہے اور اب اس شیرنی کا شکار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ تم نے اس ڈرائیور کو روکنا ہے بس ساحر نے مڑ کر ان کی طرف نظر گھمائی۔ ان دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔

✡ ✡ ✡

شام ہونے والی تھی لیکن علیزے ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ سب ہی بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے میں لگے تھے سارہ کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ ڈرائیور سے پوچھا اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ نے کہا تھا کے وہ اسے لینے نہ آئے اسے اپنے دوست کے گھر جانا ہے شام ہونے سے پہلے واپس آجائے گی۔ اب تو شام سے بھی رات ہونے والی تھی دانش نے ہر دوست سے پوچھ لیا تھا۔

"بڑے صاحب یہ پرچی علیزے بیگم کے کمرے سے ملی ہے اور اس پر کچھ لکھا بھی ہے۔" ایک نوکرانی نے اس کے کمرے سے وہ لا کر عارف کو دی۔ تو دانش نے فوری اس کے ہاتھ سے پرچی کھینچ لی اور اسے جانے کے لیے بول دیا۔ پرچی لکھا تھا۔ "سوری مجھے ایسا کرنے پر آپ نے مجبور کیا تھا۔" سب سمجھ گئے تھے کے اس نے اپنا کہا پورا کیا وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔

"دیکھ لیا اپنی بیٹی کو بھاگ گئی ہے۔ ہماری عزت کو خاک میں ملا کر۔" عارف کا غصہ ہمیشہ کی طرح سارہ پر برسنے لگا۔ "ایک بار مل جائے پھر اس کا وہ حال کروں گا۔" دانش غصے سے بولا۔ "نہیں تم نہیں کرو گے جو کرنا ہے اب مجھے کرنا ہے۔ بس ایک بار مل جائے جہاں بھی ملی مار دوں گا۔ اسے اور یہ میں نے کہا نہیں ہے سارہ بیگم کروں گا۔" عارف کے الفاظوں نے سارہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ دی تھی۔ چلو دانش اسے ڈھونڈنا بھی ہے اور یہاں لا کر ریوالور بھی لے لو۔ عارف سارہ کی طرف دیکھ کر بولا تو وہ بس بھیگی پلکوں سے باپ بیٹے کو جاتے دیکھ رہی۔

✡ ✡ ✡

"تو کیسا لگا یہاں آکر۔" جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی کہ سامنے سے دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

"کون ہو تم اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو چاہتے کیا ہو تم۔" وہ ابھی بھی اس کا چہرا نہیں دیکھ پائی تھی۔

"ارے اتنی جلدی بھول گئیں۔ ہماری جان!" علیزے جان گئی تھی کہ وہ ساحر ہی ہے۔ ساحر نے اپنے فون کی لائٹ آن کر کے ٹیبل پر رکھ کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "بہت جلدی پہچان لیا۔"

"مجھے پتا تھا کہ یہ حرکت تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس نے ساحر کے پیچھے کھڑے اس کے دوستوں کو بھی دیکھا۔" چلو شکر ہے کچھ تو میرے بارے میں جانتی ہو پتا ہے۔ علیزے میں یہ سب ابھی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے تھپڑ مار کر اچھا نہیں کیا۔ خیر اس کی سزا تو تمہیں روز ملے گی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کے تم اتنے گھٹیا اور کمینے بھی ہو گے۔ پچھتاؤ گے... بہت پچھتاؤ گے تم دیکھ لینا۔" علیزے نے غصے سے بولتے ہوئے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"اوہ سوری میں تو بھول گیا۔ تمہارے ہاتھ درد کر رہے ہوں گے۔ ارے دیکھ کیا رہے ہو ہاتھ کھولو چلو جلدی سے..." ساحر نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو کہا تو ایک نے جا کر اس کے ہاتھ کھول دیے۔ علیزے نے ہاتھ کھولتے ہی اپنے ہاتھوں کو دباتے ہوئے اٹھ کر

بھاگنے لگی۔ لیکن ساحر نے اسے آگے سے پکڑ لیا۔

کہاں جارہی ہو اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ بھی بتالو۔ ساحر نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے چہرے سے بال پیچھے کیے۔ ”ہاتھ چھوڑو میرا ساحر! میں نے کہا ہاتھ چھوڑو بھی۔ علیزہ نے اس کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب ساری کوششیں ناکام ہوگئی تو اس نے اس کے ہاتھ پر کاٹ دیا جس سے ساحر نے فوری اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”ارے ساحر یہ شیرنی تو کاٹتی بھی ہے۔ اس کا ایک دوست آگے بڑھا۔ ”کیا ہوا جان تم ڈر کیوں رہی ہو میں ہوں تمہارا ہونے والا شوہر ڈر کیوں رہی ہو مجھ سے‘ ساحر بولتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دو قدم آگے ہوتا علیزہ دو قدم پیچھے ہو جاتی۔ وہ جیسے ہی باہر نکلنے کے لیے مڑی ساحر نے اسے کھینچ کر زنزدیک کرلیا۔ وہ اس کے بانہوں کے گھیرے میں تھی۔ بہت مشکل سے اپنے آپ کو اس کی قید سے چھڑایا اور تیزی سے دروازے کی طرح بڑھی اور باہر جاتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ ”شیٹ پاگل ہو گئے ہو ایک لڑکی نہیں سنبھال پائے۔“ ساحر دروازے کو بجانے لگا۔ جلدی سے دروازہ توڑو اور پکڑو اسے ساحر نے پلٹ کر ان دونوں کو کہا تو وہ دروازہ توڑنے لگے۔ علیزہ مسلسل بھاگی جارہی تھی۔ ان جھاڑیوں میں اسے سمجھ بھی نہیں آرہا تھا کے وہ کس طرف جائے۔ ایک جگہ رک کر مدد کے لیے آواز دینے لگی۔

”کوئی ہے۔ ہیلپ میری کوئی مدد کرو۔ کوئی ہے۔“ وہ اونچی اونچی آوازے لگا رہی تھی۔ لیکن اس رات میں اس کی کوئی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو بھوت پریت سمجھ کر چلا جاتا یہیں سڑک کے اس پار ایک قبرستان تھا۔

”علیزہ بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ اس کے کانوں میں اچانک ساحر کی آواز پڑی تھی تو وہ اور بھی تیزی سے بھاگنے لگی۔ بھاگتے ہوئے اس کی چیخ نکل گئی کسی نے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔

اس کا ہاتھ علیزے کے منہ پر تھا اتنا تو وہ جانتی تھی کے وہ جو بھی ہے اسے بچانے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے وہ بھی آرام سے کھڑی رہی۔ پیچھے ساحر اور اس کے دوست رہے تھے۔ اس انسان نے ان سے لڑنے کے بجائے اپنی گھڑی اتار کر ایک سائیڈ پر پھینک دی۔ ساحر اور اس کے دوست اس طرف بھاگ گئے۔ علیزے نے ہاتھ ہٹا کر اس انسان کو دیکھا وہ اور کوئی نہیں بلکہ اذان تھا۔

”اذان تم یہاں؟ علیزہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ ”یہ باتیں بعد میں کریں گے بیگم صاحبہ پہلے یہاں سے بھاگتے ہیں۔“ اذان اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک پر لے آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر فوری بیلٹ باندھ کر گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے نکل پڑا۔ گلا خشک ہونے کی وجہ سے علیزہ کہ ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پارہی تھی اذان نے پانی کی بوتل نکال کر اسے پکڑائی تو اس نے فوری پوری بوتل ساری پی ڈالی سب ٹھیک ہے۔“ اذان کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔ ”تو بتاؤ وہ لوگ کون تھے یہ سب کیا ہے آپ رات کے دو بجے اس جنگل میں کیا کر رہی ہیں۔“

”وہ لوگ ساحر اور اس کے دوست تھے۔ وہ مجھے اغوا کر کے لائے تھے۔“ کیا انہوں نے آپ کو اغوا کیا تھا۔ میں جانتا تھا کے وہ شریف انسان نہیں ہے لیکن اتنا گرا ہوا انسان ہے یہ نہیں جانتا تھا۔ ”لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو میں واپس ہی آرہا تھا گزرتے ہوئے کسی کے چلانے کی آواز آرہی تھی تو دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ اور کوئی نہیں بلکہ آپ ہوگی۔“ اچھا ہوا کہ تم آگئے ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔ ”کچھ نہیں ہوگا اللہ سب کی حفاظت کرنے والا ہے۔ دیکھیے آپ کی مدد کے لیے اس نے مجھے بھیج دیا۔ بیگم صاحبہ آپ کو اکرم نہیں لینے آیا تھا کیا“ اس کا ہی تو انتظار کر رہی تھی کے اچانک ایک گاڑی میرے پاس آکر رکی اور میرے منہ پر کپڑا رکھ دیا جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے میں کرسی سے بندھی تھی۔ وہ ساحر اور

اس کے وہ دونوں دوست تھے۔ جنہوں نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی بہت مشکل سے بھاگی وہاں سے میں۔" آپ فکر نہ کریں گھر پہنچ کر سب کچھ بڑے صاحب کو بتادیں گے وہ خود فیصلہ کریں گے کیا کرنا ہے۔ رونے لگی تھی اس لیے۔ تو ازان نے اسے حوصلہ دیا گھر پہنچتے ازان نے باہر دروازے پر ہی گاڑی روک دی۔ گارڈن میں سارہ کھڑی تھی جو عارف اور دانش کا واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو نہیں آئے لیکن علیزہ گھر آگئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سارہ کے ہوش اڑ گئے وہ فوری نیچے کی طرف بھاگتے ہوئے اس کے پاس آگئی۔

ماما' علیزے اسے پکارتے ہوئے اس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ تم تو بھاگ گئی تھیں نا پھر تم یہاں کیسے۔ سارہ نے اسے فوری اپنے سے الگ کیا۔

"نہیں ماما میں بھاگی نہیں تھی۔" پھر وہ پرچی پر لکھ کر گئی تھیں وہ سب کیا تھا۔" کون سی پرچی' علیزہ کو کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ جس پرچی پر تو میں نے سوری لکھا تھا۔ وہ میں نے بھاگنے کے لیے نہیں لکھی تھی اس پر سوری کہا تھا۔ علیزے نے اس پرچی کا اصل مقصد کیا تھا جو انہوں نے غلط سمجھ لیا تھا۔ "میں بھاگی نہیں تھی مجھے تو ساحر اور اس کے دوستوں نے اغوا کیا تھا۔ اور میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش بھی وہ تو شکر ہے کہ ازان وہاں پر پہنچ گیا پتا نہیں وہ پہلے کتنی لڑکیوں کو اپنے حوس کا شکار بنا چکا ہے۔"

"اچھا پر ہم نے تو سمجھا کے تم بھاگ گئی ہو اور تمہارے ڈیڈ اور دانش تمہیں ڈھونڈنے گئے ہیں ڈیڈ نے کہا کہ وہ تمہیں ملتے ہی مار ڈالیں گے۔ ان کے سر پر خون سوار ہے اس سے پہلے کہ وہ آجائیں تو بھاگ جا۔" علیزہ نے بڑی حیرانی سے سارہ کو دیکھا جو ڈری ہوئی تھی۔ "بڑے صاحب ایسا کیسے کر سکتے ہے وہ بھی بنا کچھ جانے۔" ازان میری ایک ہی بیٹی ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتی تم اسے کہیں لے جاؤ۔ سارہ نے ازان سے درخواست کی۔ میں کہاں جاؤں گی ماما۔ علیزہ رونے لگی تھی۔ ازان تم اسے اپنے گھر لے جاؤ کسی کو بھی شک نہیں ہوگا کہ یہ بھاگی ہے۔ دیکھو بیٹا اس وقت میں صرف تم پر ہی بھروسا کر سکتی ہوں۔ میں مہینے کے مہینے پیسے بھیج دوں گی۔ سارہ نے اسے کندھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے آگے سے ہاں کے طور پر سر ہلا دیا۔ "گاڑی ساتھ لے جاؤ عارف کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ جلدی کرو۔ سارہ کے کہتے ہی وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ علیزے نے ایک بار اپنی آنکھ بھر کر سارہ کو دیکھا لیکن اس نے چہرا موڑ لیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سارہ کی نظر گیٹ پر بیٹھے گارڈ کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ بند کر کے اسے یقین دلا دیا کہ وہ چپ رہے گا۔ تو وہ اندر کی طرف چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

ازان اور علیزہ صبح پانچ بجے گھر پہنچے تھے اور رات کو ہی اس نے گھر کے لوگوں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ علیزہ اندر کمرے میں سوئی تھی۔ برتنوں کی کی آوازے اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ جس نے اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ دروازے کے کھولتے ہی اس کے سامنے ایک لڑکا تھا۔ جو مسلسل اسے ہی گھور رہا تھا۔ وہ فوری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تو وہ مسکرانے لگا۔ اٹھ گئیں۔ ایک موٹی سی عورت آکر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ علیزہ تو بس کبھی اس لڑکے کی طرف دیکھتی تو کبھی اس عورت کو۔ اس نے پھر سے اپنی آنکھ بند کر لی کے شاید وہ خواب میں ہے لیکن پھر وہ اسی کے سامنے تھے۔ ایک دن میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

رات کو تو اسے بہت نیند آرہی تھی اس لیے فوراً" سو گئی تھی اور ازان باہر چلا گیا اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ "یہ میری ماں ہے اور یہ لڑکا میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بیگم صاحبہ۔" ازان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں گڈ مارننگ میرا مطلب ہے کے السلام علیکم۔ اس کی اس غلطی پر ازان ہنسنے لگا۔ تم منہ ہاتھ دھولو میں تمہارے لیے کھانے کو لاتی ہو مجھے پتا ہے کہ تم نے کل

سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ پروین نے سچ کہا تھا اس نے صرف کل کا ناشتا ہی کیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ چپ چاپ ہی بیٹھ گئی اور سارا دن اس نے ایسے ہی گزار دیا۔ ایک اذان تھا جس کا پتا ہی نہیں تھا صبح سے باہر نکلا تھا اور رات گئے واپس لوٹا اس کے آتے ہی فوری اس کے پاس آ پہنچی "کیا گھر سے کوئی فون آیا تھا ماما نے کچھ کہا؟" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کرنا شروع کر دیے۔ اذان کے انکار نے اسے مایوس کر دیا اور وہ واپس آ گئی۔ اگلی رات بھی اس کی روتے ہی گزری جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو سامنے وہی لڑکا تھا اور مسلسل اسے دیکھتے ہی جا رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

"یہاں آؤ۔" اس نے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ صرف دو قدم ہی آگے بڑھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" عرفان، عرفان بہت پیارا نام ہے۔ یہ بتاؤ عرفان کتنے سال کے ہو۔

"پتا نہیں۔" "کیوں دیکھنے میں تو پندرہ کے لگتے ہو۔ علیزے نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ "پتا نہیں۔" وہ اس کے آنٹی انکار کرنے پر ہنسنے پر لگی تو وہ بھی مسکرا دیا۔ اچھا یہ بتاؤ اذان کہاں ہے۔ "پتا نہیں" علیزہ کی پھر سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ اس کی نظر باہر سے آتے اذان پر پڑی تو ہاتھ میں دو شاپر تھے جو اذان نے لا کر علیزہ کو تھما دیے۔ یہ کیا ہے۔ اس میں آپ کے کام کی چیزیں ہیں برش صابن وغیرہ وغیرہ۔

"شکریہ مجھے واقعی میں ان کی ضرورت تھی اور ہاں اس کو بھی کچھ بتاؤ جو بھی پوچھو گے اسے پتا نہیں ہوتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک نظر کھڑے عرفان پر ڈالی۔ "یہ ایسا ہی ہے۔ بیگم صاحبہ! کیا بھائی نے آپ سے شادی کی ہے؟" عرفان کے بولتے ہی ان دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "چچا بھی چچی کو بیگم بولتے ہے کیوں کے ان دونوں کی شادی ہوئی ہے تو کیا۔

"عرفان تمہیں جانا نہیں ہے چلو تیار ہو جاؤ میں تمہیں چھوڑ کے آؤں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتا اذان نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ارے بچے پر کیوں غصہ ہو رہے ہو۔ دیکھو عرفان ضروری نہیں کے بیگم اسے ہی بلایا جائے جس سے شادی ہوا سے بھی کہتے ہے جو بڑے گھر میں رہتے ہوں آپ سے بڑا ہو۔ علیزہ اسے نیچے جھک کر اسے سمجھانے لگی۔

"لیکن آپ تو بھائی سے بڑی نہیں لگتی ہیں۔ عرفان کا ایک اور سوال آیا تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ "عرفان تم جاؤ اور جا کر تیار ہو۔" جاؤ اذان نے اسے جانے کے لیے بولا تو وہ بھاگ گیا۔

آپ اس کی طرف دھیان مت دیں کئی بار تو اس کے سوالوں کہ جواب میرے پاس بھی نہیں ہوتے۔ آپ جائیں وہ جانے کے لیے مڑی کہ اذان کا فون بجنے لگا تو وہ وہیں رک گئی۔ اس نے جیب سے فون نکال کر نمبر دیکھا۔

"ماما کا ہے یہ علیزے کو لگا کہ سارہ نے فون کیا ہو گا۔ اس کی خیریت پوچھنے کے لیے اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹ ہی آ گئی تھی۔

"نہیں بڑے صاحب کا ہے۔" اچھا تو اٹھا لو فون اس کی پہلی جیسی خوشی غالب ہو گئی۔

"السلام علیکم! بڑے صاحب۔

عارف کی آواز سن کر وہ تھوڑا ساڈر گیا کہ وہ علیزہ کے بارے میں پوچھ نہ لیں ورنہ وہ کیا جواب دے گا۔

"اذان مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔" جی کہئے۔

"وہ تم واپس مت آنا وہ کیا ہے نہ علیزہ کے امتحان شروع ہونے والے ہیں۔ اس لیے وہ ہوسٹل میں ہی رہ رہی ہے تو تمہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب کون سا اسے چھوڑنے جانا اور آنا ہے۔ اذان جان گیا تھا کہ ابھی تک ان کو کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ علیزے کہاں ہے۔ "بڑے صاحب وہ گاڑی چھوڑنے تو آسکتا ہوں۔" "ہاں وہ تم آ جانا۔" اچھا کیا علیزہ نے تمہیں فون کر کے بتایا نہیں تھا۔ عارف جاننے کی کوشش کی تھی اور اسی کے بارے میں جاننے کے لیے فون کیا تھا۔

"نہیں مجھے تو نہیں کہا بلکہ میری تو ان سے بات بھی نہیں ہوئی۔ اذان نے جھوٹ بولتے ہوئے علیزے کی طرف دیکھا تو وہ مایوسی سے واپس چلی گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم گاڑی لے کر آجاؤ۔" "جی ٹھیک۔ اذان کے کہتے ہی عارف نے فون بند کر دیا تھا۔ اذان نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا۔ اور عارف سے ہچکچا کر بات بھی کی۔

☆ ☆ ☆

دوپہر کو وہ کمرے میں ہی بیٹھی تھی کہ پروین ہاتھوں میں کپڑوں کے دو تین جوڑے لے کر آگئی۔

"بیٹی یہ دیکھ لو اس میں تم کون سا پہننا چاہتی ہو پروین بولتے ہوئے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ شاید اس کے گھٹنوں میں درد تھا۔ آنٹی یہ کپڑے علیزہ نے کپڑوں پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں مجھے پتا ہے کہ تم لوگ ایسے کپڑے نہیں پہنتیں۔ تم نے کل کے کپڑے پہنے ہے اور کافی گندے بھی ہوگئے ہیں۔ اس لیے لے آئی پروین اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھ رہی تھی۔ نہیں آنٹی ایسی بات نہیں ہے۔ یہ کپڑے بہت پیارے ہیں۔ لیکن یہ کپڑے علیزہ نے بولتے ہوئے پروین کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں سمجھ گئی تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ یہ کپڑے کس کے ہیں۔" پروین مسکرائے ہوئے بولی تو اس نے نظر نیچے کرلی اب پتا نہیں وہ شادی کب کرے گا۔ پڑے تھے تو تمہارے لیے لے آئی۔"

"لیکن آنٹی یہ سب کیسے پہن سکتی ہوں یہ تو آپ نے۔"

تو کیا ہوا اس کے لیے اور بن جائیں گے انہیں پہننا شاید تمہاری قسمت میں تھا۔ اور تم بھی تو میری بیٹی ہو تم پہن لوگی تو کیا ہو جائے گا۔ پروین نے پیار سے کہتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اسے سارہ کی یاد آگئی اس نے کبھی بھی ایسے پیار نہیں کیا تھا کیا "سوچ رہی ہو۔"

"ہاں نہیں کچھ نہیں۔" "سوچ رہی تھی کہ کون سے کپڑے پہنوں۔ "اچھا تو یہ نیلے والا پہن لو۔" پروین نے ایک جوڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تائی کیا ہوا۔" باہر سے کسی لڑکی کی آواز آرہی تھی اور اگلے ہی پل وہ کمرے میں چلی آئی۔

"ارے کومل آئی ہے علیزہ نے اس کی طرف دیکھا جو اسے ہی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ "تائی یہ کون ہے۔" "کون یہ؟" "ہاں یہ ہی بیٹھی ہے تو اس کے بارے میں ہی پوچھ رہی ہوں۔ کومل نے کمر پر ہاتھ رکھ لیا۔

"یہ اذان جس کے گھر پر کام کرتا ہے یہ اس گھر کی چھوٹی بیگم صاحبہ ہے۔" "اچھا تو اذان آپ کے گھر کا ڈرائیور ہے۔ وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ "جی ہاں اذان ہمارا ہی ڈرائیور ہے تاکہ ہمارے گھر کا علیزے نے بول کر اس کے لفظوں کو درست کیا۔ "لیکن تائی یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ والی لڑکی نے پوچھا تھا۔"

"وہ ایسے ہی آئی ہے وہ کیا ہے نہ اس کے ماں باپ باہر گئے ہیں اور یہ یہاں پر چادینے کے لیے رک گئی۔ پرچا ختم ہو گیا اور یہ اذان کے ساتھ گاؤں دیکھنے کے لیے آگئی۔" پروین نے وہی بہانہ لگایا تھا جو اذان نے کہا تھا۔ "تو کب جا رہی ہے واپس کومل نے نظر پروین سے ہٹا کر علیزہ کو دیکھا فی الحال ابھی تو نہیں۔" علیزہ نے سوچ کر جواب دیا۔ "اچھا تو پھر آپ بھی چلے ہمارے ساتھ، ہم لوگ باغ جا رہے ہیں اور آپ بھی تو گاؤں دیکھنے آئی ہیں، تو زرا بڑا خوش ہو کر بولی۔ چلی جاؤ ورنہ یہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ لیکن پہلے کپڑے پہن لو پروین کہتے ہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئی تو وہ بھی واپس مڑ گئی۔ علیزہ نے کپڑے پہن لیے تھے پر اسے ڈوپٹا لینے کی سمجھ نہیں آرہی تھی آدھا کبھی ادھر پھینکتی تو کبھی اوپر پھینکتی ہوئی باہر چلی آگئی۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ کتنی سندر لگ رہی ہے۔" پروین نے اسے دیکھتے ہی اس کی نظر اتاری۔ اس پر نیلا

رنگ بہت خوب صورت لگا۔ اس کے سفید بدن پر اس جوڑے کی شان اور بھی بڑھ گئی۔ ”لیکن آنٹی یہ ڈوپٹا کیسے پہننا ہے۔ مجھے پتا نہیں ہے۔ وہ ڈوپٹے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ”ارے اس میں کیا مشکل ہے۔ لاؤ میں ٹھیک کرتی ہوں۔ زارا آگے بڑھ کر اس کا ڈوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔ ڈوپٹا ٹھیک کرتے ہی وہ دونوں اسے کھینچ کر لے گئیں۔ اب وہ کھیتوں میں سے گزر کر جا رہی تھی۔ ”یہ میری دوست کا گھر ہے۔ جس کا نام مسکان ہے۔ پتا ہے اس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی اس کی پسند کی۔ لیکن گھر والوں کو نہیں پتا۔“ زارا بتا کر زور سے ہنسنے لگی۔ وہ اسے آنے والے ہر گھر کا بتائے جا رہی تھی۔

”لو آگئے۔ چاچا لال کے باغ میں۔ وہ ایک ہرے بھرے باغ میں کھڑی تھیں‘ ہر طرف صرف سبز ہی سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ”یہ جگہ دیکھ رہی ہو یہ اذان ہی کی ہے اور وہ سامنے دلال چاچا کا باغ جہاں امرود ہوتے ہیں تو چلو چلتے ہیں۔ کومل نے اسے بازو پھیلا کر جگہ کا رقبہ بتایا۔ وہ دونوں ہی اسے کھینچتے ہوئے وہاں لے آئیں وہ ایک درخت کے سامنے کھڑی تھی جس پر بہت سے امرود لگے تھے۔ دونوں امرود توڑنے لگیں۔ علیزہ نے ان دونوں کی طرف سے حیرانی سے دیکھا لیکن یہ چوری ہوگی۔

”ہاں لیکن ہمارے ہاں تمہیں پتا ہے چوری کر کے چیز بھی کھانے کا بھی اپنا ہی مزا ہوتا ہے اب چلو!

☆ ☆ ☆

”آگیا تو اتنی دیر کیوں لگا دی۔“ اذان عارف کو گاڑی واپس کر کے شام کو واپس آیا تھا۔ ”وہ بڑے صاحب نے روک لیا تھا۔ وہ کہتے ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ امی بہت بھوک لگی ہے آج کا پکایا ہے اور یہ بیگم صاحبہ کہا ہے۔ علیزے ہمیشہ اس کے آتے ہی اس کے پاس چلی آتی تھی۔ لیکن آج وہ نہ آئی تو اذان نے پوچھا۔

”وہ زارا اور کومل کے ساتھ باہر گئی ہے۔ پروین نے بولتے ہوئے اس کے لیے روٹی لا کر اس کے آگے رکھ دی۔ ”میں نے سوچا کہ باہر جائے گی تو دل لگ جائے گا۔ روز بس کمرے میں ہی بیٹھی رہتی ہے۔ پروین اس کے سامنے والی ہی چارپائی پر بیٹھ کر اسے بتانے لگی۔ میں نے ان دونوں کو بلا لیا کے لڑکیوں میں گھل مل جائے گی تو سب کچھ بھول جائے گی۔ ورنہ تو روتی رہتی ہے۔ لو آہی گئی۔ وہ اپنے ڈوپٹے میں تھی۔ اذان تو اسے دیکھ کر حیران ہی ہو گیا وہ وہ نہیں تھی جسے وہ روز کالج چھوڑنے جاتا ہے۔ جس کے روز روز بالوں کے اسٹائل ہوتے تھے۔ فیشن والے کپڑے پہنتی تھی۔ وہ تو کوئی عام سی لڑکی لگ رہی تھی۔ ”تم کب آئے۔“ وہ اذان کے سامنے ہی کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی۔

”بس ابھی۔“ کیا ڈیڈ ابھی بھی غصے میں ہیں۔ آپ یہ سب چھوڑیے یہ بتائیے کیا کیا دیکھا آپ نے؟“ اذان اسے بتا کر مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بات ہی پلٹ دی۔ ”بہت کچھ دیکھا باہر اتنا مزا آیا گھومنے کا۔“ علیزہ کے واپسی خوشی چہرے پر آگئی تھی جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے وہ بھی دیکھا کیا نام بتایا تھا کومل نے ’علیزہ یاد نہ آنے پر سوچنے لگی۔ ”وہ جس سے پانی نکلتا ہے وہ جس کے سامنے بڑا سا پائپ بنا ہوتا ہے اور اس کے آگے لمبا سا پائپ لگا ہوتا ہے اور اس سے پانی نکل کر گھاس چاول کو جاتا ہے۔ علیزے اسے بتا کر اشارہ کر رہی تھی۔ ٹیوب ویل بولتے ہے اسے۔ ہاں وہی پہلے تو ہم نے امرود توڑے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھائے۔ علیزہ اسے بڑے مزے سے بتا رہی تھی کے پروین اس کے لیے کھانا لے کر آگئی۔ ”چل اب بس کر اور روٹی کھا لے۔“ جی لیکن پہلے ہاتھ دھو لوں۔ ”ہاں کیوں نہیں جا بھاگ کے دھو کر آجا۔“

☆ ☆ ☆

علیزہ کو آئے ہوئے ایک ہفتے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنے ماضی کو بھلا کر سب میں گھل مل گئی تھی۔ جیسے اسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔

”ارے پروین کہاں ہے تو لال نے دروازے کے

اندر آکر اس آواز دینے لگا کیا ہے۔ پروین سامنے ہی بیٹھی ہانڈی پر ڈھکن رکھ کر باہر چلی آئی۔ "کیا ہوا ہے سامنے ہی تو تھی۔ ہاں بول کیا ہوا ہے۔" "ہونا کیا ہے میں تو تیری بیگم صاحبہ سے بہت تنگ آگیا ہوں۔" لال بولتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اذان بھی گھر آگیا تھا۔ "کیا ہوا لال چاچا اتنے غصے میں کیوں ہو۔" "اب کیا کہوں پہلے تو دو تھیں اب ایک اور مل گئی۔" "کس کی بات کر رہا ہے۔ صاف صاف بول نہ۔"

"وہ ہی جو شہر سے آئی ہے۔ روز میرے باغ میں گھس کر امرود توڑتی رہی تھی اور جب پکڑی جاتی ہے سو باتیں سنا کر بھاگ آتی ہے۔ میں تو تنگ کر تیرے پاس شکایت لے کر آیا ہوا ب تو ہی بتا کیا کروں میں اس کا حل۔" "تیرے کون سے سارے امرود توڑ لاتی ہے ایک دو کھالے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" پروین نے باتیں کرتے ہوئے اسے چائے کا کپ پکڑا دیا۔ لو آہی گئی خود ہی سمجھالے علیزے اور وہ دونوں ہنستی دروازے سے اندر داخل ہوئیں لیکن سامنے لال کو دیکھ کر کومل اور زارا واپس بھاگ گئی۔

"دیکھ لے ابھی بھی دو ہاتھ میں پکڑے ہے اور ایک کھا رہی ہے۔" اس کے بولتے ہی اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ اذان نے بھی ایک نظر اس پر ڈالی۔ "آجا آجا ڈر کیوں رہی ہے میں نے بول دیا ہے کہ اگر میری بیٹی ایک دو کھالے تو کیا جاتا ہے۔ ہم سے پیسے لے لے پر میری بیٹی کو نہ روکنا پروین اسے دروازے سے پکڑ کر آگے لے آئی۔ "میں نے تو بھی یہ ہی کہا ہے کہ پانچ چھ سے کیا فرق پڑتا ہے۔" علیزے نے لال کی طرف دیکھ کر بولا۔ "لے تو تو ایک دو کی بات کر رہی ہے وہ تو پانچ چھے بول رہی ہے۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔ "اچھا اچھا جو بھی ہے چھوڑ تو چائے پی۔ اذان اس وقت تو چپ رہا تھا لیکن اس کے جانے کے بعد ہی علیزہ کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔ "یہ اچھی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ۔" وہ جو شیشے کے سامنے کھڑی تھی فوراً مڑی۔ "کون سی بات وہی جو آپ آج کر کے آئی ہیں۔" "اچھا تو تم چاچا جان کی بات کر رہے ہو۔" "ہاں وہی میں نہیں چاہتا کوئی بھی شکایت لائے پر آپ ہے کہ۔" "اوہو کیا ہو گیا ہے۔ اذان اتنی چھوٹی سی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔" "میں ناراض نہیں ہو رہا میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہو کہ آپ ان دونوں کے ساتھ مل کر ایسے کام مت کریں وہ تو پاگل ہیں لیکن آپ تو سمجھ دار ہیں۔" "تو اچھا اب تم بتاؤ گے کے مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔" علیزہ نے اپنے ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے دیکھا جس سے وہ چپ ہو گیا۔ "اچھا مجھے بہت بھوک لگی ہے تم مجھے اپنی باتوں سے میرا پیٹ مت بھرواؤ۔ اٹھو آگے سے وہ اسے بول کر باہر چلی گئی۔ وہاں کھڑے اذان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

چل یار یہی بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ آج پھر سے ان کے ساتھ باغ میں چلی آئی۔ لیکن اس بار ان کے ساتھ مسکان بھی تھی۔ "یہ لو پکڑو کومل نے ایک امرود اس کی طرف پھینکا وہ پکڑ کر کھانے لگی۔ "پتا ہے اس دن اذان بول رہا تھا کہ میں تم پاگلوں کے ساتھ مل کر ایسی حرکتیں نہ کروں۔ "کیا اس نے ہمیں پاگل کہا اس کی تو میں۔" کومل غصے سے بولی تو مسکان نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ "کیا ہو گیا ہے اتنا غصہ مت کرو کہیں دماغ ہی نہ پھٹ جائے۔" مسکان نے اس سے مذاق کرتے ہوئے بولی۔ وہاں بیٹھی علیزہ اور زارا ہنسنے لگی۔ "تم تو ایسا ہی کہو گی۔ تم تو پاگل تھی لیکن ہم نہیں ہیں مسکان بیگم۔ کومل بولتے ہوئے امرود پکڑ کر کھانے لگی۔ کیا مطلب ہے تم لوگوں کا علیزہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "میں بتاتی ہوں مسکان اذان کو پسند کرتی تھی۔" زارا نے مسکان کو دیکھ کر بولی۔ "کیا اذان کو۔"

"اچھا تو پھر وہ یہاں سے زیادہ تمہارے پاس رہتا تھا اس بار مسکان خود بول پڑی۔" لیکن تمہاری تو شادی ہو رہی ہے اور وہ بھی پسند کی۔ "اذان وہ تو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا لیکن احمد وہ تو مرتا تھا مجھ پر اس لیے میں اس سے محبت کرنے لگی۔ ایک دن ہم میلے پر گئے

وہاں وہ بھی تھا کہ اچانک کسی لڑکے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر تو پوچھو ہی نہ کہ کیا ہوا۔ "کیا ہوا؟" علیزہ بڑے مزے سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ "پھر احمد نے اس کی دھلائی کی کہ اگلی بار پکڑنے سے پہلے سو کیا ہزار بار سوچے گا۔ علیزہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "اچھا پھر تو بڑا بہادر ہے۔ "اور کیا ضروری تو نہیں شادی اس سے ہو جسے آپ چاہتے ہے بلکہ اس سے کرنی چاہیے جو آپ کو چاہتا ہو۔ اذان سے میں تو محبت کرتی تھی لیکن وہ نہیں کرتا تھا۔" اچھا ایک بات تو بتاؤ تم نے اذان میں کیا دیکھا جو دل ہار بیٹھی اس پر زارا اس سے پوچھنے لگی۔ "تم نے کبھی اسے دیکھا نہیں محبت کی ہر جھلک دکھائی دیتی ہے اس میں پتا ہے جب وہ کالے رنگ کا سوٹ پہنتا ہے تو کسی فلم کا ہیرو لگتا ہے۔"

"اب اس فلم کے ہیرو کو چھوڑ احمد والی فلم کے ہیرو کو دیکھا وہ کیسا لگتا ہے۔ کومل نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"دفع ہو تم تو تم بتاؤ زارا کل کو آرہی ہو۔" کیوں کل کیا ہے۔

"بھول گئی میری منگنی ہے اور کیا۔

او اچھا کیوں نہیں آئیں گے ضرور آئیں گے اور تم علیزے۔" ہاں آؤں گی اگر آنٹی آئیں گی تو "کیا مطلب تمہیں آنا ہے۔" ٹھیک ہے آجاؤں گی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کی دعوت قبول کرلی۔ شام کو علیزے اپنے بستر میں لیٹی مسکان کی کہی باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس کی اچانک نظر چھت پر پڑی۔ تو دیکھا اذان اسے اشارے سے اوپر بولا رہا تھا۔ ایک پل کو تو سمجھی نہیں کہ وہ اسے اس وقت اوپر کیوں بولا رہا ہے۔ ایک نظر پردین پر ڈالی اور بغیر آواز کیے چھت پر پہنچ گئی۔

"کیا ہوا مجھے اس وقت چھت پر کیوں بلایا۔"

"وہ آپ کے لیے بڑی بیگم صاحبہ کا فون آیا ہے آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ اذان نے اس کی طرف فون بڑھا دیا۔ اور خود جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار کے سامنے کھڑی ہو کر سارا سے بات کرنے لگی۔ ہیلو السلام علیکم ماما وعلیکم السلام بہت اچھا لگا تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں سارا کی آواز بڑی دبی دبی سی آرہی تھی۔ جیسے وہ چھپ کر بات کر رہی ہو۔" تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے بلکہ یہاں میرا بہت خیال رکھا جاتا ہے خاص طور پر آنٹی تو مجھے اکیلا ہی نہیں چھوڑتیں۔" اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا وہ جو کر رہے کوئی اپنا نہیں کرتا بہت احسان ہے مجھ پر ان کا۔" جی کہے دوں گی۔ ماما کیا ڈیڈ ابھی بھی غصے میں ہی ہیں۔ ہاں وہ ابھی بھی تمہیں ڈھونڈ رہے ہے میں تو تم سے چھپ کر بات کر رہی ہیں۔ اچھا میں فون رکھتی ہوں مجھے لگتا ہے کہ کوئی آرہا ہے۔" لیکن ماما ہیلو۔ سارہ نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا تھا تو وہ پیچھے مڑ کر اذان کو دیکھنے لگی۔ "کیا ہوا۔" فون بند کر دیا ہاں کوئی آگیا تھا اس لیے انہوں نے بند کر دیا علیزے نے فون واپس پکڑا دیا۔ "اب مجھے پتا چلا کے تم چھت پر کیوں سوتے ہو۔" کیوں سوتا ہوں یہ منظر کتنا خوب صورت ہے نہ وہ پھر باہر دیکھنے لگی۔ جہاں سے درخت کے پیچھے سے چاند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے آگے سے سڑک گزر رہی تھی اور اس کے آگے ایک بڑا سا کھیت تھا چاند کی روشنی سے اس کی ہریالی بھی نور کی طرف دکھ رہی تھی۔

"یہ منظر صرف یہاں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اذان بھی جا کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "بات تو ماننی پڑے گی۔ وہ مسکرانے لگا تو وہ اسے دیکھتی رہی۔ "کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔" آپ سوچ رہی ہیں کے مسکان نے سچ کہا تھا۔ "کیا کہا اس نے۔" کچھ نہیں سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔" وہ وہاں سے واپس چلی آئی اور لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

"اذان اذان۔" علیزے اس آواز دیتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئی اور بے ساختہ اس سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی اس کی آواز سن کر باہر آرہا تھا۔ سوری وہ میں نے دیکھا نہیں "چھا چھوڑو یہ بتاؤ آنٹی پوچھ رہی

ہیں کہ تم رات کو کون سے کپڑے پہنو گے تاکہ استری کردوں۔ علیزے سے فوراً" کی بات پلٹ دی۔

"ہاں وہ میں نہیں جاؤں گا اس لیے رہنے دو۔" وہ بولتے ہی باہر کی طرف چل پڑا۔ لیکن علیزے نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ اذان کی سیدھی نظر اس کے رکھے ہاتھ پر پڑی۔

"پر کیوں۔" میں کیا کروں گا وہاں جاکر "کیا مطلب ہے تمہارے چاچا کی بیٹی ہے تم نہیں جاؤ گے تو کون جائے گا تمہارا فرض بنتا ہے۔" اچھا پھر تو جانا پڑے گا۔ وہ اس کی سمجھ داری پر مسکرانے لگا۔ "تو کون سے کپڑے پہنو گے۔" کوئی بھی علیزے کو مسکان کی بات یاد آگئی تھی۔ "کہا نا کوئی بھی اب جا سکتا ہوں مجھے ضرور کام کے لیے جانا ہے۔ اذان کے کہتے ہی وہ ایک سائڈ پر ہٹ کر گئی وہ باہر نکل گیا علیزہ بھی قدم بڑھاتی ہوئی پروین کے پاس چلی آئی جو کپڑے پھیلائے بیٹھی تھی۔ "آگئی یہ دیکھ میں نے تمہارے لیے یہ والے کپڑے نکالے ہیں، ٹھیک ہیں۔" پروین نے براؤن رنگ کا سوٹ نکال کر رکھا تھا جو اس کے آگے رکھ دیا۔ "واؤ یہ تو بہت پیارا ہے۔" یہ دیکھ میں تیرے لیے یہ کچھ اور بھی لائی ہوں۔ پروین کے ایک چوڑیاں کا جوڑا اور کانوں میں پہننے کے لیے بالیاں بازار سے لائی تھی۔ "آپ بہت اچھی ہیں اتنا بھی خیال نہ رکھیں میں واپس ہی نہ جاؤں۔ "نہیں تو چاہتی ہوں کہ تم کبھی بھی نہ جاؤ۔ میرا بھی دل لگ گیا ہے تم سے بس دل چاہتا ہے کہ تم یہاں رہو میری بیٹی بن کے علیزہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی۔"

☆ ☆ ☆

علیزہ صبح سے ہر کام جلدی جلدی سے کر رہی تھی۔ اس نے تو کپڑے بھی استری کر کے کب سے رکھ لیے تھے۔ پروین کا دیا جوڑا اسے بہت پسند آیا تھا۔ اسے پہننے کے لیے بہت ایکسائٹڈ تھی وہ تو رات ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ رات کو سب سے پہلے وہی پہنچی تھی۔ کیونکہ اس نے مسکان سے وعدہ کیا تھا کے اسے تیار وہ کرے گی۔

"کیا تائی اور تم دونوں ہی آئی ہو۔" اذان نہیں آئے گا۔ "آئے گا وہ کسی کام سے گیا تھا۔ اگر اس کا انتظار کرتے تو تم ہو گئیں تھی تیار۔" علیزہ اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے اپنی طرف کر کے بولی۔ "اچھا ایک بات تو بتاؤ علیزہ تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے۔ تو علیزہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "کیوں بتاؤ تو سہی کیا ہے۔" "نہیں کبھی ایسا ملا ہی نہیں۔" ملا نہیں کہ دیکھا نہیں۔ علیزہ اس کے بالوں کو چھوڑ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ کیا۔" اذان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی تو اتنا خوب صورت وہ کیا کہتے ہیں ہینڈسم سب سے بڑھ کر تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔"

پاگل ہو تم بہت اچھا دوست ہے اس کے علاوا کچھ نہیں۔ بولتے ہوئے اس نے مسکان کے کندھے پر ہاتھ مارا پاگل میں نہیں تم ہو پیار کی شروعات دوستی سے ہی ہو گئی ہے۔ مجھے تو تمہارا ہے کے وہ بھی تم سے پیار کرتا ہے۔ ورنہ وہ کیوں تمہیں اپنے گھر لے کر آیا ہے تمہارا اتنا خیال رکھتا ہے ہر بات مانتا ہے چھوڑو کوئی بھی ایسا نہیں کرتا کسی کے لیے تب ہی کرتا ہے جب وہ ان کے لیے خاص ہو۔ مسکان کی باتیں سن کر وہ تو سوچ میں پڑ گئی۔

لیکن مسکان مجھ میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ "محبت یہ نہیں دیکھتی وہ تو بس ہو جاتی ہے۔ جیسے میرے اور احمد کے بیچ ہوئی۔ "نہیں مسکان ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" مسکان کی باتوں نے اسے بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا کیا تم اس سے پیار نہیں کرتی۔ اس نے فوری نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔" میں میں کیوں اس سے پیار کروں گی۔ علیزے نے مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولی۔ کرتی ہو جھوٹ مت بولو۔ "وہ تو ایسے ہی۔" ایسے ہی نہیں کبھی اپنے دل سے پوچھنا وہ تمہیں بتائے گا کہ کیوں کیا کرتی ہو اب باہر چلتے ہے۔" مسکان کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ ہنستے ہوئے پکڑ کر باہر لے آئی باہر سب ہی تیار تھے۔ انتظار تھا تو صرف ان کا علیزہ نے اس بٹھا دیا تو منگنی کی رسم

شروع ہو گئی۔ اس دوران علیزہ کا سارا دھیان صرف اذان پر تھا۔ جو سامنے کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ مسکان نے سچ کہا تھا وہ سچ میں کالے سوٹ میں بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا جب وہ رات کو واپس آکر بستر پر لیٹ کر اس کی کہی باتوں کو سوچتی رہی۔ علیزہ پر ان باتوں کا دو دن تک اثر رہا۔ تو اس الجھن کو دور کرنے کے لیے چھت کر اذان کے پاس چلی آئی۔

ارے بیگم صاحبہ آپ اس وقت یہاں پر کیا کر رہی ہے اور امی۔ وہ اس سے پہلے کبھی ایسے چھت پر اس کے پاس نہیں آتی تھی جب سارہ کا فون آتا تب ہی آتی تھی۔ "ہاں وہ تو سو رہی ہے۔" وہ بول کر اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تو اذان فوری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہو تم اٹھ کیوں گئے۔ وہ آپ بتائیے کوئی کام تھا۔" اذان کے کھڑے ہی کھڑے اسے جواب دیا۔ "نہیں کام تو نہیں کچھ پوچھنا تھا۔ جی بتائیے کیا بات ہے۔

"اذان تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے یا کرتے ہو۔" اذان اس کی بات پر ہنس دیا۔ "کیوں کیا ہوا۔" کیا پیار کی شروعات دوستی سے ہوتی ہے۔ آپ جس سے پیار کرتے ہو بس اس کا نام۔ اسے دیکھ کر دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔ بس دل کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے ہو۔" بولتے ہوئے وہ دور جا کر باہر دیکھنے لگی۔ "ہاں کچھ ایسا ہی دل کہتا ہے کہ وہ صرف تمہاری ہی ہو وہ بھی اسے اتنا ہی پیار کرے جتنا وہ کرتا ہے وہ جائے تو آنکھیں اسی کا راستہ دیکھیں۔" اذان اپنی آنکھوں اور لفظوں میں پیار بھر کر اسے ہی کھڑا دیکھ رہا تھا جو باہر ہی دیکھ رہی تھی مسکان کی بات سو فی صد درست تھی وہ اسی سے پیار کرتا تھا وہ بھی اب سے نہیں بلکہ تب سے جب صرف اس کا ڈرائیور رہتا تھا۔ لیکن اسے ہمیشہ ایک چیز نے روکا اور وہ تھی امیر اور غریب وہ جانتا تھا وہ جس راستے پر ہے اس کی کوئی بھی منزل علیزے تک نہیں پہنچتی تھی تو کبھی بھی اس بات کا احساس اسے نہیں ہونے دیا تھا۔

"تو پھر یہ سب میں تمہارے لیے کیوں محسوس کرتی ہو اذان۔" ایک دم مڑی تھی وہ۔ اذان کی مسکراہٹ ہی غائب ہو گئی۔ میں یہ کیوں تمہارے لیے محسوس کرتی ہوں۔ کیوں اذان میں الجھن میں ہو آخر کیوں کیا میں تم سے۔۔۔ نہیں بیگم صاحبہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" اذان کے فوری ہی انکار کر دیا۔ آپ کو کسی نے کہا کہ آپ مجھ سے۔۔۔ آپ نے سوچا بھی کیسے۔" میں خود نہیں جانتی لیکن۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ضرور آپ کو یہ سب مسکان نے بولا ہو گا۔" وہ اس سے پوچھ رہا تھا تو وہ سر نیچے جھکا گئی "مجھے بتاؤ وہ ایسی ہی ہے اپنی ان ہی چلاکیوں کی وجہ سے آج اپنی حیثیت سے زیادہ بڑے گھر میں شادی کر رہی ہے۔ اسی بات کا تو مجھے ڈر تھا اور دیکھیے وہی ہوا۔ اسی لیے میں آپ کو روکتا تھا۔ دیکھیے بیگم صاحبہ ایسا کچھ نہیں ہے میں آپ کا ڈرائیور ہوں اور رہوں گا اس لیے اب آپ جا کر سو جائیے مجھے امید ہے کہ صبح تک آپ سب کچھ بھول جائیں گی۔" وہ ٹھنڈی سی سانس بھر کر اسے سمجھانے لگا تو وہ واپس چلی آئی اور بیٹھ کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی اس کے ذہن میں ہر ایک بات گھوم رہی تھی لیکن وہ ایک بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ ایک نظر اوپر ڈالی تھی جہاں اذان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور آج تو بہت اچھا موسم تھا صبح کومل اسے لینے بھی آئی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ "اذان بیٹا میری بات تو سنتا پروین نے اسے باہر سے آتے ہی روک لیا۔

"جی امی جان۔" کیا تم نے علیزہ کو باہر جانے سے روکا ہے۔ "نہیں تو میں کیوں روکوں گا اور ویسے بھی وہ کون سا روکنے سے رک جاتی ہے۔" ہاں پر آج تین دن ہو گئے ہیں گھر بیٹھے آج کومل بھی لینے آئی تھی پر اس نے انکار کر دیا۔ "وہ پریشان سے بولی۔" آپ پریشان نہ ہو میں بات کرتا ہوں۔ "ہاں ٹھیک ہے۔" پروین چلی گئی اور وہ کمرے میں چلا آیا۔ "کیا ہوا امی بتا رہی تھیں کے آپ آج کل گھر میں ہی رہتی ہیں۔

علیزہ ی سوچ میں گم تھی اسے باہر نکالنے کے لیے ملت شروع کردی۔ "بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا وہ یدمی ہو کر بیٹھ گئی۔ چلیے آج میں آپ کو باہر لے کر جاتا ہوں۔" "تمہارے ساتھ تو کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہو پر تم کہو تو۔" اذان سمجھ گیا کہ ابھی تک اثر ختم نہیں ہوا۔ فی الحال آپ تیار ہو جائیے جانے کے لیے میں آپ کا باہر انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے ایک منٹ نہیں لگایا تھا اور باہر نکل کر اذان کے ہمراہ چل دی وہ اذان کو بتا رہی تھی کے وہ ان کھیتوں میں آکر کیا کرتی اسے سامنے نزدیک بیل نظر آیا تو وہ جا کر کنارے پر بیٹھ گئی۔ "پتا ہے اذان ہم جب امرود توڑنے یہاں دھوں کر کھاتے ہیں بہت مزا آتا۔" وہ پہلے کی طرح اب بھی خاموشی سے مسکرا دیا علیزہ نے ہلکا سا پانی مٹھی میں لے کر اس کی طرف پھینکا۔ تو اس نے اپنے ہاتھ آگے کر لیے۔ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان سے علیزہ کے خوشی سے بھرے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہونٹوں کی مسکراہٹ وہ ہوا سے اٹھنے والے بال سب اسے بے چین کر رہے تھے اور مجبور کر رہے تھے پاس آنے پر لیکن اپنے جذباتوں پر قابو پا کر وہیں کھڑا رہا۔ علیزہ بولتے ہوئے اس کے پاس چلی آئی پر وہ خاموشی سے واپس کے لیے چل دیا۔ "تم چاہے جتنا بھی نہ کہو پر تمہاری خاموشی سب بتا دیتی ہے مجھے یہ الفاظ اس نے اپنے دل میں ہی سوچے۔ گھر پہنچ کر اس نے سوچا بھی نہیں تھا کے یہ منظر دیکھنے کو ملے گا۔ سامنے ہی دانش اور عارف بیٹھے تھے۔ تو وہ اذان کے پیچھے چھپ گئی تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے علیزے مجھے سارہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ عارف نے یہ الفاظ اتنے پیار سے کہا کہ علیزہ روتے ہوئے بھاگ کر عارف کے گلے لگ گئی۔ "میں تمہیں لینے آیا ہوں چلو گی نہ اپنے ڈیڈ کے ساتھ۔ عارف کے پوچھنے پر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ تو جاؤ جلدی کرو تمہاری ماں انتظار کر رہی ہے۔ عارف کے کہتے ہی اس نے ایک نظر وہاں کھڑے اذان کو دیکھا اور اندر چلی گئی۔ میں تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں اذان میرے پاس تو الفاظ بھی نہیں ہیں۔ اس بار عارف کی جگہ دانش بولا۔ "کوئی بات نہیں صاحب مجھے جو مناسب لگا میں نے وہی کیا۔ علیزے کو اندر گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ تو اذان پتا کرنے کے لیے چلا آیا۔

"کیا ہوا بیگم صاحبہ آپ تیار نہیں ہوئیں۔ وہ ابھی بھی ویسے ہی بیٹھی تھی۔ تم بھی یہ ہی چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں۔ "کیا مطلب؟" مطلب یہ کہ میں نہیں جانا چاہتی میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ بس ایک بار کہہ دو کے تم مجھ سے محبت کرتے ہو میں جیسے بھی کر کے ڈیڈ اور دانش بھائی کو واپس بھیج دوں گی۔ وہ بے چین سی ہو کر بولی۔ آپ کیا کہہ رہی ہے میں نے آپ سے پہلے ہی کہا ہے میں آپ سے محبت نہیں کرتا پھر کیوں کر رہی ہیں صد پر تو تم اٹکے ہوئے ہو میں جانتی ہوں اگر نہیں جانتی تو یہ سب نہیں کہتی۔ تو ٹھیک ہے تم خود سے جھوٹ بول سکتے ہوں پر میں تم سے محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ یہ یاد رکھنا۔ وہ اس کے آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔ اذان سوچ میں پڑ گیا تھا اسی سوچ میں کب علیزہ چلی گئی پتا ہی نہیں چلا وہ تو تب اپنی سوچوں سے نکلا جب گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اذان نے غصے سے اپنی مٹھیاں بند کر لیں بس دل چاہ رہا تھا کہ فوری جا کر اسے روک لے وہ سب بول دے جو وہ سننا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

سارا دن باہر رہنے کے باد وہ رات کو گھر واپس لوٹا تھا۔ پروین ابھی تک اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "کہاں چلے گئے تھے تم کتنا انتظار کیا تمہارا۔" اذان چپ چاپ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کیا ہوا اذان پریشان کیوں ہو کوئی بات ہے کیا بولو بیٹا پروین نے اسے یوں پریشان دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "کوئی بات نہیں امی اذان نہ ہونے والی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لے آیا۔" "میں جانتی ہوں سب۔ پروین کے بولتے ہی

اذان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ دیکھو بیٹا میں یہ نہیں کہوں گی کے تم نے اچھا نہیں کیا اسے انکار کر کے اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا کیا میں نے تم لوگوں کی سب باتیں سن لی تھی۔ ہم لوگ ان کی برابری نہیں کر سکتے وہ بہت بڑے لوگ ہیں ہماری اتنی اوقات کیا کہ ان سے کوئی بھی رشتہ جوڑ سکیں۔ پروین اسے سمجھانے کے انداز سے کہنے لگی۔ "میں جانتا ہوں امی اسی لیے تو یہ سب کیا ہے۔" اذان نے پروین کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ علیزے کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ایک نوکرانی جوس کا گلاس لے کر کمرے میں چلی آئی۔ "بیگم صاحبہ جوس ' ہاں یہاں رکھ دو۔" وہ موبائل میں مصروف تھی تو اشارے سے اسے رکھنے کو بولا۔ ابھی وہ رک کر جا ہی رہی تھی کہ علیزے نے اسے روک دیا۔

"ڈیڈ گھر پر ہیں؟" ہاں وہ اپنے کمرے میں ہیں۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" علیزہ اس کے جاتے ہی جوس کا ایک گھونٹ لگا کر عارف کے پاس چلی آئی لیکن وہ ان کے کمرے کے باہر ہی رک گئی اندر عارف اور دانش کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ "پاگل مت بنو دانش اسے پہلے ہی اتنی مشکل سے واپس لایا ہوں اور تم اس ساری کوشش پر پانی پھیرنا چاہتے ہو۔" "لیکن ڈیڈ ہم نے تو وعدہ کیا ہے اس کا کیا۔" تھوڑا ویٹ کرو ابھی وقت نہیں ہے ہمیں اس سے پیار سے ہی پیش آنا ہو گا تم نے دیکھا تھا جب ہم نے اس سے پیار سے کہا تو وہ میرے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اور اگر یہ ہی بات ہم نے زبردستی کی ہوتی تو وہ کبھی نہیں آتی اس کی شادی وہیں ہو گی اور تمہاری بھی میں اپنے فیصلے سے کبھی بھی بدلتا۔" علیزے کا باہر رو رو کر برا حال ہو رہا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کے اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ اس کے وہاں موجود ہونے کا احساس ان لوگوں کو پتا چلتا وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگ گئی۔ سارہ نے اسے بھاگتے دیکھ کر پیچھے ہی چل پڑی اس کے کمرے سے چیزے توڑنے آوازیں آ رہی تھی۔ سارہ نے دروازہ کھولا تو علیز۔ روتے ہوئے چیزیں ادھر ادھر پھینک رہی تھی "علیزے کیا ہوا یہ کیا کر رہی ہو۔ بات کیا ہے۔ سارہ تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ "آپ نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ پیار سب جھوٹ تھا۔" علیز۔ نے ایک بار پھر بیڈ پر پڑا تکیہ اٹھا کر نیچے پھینکا۔ سا نے آگے بڑھ کر اسے بازوں سے پکڑ لیا۔ "علیز۔ چپ ہو جاؤ۔" عارف کو بھی پتا چل گیا تھا کہ علیز۔ سب جان گئی ہے فی الحال وہ خاموش ہی رہا۔ علیزہ۔ بہت دن سے اذان کو فون کرتے ہی جا رہی تھی بہ دن ہو گئے تھے اس نے اذان کی آواز تک نہیں س تھی وہ مسلسل اس کا نمبر ملائے جاتی لیکن وہ بند کر دیتا "علیزہ کس کو فون کر رہی ہو۔" سارا ابھی ا کمرے میں داخل ہوئی تو اسے فون کرتے دیکھ کر پو ہی لیا۔ "آپ کو کیا میں جس کو بھی کروں۔ اس۔ روڈلی سے سارہ کو جواب دیا۔ "میں تمہاری ماں ہ تمہارا درد سمجھتی ہوں۔" "نہیں آپ نہیں سمجھتیں ا سمجھتیں تو مجھے اذان کے پاس بھیج دیتیں"۔ کیا کیا نے اذان کے پاس سارہ اس کے منہ سے اذان کا نام س کر حیران رہ گئی۔ "مجھے سچ بتاؤ علیزے اگر بات کچ ہے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کیا جو میں سمجھ رہی ہوں وہ یہی ہے۔ سارہ اس کا جواب سننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ "ہاں یہ صحیح ہے۔" سارہ کے ہوش اڑ گئے۔ "پاگل ہو گئی ہو یہ کیا کہہ رہی ہو میں نے تمہیں پناہ لینے کے لیے بھیجا تھا پیار یا محبت کرنے کے لیے نہیں کیوں اس کی زندگی خطرے میں ڈال رہی ہو۔"

"تو پھر کیا میں نے اس سے محبت کی ہے اور ویسے بھی وہ لوگ اس لائق بھی ہیں لیکن آپ لوگ تو نفرت کے لائق بھی نہیں۔" اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے سارہ نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا۔ "بہت غلط کیا تم نے جب تمہارے باپ کو پتا چلے گا تو تمہارا تو پتا نہیں لیکن اس کا انجام بہت برا ہو گا۔"

"لیکن ماما میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں۔" وہ روتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اور وہ بھی مجھے پیار کرتا ہے ماما آپ لوگ کیوں نہیں سمجھ رہے۔" "میں سمجھتی ہوں میری بچی مجھے پتا ہے۔" سارہ سے اس کی بے بسی دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ آپ نہیں سمجھتی آپ کو کچھ نہیں پتا۔ مجھے پتا ہے وہ تم سے پیار کرتا ہے۔ آج تمہارے ڈیڈ نے اسے بلایا تھا ہاں علیزے وہ آیا تھا۔

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ وہ بولتے ہی اٹھنے لگی کہ سارہ نے اسے روک دیا۔ "وہ چلا گیا ہے۔ تمہارے ڈیڈ نے اسے نوکری سے نکال دیا ہے اور جانتی ہوں جاتے ہوئے اس کی آنکھیں تمہیں ڈھونڈ رہی تھیں باہر نکل کر بھی اس نے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تھا۔" سارہ کہتے ہوئے نیچے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "محبت کو کھونے کا غم میں جانتی ہوں۔ میں نے بھی کبھی تمہارے ڈیڈ سے محبت کی تھی۔ لیکن وہ پیسوں سے محبت کرتے تھے میں نے اپنی عمر اسی میں گزار دی کے شاید ان کو بھی مجھ سے محبت ہو جائے۔ پر افسوس میں غلط تھی۔" سارہ نے علیزے کے درد میں اپنا درد بھی شامل کر لیا۔"

☆ ☆ ☆

علیزے آج کھڑکی کے پاس ہی کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کے کاش اس دن بھی وہ اسی طرح کھڑی ہوتی تو اذان کو دیکھ لیتی۔ پھر کچھ سوچ کے اس نے پھر سے اذان کا نمبر ملا کر کان سے لگا لیا لیکن اس بار بھی بیل ہی جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھانے والا نہیں تھا پلیز اذان آج تو فون پک کر لو۔

"ہیلو ہاں اذان نہیں میں اس کا دوست بول رہا ہوں۔" آپ کون اچھا کیا اذان سے بات ہو سکتی ہے اسے کہنا بڑے صاحب کا فون ہے۔ علیزہ نے جھوٹ بولا کیوں کے وہ جانتی تھی کے اس کا سن کر وہ بات نہیں کرے گا۔ "ابھی تو نہیں ہو سکتی نکاح کے بعد ضرور کر دوں گا۔

"اچھا تو آج مسکان کا نکاح ہے۔" نہیں آج اذان

دوست

ہمارے ٹیچر مشتاق نامی لڑکے سے بہت بیزار تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ اسے جو بھی مضمون لکھنے کو کہتے۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے "میرا بہترین دوست" ضرور فٹ کر دیتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد مضمون تھا جو اس کو فر فر یاد تھا مثلاً اگر کہا جاتا کہ ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں لکھتا کہ میں اور میرے ماں باپ چچوں کی ملیاں جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن گئے۔ وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔"

اگر اسے "میرا استاد" مضمون لکھنے کو کہتے تو وہ لکھتا کہ ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا۔ وہاں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔

ظاہر ہے جب کرکٹ میچ یا پکنک کی باری آتی تو وہاں بھی زاہد حسین موجود ہوتا۔ تنگ آ کر ماسٹر صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر جگہ تمہارا دوست زاہد حسین موجود ہو۔ آج تم ہوائی جہاز پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ ہوائی جہاز میں زاہد حسین موجود نہیں ہے۔

دوسرے دن مشتاق نے جو مضمون لکھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ "میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئر پورٹ گیا۔ وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دو پر تھے اس میں ہم بیٹھ گئے۔ جہاز میں زاہد حسین نہیں تھا پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو زمین پر میرا بہترین دوست زاہد حسین جا رہا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے مضمون پڑھ کر مولا بخش اٹھا لیا اور مشتاق غریب کا جلوس نکال دیا۔

(کتاب "گزارہ نہیں ہوتا" سے اقتباس)

کا نکاح ہے۔" اسے بجلی سے بھی بڑھ کر شاک لگا تھا۔

"میں آپ کا بتا دوں گا مجھے اور بھی کام ہے۔ ایک منٹ بات تو۔ اس سے پہلے کے وہ اور کچھ کہتی۔ لائن کٹ گئی۔" نواسپاسیبل۔ وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا وہ کسی اور سے شادی کیسے کر سکتا ہے۔ سارہ نیچے لنچ لگوا رہی تھی جب اسے علیزہ کے کمرے سے کوئی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی وہ ڈر کر اوپر کی طرف دوڑی سارہ نے جب دروازہ کھولا تو اس کے سامنے حیرت انگیز منظر تھا۔ شیشے کا واز ٹوٹا تھا اور اس کا ایک ٹکڑا علیزہ کے ہاتھ میں تھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو تم پاگل ہو۔ سارہ نے فوری آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے شیشہ پکڑ کر دور پھینک دیا۔ علیزہ پوری طرح ہوش گنوا بیٹھی تھی۔

"ماما وہ شادی کر رہا ہے۔" کون کس کی شادی اذان وہ شادی کر رہا ہے اگر وہ کسی اور کا ہو جائے گا تو میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی ماما۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی سارہ سے باتیں کر رہی تھی۔

"علیزے علیزے میری طرف دیکھو۔" سارہ نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا کس نے کہا تم سے ــــ "فون کیا تھا میں نے اس کے دوست نے بتایا ماما میں نہیں رہ پاؤں گی اس کے بغیر۔ اس کی آنکھوں سے آنسوں ٹپکنے لگے۔

"علیزے مجھ سے وعدہ کرو کے میرے واپس آنے تک خود کو کچھ نہیں کرو گی وعدہ کرو۔" سارہ نے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا تو اس نے سر ہلا دیا۔ سارہ غصے سے عارف کے پاس جانے کے لیے اس کی لائبریری کی طرف چل دی۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی تم نے اذان کو کہہ کے بہت اچھا کیا۔ سارہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک نظر ان دونوں باپ بیٹے پر ڈالی۔ "واہ عارف صاحب داد دینی پڑے گی آپ کی۔ آپ سچ میں اپنے وعدے کے پکے ہیں۔ عارف سر کو اٹھا کر اور اسے ہی دیکھنے لگا۔

مجھے پتا تھا کے یہ آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن ۔ آپ نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ یہ جھوٹ علیزہ کی جان لے سکتا ہے۔" سارہ ان دونوں پر چلائی تھی۔

"بس بہت ہوا سارہ بیگم تمہیں کیا لگا ہے کہ میری بیٹی ایک ڈرائیور کے ساتھ عشق لڑاتی پھرے گی تو مجھے پتا ہی نہیں چلے گا میں اندھا نہیں ہوں۔ ہو بھی سکتے ہو۔ اسی لیے تو اپنی بیٹی کا دیوانہ پن نہیں دیکھ پا رہے اگر میں وقت پر نہیں پہنچتی تو وہ مر جاتی اس نے خود کشی کرنے کی کوشش کی ہے عارف صاحب دانش اور عارف کی تو آنکھیں ہی باہر نکل آئیں۔ دیوانی ہو گئی ہے اس کی اور تم سارہ نے فوری نظر دانش پر ڈالی۔

"بھائی تو اپنی بہنوں کے لیے اپنی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں پر تم تو اپنی خوشی کے خاطر اس کی خوشیاں قربان کر رہے ہو۔" "دانش نے شرم سے سر نیچے جھکا لیا۔"

ارے کیسے بھائی ہو تم جو اپنی بہن کا درد نہیں جانتے۔ تمہیں یاد تو ہو گا کے تم آذر سے کیوں نفرت کرتے ہو جب اس نے علیزے کا من پسند کھلونا توڑ دیا تھا تو وہ رونے لگی تھی اور تم اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ پاتے تھے تم نے آذر کو کتنا مارا تھا۔ سارہ نے اسے اپنا بچپن یاد دلایا جس میں اس کے تائے کے بیٹے آذر سے لڑائی ہوئی تھی اور آج تم ہی اسے ہزاروں آنسو رلا رہے ہو۔ آپ عارف صاحب آپ نے تو انہیں اپنے گھر سے روک دیا تھا۔ پھر آج اس بیٹی کے لیے اتنے سنگ دل کیسے ہو سکتے ہو۔" سارہ رونے لگی تھی تو دونوں ہی باپ بیٹے سر جھکا کر رونے لگے۔

"ایک دن وہ آئے گا جب آپ کے پاس یہ سب کچھ ہو گا لیکن ہم نہیں۔ تب بہت پچھتاؤ گے آپ دیکھ لینا۔" سارہ بولتے ہی وہاں سے واپس لوٹ گئی۔

رات کو دانش علیزے کے کمرے کے پاس سے ہی گزر رہا تھا کہ دروازے میں کھڑے ہو کر اسے سوتے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی آنسوؤں کے نشان تھے۔ وہ جا کر اس کے سرہانے نیچے بیٹھ گیا۔

"مجھے معاف کر دو علیزے میں اپنے بھائی ہونے کا فرض ادا نہیں کر پایا۔" وہ ابھی تک اپنے کیے ہوئے پر شرمندہ ہو رہا تھا میں نے اپنی خوشی کی خاطر تمہاری قربانی دینی چاہی میں ایک بھائی نہیں بن پایا۔ علیزے

لیکن میں اب وہ سب تمہیں دوں گا جو تم چاہتی ہو چاہے اس کے لیے مجھے ڈیڈ کے سامنے کھڑا ہی کیوں نہ ہونا پڑے تمہارے حصے کی خوشیاں ضرور تمہیں ملے گی اور یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے تم سے۔" دانش نے اس کے چہرے سے بال پیچھے کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ اس نے اٹھ کر چادر اٹھا کر اسے اوڑھا دی۔ اور وہاں سے واپس چلا گیا۔ واپس آتے ہوئے اس نے صحن میں بیٹھے عارف کو دیکھا شاید سارہ کی باتوں نے اس کی نیند ہی اڑا دی تھی۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ڈیڈ۔" عارف جو کسی سوچ میں گم تھا اچانک آتے دانش کو دیکھا۔ "ہاں وہ میں تم اس بات کو چھوڑو کیا تم علیزے کے کمرے سے آرہے ہو۔" "ہاں وہاں سے آ رہا ہوں۔" دانش جا کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تو تم اپنی ماں کی باتوں میں آ گئے۔"

"نہیں ڈیڈ میں کسی کی بھی باتوں میں نہیں آیا۔ بلکہ ماما نے جو کہا وہ سب سچ ہی تو تھا ہم نے اپنے فائدے کے لیے علیزے کو استعمال کیا۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ عارف نے بھی ان لمحات کے درمیان کچھ نہ کہا "ڈیڈ میں نے آج تک کچھ نہیں مانگا لیکن آج میں آپ سے اپنی بہن کی خوشیاں مانگتا ہوں۔ پلیز انکار مت کیجئے گا۔" عارف نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جو ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ "تم شاید بھول رہے ہو وہ ایک ڈرائیور ہے۔" "ہمارے لیے ہے پر علیزہ کے لیے وہ اس کی زندگی کا ڈرائیور ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اسے بہت خوش رکھے گا جیسے اب تک رکھتے آیا ہے ایک بھائی نے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کی ہر خوشی واپس کرے گا۔ اس کے لیے مجھے آپ کی اجازت چاہیے ڈیڈ۔" عارف خاموش تھا۔ دانش وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور اب وہاں صرف عارف ہی رہ گیا تھا اب سارہ کی باتوں کے ساتھ دانش کی بھی باتیں اس کے دماغ میں گونجنے لگیں اور انہی باتوں میں الجھے ہوئے کب اس کی آنکھ لگ گئی پتا ہی نہیں چلا۔ صبح سارہ کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی جو اس کے کندھے سے پکڑ کر ہلا رہی تھی۔ "اٹھ جائے صبح ہو گئی

ہے اور آفس کے لیے بھی لیٹ ہو رہے ہیں۔ وہ ابھی تک ناراض تھی اس کی ناراضی اس کی باتوں سے جھلک رہی تھی عارف نے بھی خاموشی سے سر ہلا دیا اور وہ واپس چلی گئی ناشتے کے ٹیبل پر وہ اکیلا ہی تھا یا سارہ اسے ناشتا دے رہی تھی۔"

"دانش کہاں ہے آٹھ بج رہے ہیں۔ وہ آیا نہیں عارف نے سر اٹھا کر سارہ سے پوچھا آج شام کو کچھ مہمان آرہے ہے اس لیے کچھ اچھا سا بنا لینا۔" "جی بنا دوں گی وہ مختصر سا جواب دے کر کھانا کھانے لگی تھی۔ کیوں کے وہ جانتی تھی کے عارف کے اکثر دوست آجایا کرتے تھے۔

✡ ✡ ✡

شام کو عارف جلدی آفس سے آگیا تھا جو صوفے پر بیٹھے کسی کو فون کرنے میں مصروف تھا سارہ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ایسے کون سے مہمان ہیں جیسے ہر تین منٹ بعد فون کر کے ان کے پہنچنے کا پوچھا جا رہا تھا۔ "کیا ہوا ابھی تک پہنچے نہیں۔" سارہ اس کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔ "ہاں بس آنے ہی والے ہیں۔ علیزے کہاں ہے۔"

"وہ اپنے کمرے میں ہے بس روئے ہی جا رہی ہے جب سے اسے پتا چلا ہے کے اذان کا نکاح ہو گیا ہے

بہرا

ایک بہرا دیہاتی بیگن لیے جا رہا تھا، راستے میں اس کا دوست مل گیا

دوست: "کیوں بھائی، خیریت تو ہے؟"

دیہاتی: "بینگن لے کر جا رہا ہوں۔"

دوست: "بچے تو ٹھیک ہیں؟"

دیہاتی: "ہاں، گھر جا کر سب کا بھرتہ بناؤں"

لیکن اسے کیا پتا کہ یہ جھوٹ ہے۔" سارہ نے شکایت کی نظر سے اسے دیکھا۔ "لیکن اب نہیں روئے گی۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔"

"السلام علیکم بڑے صاحب۔" وہ پوچھ رہی تھی کہ سامنے سے آنے والی آواز نے اسے روک دیا۔ دروازے پر اذان اور اس کی ماں کھڑی تھی۔

"وعلیکم السلام آؤ اندر آؤ جاؤ۔" وہ دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے وہاں چاروں ہی بیٹھے تھے سارہ بار بار عارف کو دیکھے جا رہی تھی۔ سارہ اور پروین کے درمیان گفتگو شروع ہوگئی۔ "میں جانتی ہوں بڑے صاحب بچوں کی خوشی کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے اور یہ آپ کا بڑا پن ہے ورنہ ہماری اتنی اوقات کیا جو ہم آپ سے رشتہ جوڑ سکیں اذان سر جھکائے بیٹھا تھا سارہ سمجھ گئی تھی اور خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔

"اذان۔" عارف کی آواز سنتے ہی اس نے سر اٹھا کر عارف کی طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم علیزے کو خوش رکھو گے جیسے پہلے رکھتے تھے میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں بس کچھ وقت کے لیے پیسے اور ترقی کے لیے لالچی ہوگیا تھا لیکن شکر ہے کے میرے بیٹے اور بیوی نے اچھے وقت پر ہی مجھے اس راستے سے واپس لے آئے ورنہ ساری عمر پچھتاتا۔" عارف نے بولتے بولتے سارہ کی طرف دیکھا "اور ہاں وہ بہت رو رہی ہے تمہارے لیے اذان اب مت رونے دینا۔" علیزے واش روم میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی باہر نکل کر شیشے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ شیشے میں ہی عکس دیکھ رہی تھی۔ ساری رات رونے سے آنکھیں سوجی ہوئی تھی۔ "بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہیں اس حال میں۔ اذان کی آواز سن کر اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے دروازے کے سامنے پا کر وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ یہ اس کا وہم ہے سچ میں بس دیکھتے ہی جا رہی تھی "میں نے آپ کو ایسا نہیں بھیجا تھا جیسا میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"اب کیوں آئے ہو اذان اگر یہ دیکھنے آئے ہو کے تمہاری شادی کا سن کر میں مر تو نہیں گئی تو دیکھ لو زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے پر صرف باہر سے تم نے تو مجھے ٹھکرا کر شادی کرلی اور خوش بھی ہو۔

"میں خوش نہیں ہوں اور رہی شادی کی بات تو وہ میں نے نہیں کی۔"

"تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔"

"ہاں اذان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری میں صرف آپ سے محبت کرتا ہوں اس دل میں ایک خاص جگہ ہے جو صرف آپ کے لیے ہے وہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔" اذان نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے

"تو پھر کیوں ہر بار انکار کرتے رہے۔"

"اذان کبھی کبھی انسان اپنی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے نہ آپ کو پانے کی اوقات تھی اور نہ آپ کو چھوڑنے کا حوصلہ تھا۔ یہ سب میں نے کیوں کیا مت پوچھیں تو اچھا ہے۔

"کیوں نہ پوچھوں سب پوچھوں گی ایک ایک چیز کا بدلہ لوں گی تم سے۔" علیزہ نے ضد کے انداز سے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے آپ اپنے آنسو تو صاف کرلوں میں نے بڑے صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ اب ایک بھی آنسو آپ کی آنکھوں میں نہیں آنے دوں گا۔

"کیا تمہیں ڈیڈ نے بلایا ہے۔" وہ اذان کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔

"شاید وہ بھی آپ کی ضد کے آگے ہار گئے تھے۔" اذان پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تو اس شرم کے مارے اپنی بانہوں کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا۔ "آئی لو یو اذان" "آئی لو یو ٹو بیگم صاحبہ۔" "اف اذان اب تو بیگم صاحبہ کہنا چھوڑ دو۔"

"اب تو اور بھی عادت ڈالنی پڑے گی۔" اس الفاظ کی اذان کے ساتھ اس کی ہر وہ خوشی واپس آگئی تھی جو وہ بہت پہلے اس کے پاس چھوڑ کے آگئی تھی۔

☆ ☆

کتے کی چوری

شکیل صدیقی

اس چور کی روداد جو چور ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں قابل عزت تھا اور معززین اس کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ ایک ننھے سے کتے کا احوال جو بظاہر عام سا کتا تھا مگر کسی کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔

شہزاد اور اس کی محبوب نازش کا تازہ کارنامہ

نازش نے گیٹ پر لگی ہوئی تختی پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی' کیونکہ وہ اسی علاقے میں تھی' جہاں کے لیے اسے ہدایت ملی تھی۔ اس لیے اس نے بنگلا نمبر کو غور سے دیکھا۔ بالکل صحیح وہ ایسا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ منزل مقصود کے قریب پہنچ گئی ہے۔ لہٰذا اس نے اطلاعی گھنٹی بجادی۔

اس وقت اس نے سماجی ورکر کا روپ دھار رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں اور غیر اہم سا لٹریچر تھا' مگر اس کی مجموعی شخصیت سے پتا چل رہا تھا کہ وہ حقیقت میں سوشل ورکر ہی ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک اجڈ سا ملازم باہر آیا اور اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''جی' کس کو ملے گا بی بی؟''

''بیگم صاحبہ سے۔''

''بیگم صاحبہ تو مصروف ہے اس وقت میں۔''

''کیوں' کیا کررہی ہیں؟''

''صاب سے لڑائی کررہا ہے۔''

''صاحب لڑائی کررہے ہیں یا بیگم صاحبہ؟''

''دونوں.....''

''اچھا..... ان کو بتاؤ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے ایک آفیسر آئی ہیں۔'' نازش نے کہا۔ شدید امکان اس بات کا تھا کہ وہ ہولو قسم کا ملازم اچھی طرح سے بات کو بیگم صاحبہ تک منتقل نہیں کرسکے گا۔ ہوا بھی یہی۔

دس منٹ بعد بیگم صاحبہ ازخود گیٹ تک آئیں اور نازش کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔

''فرمایئے؟'' انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

وہ دہرے جسم کی خاتون تھیں اور پھول دار شلوار اور جمپر پہنے ہوئی تھیں۔ نازش نے اندازہ لگایا کہ وہ جو بلی کی لان ہے' جس کا سوٹ ایک ہزار کا پڑتا ہے۔ وہ چھ سو گز کا بنگلا تھا' جس کے کارپورچ میں ایک کار بھی کھڑی تھی۔ دو بالغ بچے لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اس لیے مالک مکان کو ایسا سوٹ تو پہننا ہی چاہیے تھا۔

''جی میں سوشل ورکر ہوں۔''

''اچھا تو پھر؟'' انہوں نے پھر سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

نازش سٹپٹا گئی۔ تاہم اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور کہا۔ ''آہم..... ام..... میرا مطلب ہے ہم لوگ ان دنوں نفسیات پر تحقیق کررہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اندر آنے کا موقع دیں تو.....''

''لیکن کون سے ادارے سے آئی ہیں آپ؟''

''عالمی ادارہ صحت ہے۔''

'' WHO ''

''ج..... جی ہاں۔'' نازش لحظہ بھر کو ہکلا گئی۔ پھر یہ سوچ کر اس نے اپنی ڈھارس بندھائی کہ اس کے شناختی کاغذات تھوڑی چیک کیے جائیں گے۔ نہ ہی یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ ادارے سے اپنا تعلق ثابت کرے۔

''میرا انٹرویو لوگی؟''

''جی نہیں..... جی ہاں.....'' نازش کو ''جی نہیں۔'' کہہ فوراً ہی احساس ہوگیا کہ اگر بیگم صاحبہ کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوگئی تو پھر بنگلے کا گیٹ نہیں کھل سکے گا اور وہ وہاں داخل ہی نہیں ہوسکے گی۔ لہٰذا ہاں نا کہہ کر اسے اندر جانا ہے اور پھر دوسرے مرحلے میں.....

''بغ بغ بغ.....'' دفعتاً لان کی طرف سے آواز آئی اور چھوٹی نسل کا ایک سیاہ کتا دوڑتا ہوا وہاں آگیا' جسے بیگم صاحبہ نے جھک کر گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگیں۔

''چارلی ہے' چارلی۔'' انہوں نے کتے کا تعارف کرایا۔ ''میرے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ میں جہاں کہیں بھی جاؤں' تھوڑی سی دیر میں ڈھونڈ نکالتا ہے۔''

نازش کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ گم صم حالت میں اس کتے کو دیکھ رہی تھی۔ شہزاد نے کہا تھا کہ اس کتے کو چوری کرنا ہے جو 6/11 ڈیفنس میں ہے۔

اس کا رنگ سفید ہے اور آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے... مگر نہیں... اس نے کہا تھا کہ سیاہ کتا ہے اور آنکھوں کے گرد سفید دائرے... بالکل ٹھیک... یہ وہی ہے... چارلی... کتنا نزدیک ہے... اس کے ہینڈ بیگ میں آجائے گا... یاہو... گویا پچیس ہزار روپے ہاری جیب میں آگئے۔

مگر کتے کو چوری کرنے کے لیے تو اس نے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا تھا۔ وہ تو آج صرف جائزہ لینے آئی تھی۔

"اف... دوسرا مرحلہ خود چل کر اس کے نزدیک آگیا تھا۔ جلدی سے سوچنا چاہیے، ممکن ہے کوئی ترکیب سمجھ میں آجائے۔

" "ہاں تو انٹرویو لوگی نا؟"

"جی ہاں..." نازش نے عالم رنگ و بو میں واپس آتے ہوئے کہا۔

انہوں نے گیٹ ابھی تک نہیں کھلوایا تھا اور سوالوں کے جوابات لے کر پہلے اطمینان کرنا چاہتی تھیں۔

"جی گاڑی کہاں ہے تمہاری؟"

"جی گاڑی تو... پارکنگ..."

"پارکنگ لاٹ پر کھڑی کردی؟ کیوں بھئی؟ یہیں لے آتیں... یہاں تو تین گاڑیاں پارک ہوجاتی ہیں۔ حمیدی صاحب نے اسے ایسا ڈیزائن کیا ہے کہ... بس... اوہ ہاں... گاڑی یہیں بلالو... موبائل کے ذریعے... فوٹوگرافر تو ساتھ لائی ہو نا؟"

"فوٹوگرافر؟" نازش کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔

"تمہارے میگزین میں تصویریں نہیں آئیں گی میری؟ تمہارا تعلق میگزین سے ہے یا اخبار سے" وہ روانی میں بول رہی تھیں۔ ایک بار پھر انہوں نے فراموش کردیا تھا کہ نازش نے اپنا تعلق عالمی ادارہ صحت سے بتایا ہے۔

"تص... وی... ریں... تت... تو آئیں گی لیکن اس کے لیے ہم نے دوسرا دن رکھا ہے۔ آج فوٹوگرافر مصروف ہے نا۔" نازش نے ہکلاتے ہوئے بات بتائی۔

"آچ... چھا... اندر آجاؤ۔" انہوں نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تو وہ اندر چلی گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ ڈرائنگ روم سامنے ہی ہوگا، لیکن انہوں نے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ نازش ادھر ہی چلی گئی۔ بیگم صاحبہ اس کے پیچھے تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے ہوتی ہوئی لاؤنج میں پہنچ چکی تھیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی راستہ سامنے سے بھی آتا ہوگا۔ لیکن وہاں سے نہ آنے کی وجہ ممکن ہے یہ رہی ہو کہ دروازے لاک ہوں یا وہاں مہمان وغیرہ ہوں۔

لاؤنج سادگی سے آراستہ تھا۔ اس کے ساتھ ڈائننگ ملحق تھا۔ اس لیے وہاں کی دیواروں پر پھل، سبزیوں اور کھانے کی ڈشوں کی چھوٹی چھوٹی پینٹنگز لگی تھیں۔ ایک چھوٹا سا قالین تھا۔ مختصر صوفہ سیٹ اور ایک عدد رنگین ٹیلی ویژن، بچوں کے چند ریموٹ کنٹرول کھلونے بھی پڑے تھے۔ ہر ایک چیز سے امارات کا اظہار ہو رہا تھا۔

بیگم صاحبہ نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کتا ابھی تک ان کی گود میں تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ کتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے ان کی گود میں دبکا بیٹھا تھا اور منہ کھول کر سانسیں لے رہا تھا۔ بیگم صاحبہ شاید اسے اپنی گود سے گرمی پہنچانے کی عادی تھیں۔

"ہوں تو تم نفسیات پر میرے خیالات جاننے آئی ہو؟"

"جی... جی ہاں۔" نازش نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مم... میں... وہ..."

"ایسی جلدی کیا ہے؟" انہوں نے دلکش اور دل آویز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "پہلے ذرا چائے، کافی پیتے ہیں، پھر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گی۔" انہوں نے نازش کے بولنے سے پہلے کہا۔

"مگر میں تو..."

"شام کو گرم مشروبات نہیں لیتیں؟" انہوں نے پھر تیزی سے اس کا جملہ مکمل کیا۔ "ٹھیک ہے تو پیپسی پی لو۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے آواز دی تو کچن سے ایک معقول صورت ملازمہ برآمد ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے اسے پیپسی کا ٹن لانے کا حکم دیا۔ ریفریجریٹر کچن کے دروازے پر ہی رکھا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک ڈبا نکالا اور کرسٹل گلاس میں پیپسی انڈیل کر ایک طشتری میں رکھ کر لے آئی۔

بیگم صاحبہ نے اپنے لیے بلیک کافی بنانے کا حکم دیا۔

"نفسیات!" انہوں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"نفسیات پر تو میں گھنٹوں بول سکتی ہوں۔ یہ تو میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ مردوں کی نفسیات سے لے کر گھوڑوں کی نفسیات تک پر تقریر کرسکتی ہوں۔"

"لیکن بیگم صاحبہ میں تو۔۔۔" نازش نے ہاتھ سے پیپسی کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ مگر ایک بار پھر انہوں نے اسے بولنے نہیں دیا۔

"تم انٹرویو کے انداز میں لکھ لینا۔" انہوں نے کہا۔

"مجھ میں یہی خرابی ہے۔ جب خیالات آنا شروع ہوتے ہیں تو میں بولتی ہی چلی جاتی ہوں۔ بالکل نہیں رکتی۔ انٹرویو لینے والوں کا بس نہیں چلتا ورنہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیں۔"

ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی آئی اور اس نے ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی اٹھائی اور ایک کپ لبریز کرنے کے بعد چلی گئی۔ باقی لوازمات میں صرف کینڈرل کی گولیوں کا پیکٹ تھا جو اس نے کپ کے قریب رکھ دیا تھا۔ اس سے نازش کو معلوم ہوگیا کہ بیگم صاحبہ شوگر کی مریضہ ہیں۔

"اچھا ہاں۔" انہوں نے کینڈرل کی دو گولیاں بلیک کافی میں ڈال کر چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ "تو تم عالمی ادارہ صحت کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں کہ انہیں مردوں کی نفسیات پر میرا انٹرویو چاہیے۔۔۔ ارے بھئی ان کی نفسیات بہت ٹیڑھی ہوتی ہے۔ بس جہاں کسی لڑکی کو دیکھا اور لگے رال بہانے۔۔۔ اسی بات پر تو میں اپنے شوہر سے لڑ رہی تھی کہ جب آفس میں ایک لیڈی سیکرٹری رکھی ہوئی ہے تو پھر گھر پر دوسری رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کا کمرہ کہاں ہے' جانتی ہو؟ اوپر۔۔۔ اور وہاں کسی کو بغیر بلائے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ خیر جانا بھی نہیں چاہیے بچوں کو۔۔۔ آفس کا ڈھیروں کام ہوتا ہے۔۔۔ مگر میں کہتی ہوں کہ دوسری رکھ کر آپ کیا کریں گے؟ ٹانگیں دبوائیں گے؟ ٹانگوں پر یاد آیا کہ میری ٹانگوں میں کل رات سے درد ہے۔۔۔ یہ کم بخت شوگر' اس کا بھی کوئی علاج ہے کہ نہیں۔۔۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔۔۔ کیا کہہ رہی تھی؟"

"یہی کہ مردوں کی نفسیات اچھی نہیں ہوتی' مگر میں تو آپ سے کتوں کی نفسیات پر اظہار خیال کرنے آئی تھی۔"

"کتوں کی نفسیات۔۔۔ اوہ! اف۔۔۔ غٹاپ۔۔۔" ان کے منہ سے کافی چھلک کر جمپر پر گر گئی اور گود میں بیٹھا چارلی اچھل کر فرش پر جا پڑا۔ وہ دائرے میں گھوم کر چند لمحوں تک کوں کوں کرتا رہا' پھر خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اب وہ نازش سے بہت قریب تھا گویا پچیس ہزار روپے اس کے سامنے پڑے تھے اور وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں اپنے پرس میں ڈال سکتی تھی۔

بیگم صاحبہ نے کافی کی پیالی پرچ میں رکھی اور اٹھتی ہوئی بولیں۔ "ٹھہرو میں جمپر بدل کر آئی ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ سوٹ بدل لیں۔" نازش نے رائے دی' تاکہ اسے کتے کو اپنے وینٹی بیگ میں ڈالنے کا موقع مل جائے۔ "شلوار پر بھی دھبے پڑ گئے ہیں۔"

"اوہ ہاں۔۔۔ مگر یہ کتوں کی نفسیات؟ عالمی ادارہ صحت کو کون لوگ چلا رہے ہیں؟ کتوں کی نفسیات معلوم کرکے وہ کیا کریں گے؟ ان کی نفسیات تو بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ ہاں البتہ دم ٹیڑھی ہوتی ہے۔ ہمیشہ ہی ٹیڑھی رہتی ہے۔ پیدائشی ایسے ہوتے ہیں۔ اس

میں ان کا قصور نہیں ہے۔ قدرت کی مرضی۔ میرا چارلی تو کبھی کبھار دم سیدھی بھی کرلیتا ہے' مگر کتوں کی نفسیات پر انٹرویو؟ تو کیا چارلی کے ساتھ تصویریں کھنچوانا پڑیں گی؟ اچھا میں دیکھتی ہوں۔ ابھی آئی۔" وہ دائیں جانب کی خواب گاہ کی طرف چلی گئیں۔ چارلی ان کے پیچھے چلنے لگا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ اسٹوپڈ۔" انہوں نے مڑ کر اسے تنبیہہ کی۔ "میں کپڑے بدلنے جارہی ہوں۔"

چارلی بہترین سدھایا ہوا کتا تھا اور ان کی زبان سمجھتا تھا۔ اس لیے ٹھٹک کر وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے پنجوں پر سر کو ٹکایا اور پچھلی ٹانگیں سیدھی کرلیں۔ نازش کا دل رفتار سے دھڑکنے لگا۔

بیگم صاحبہ نے کمرے میں جاکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ ملازمہ کچن میں تھی اور وہ چارلی کے ساتھ وہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ اب وہ آخری مرحلے میں تھی۔ شہزاد نے کتے پر قابو پانے کے لیے اسے تین چیزیں دی تھیں۔ نازش نے اس میں سے پہلی چیز نکالی۔ وہ ایک بڑی چاکلیٹ تھی جو خاص طور پر کتوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ شہزاد نے اس میں خواب آور دوا انجکٹ کردی تھی۔

اس کے پرس میں ایک چاکلیٹ اور تھی' تاکہ وہ اسے کھانا شروع کردے تو کتے کو ترغیب ہو۔ نازش نے کتے کو کھلانے والی چاکلیٹ پر اپنے ہاتھ سے ایک مخصوص نشان بنالیا تھا' تاکہ وہ اسے استعمال کرکے خود الٹا غفیل نہ ہوجائے۔ ایک بار جب وہ ایک سیٹھ کے بنگلے پر چائے کی پیالیاں چوری کرنے گئی تھی تو اس کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آگیا تھا۔

اس نے پیکٹ دیکھ کر چاکلیٹ نکالی اور اس کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔ کتے کے نتھنوں میں خوشبو گئی تو اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ پھر اس نے پنجوں سے سر اٹھالیا۔ اس کے بعد اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ نازش نے اس کا مخصوص چاکلیٹ کا پیکٹ پھاڑ کر نکالا اور اس کی طرف لہرایا تو چارلی اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا اور اس کی زبان لپلپانے لگی' جیسے وہ زبان کو دراز کرکے اس سے چاکلیٹ کو گرفت میں لے لے گا۔

نازش نے چاکلیٹ اپنے قدموں میں پھینک دی۔ چارلی نے جست لگائی' اس کے قریب آیا' پھر چاکلیٹ کو اپنے دانتوں میں دبایا اور ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ اس نے جب رغبت سے چاکلیٹ کھانا شروع کردی تو نازش نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ بالکل آخری مرحلے میں پہنچ چکی تھی۔ کتا بے ہوش ہوجاتا' اس کے بعد وہ اسے اٹھا کر وینٹی بیگ میں ڈال لیتی۔

شہزاد نے بتایا تھا کہ چاکلیٹ میں انجکٹ کیا جانے والا محلول سریع الاثر ہے اور جب کتا اسے زبان پر رکھے گا یا اسے چاٹ لے گا تو اسے فوراً ہی نیند آنے لگے گی۔ مگر یہاں تھوڑی سی الٹ پھیر ہوگئی کہ کتے نے چاکلیٹ کے بڑے ٹکڑے پر دو منہ مارے اور اسے نگل گیا۔

نازش کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔

وفور شوق سے وہ زبان نکال کر اور کان کھڑے کرکے پھر اس کے نزدیک آگیا' جیسے مزید چاکلیٹ کا مطالبہ کررہا ہو۔ اچانک خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ نمودار ہوئیں۔ انہوں نے دوسرا جوڑا پہن لیا تھا۔ "وہ تم نے فوٹو گرافر کو بلالیا؟ دیکھو یہ پرنٹ کیسا ہے؟ گل احمد کا ہے۔ جب مارکیٹ میں آیا تھا تو میں نے پہلے ہی روز لے لیا تھا۔"

"پرنٹ تو اچھا ہے' مگر جوبلی کی بھی کیا بات ہے۔"

"جوبلی کے پانچ جوڑے ہیں میرے پاس۔" وہ بولیں' پھر اچانک ان کی نگاہ چارلی پر پڑی جو منہ کھولے دو ٹانگوں پر کھڑا تھا اور زبان لپلپا رہا تھا۔ "کیا چاہیے چارلی؟ اس طرح سے زبان کیوں نکالی ہوئی ہے؟ ڈونٹ بی سلی۔ یہ مہمان ہیں ہماری۔ تمیز سے بیٹھو۔"

"لغ لغ۔" چارلی نے کہا اور چاروں ہاتھوں پیروں پر کھڑا ہوگیا' مگر اس کی بے چین نگاہیں نازش کے ہاتھوں کا طواف کررہی تھیں جس میں ایک چاکلیٹ دبا ہوا تھا اور جو اس کے منہ میں جانے کے بجائے

نازش کے منہ میں جارہا تھا۔

"بغ بغ۔" اس نے کہا اور نازش کے قریب آکر تیزی سے دم ہلانے لگا۔ اس پر اضطراری کیفیت طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نازش کے ہاتھوں میں دبی ہوئی چاکلیٹ جھپٹ لینا چاہتا ہو۔

"ایڈیٹ' دور بیٹھو جاکر۔" بیگم صاحبہ نے اسے پھر ڈانٹا۔

چارلی تربیت یافتہ تھا۔ اپنی مالکہ کی بات سمجھ گیا۔ اس نے فوراً" حکم کی تعمیل کی اور دور ٹیلی ویژن کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ پہلے کی طرح اس نے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں سمیٹیں اور ان پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

نازش کو اچھی طرح سے علوم تھا کہ اب وہ سو جائے گا۔ پھر وینٹی بیگ کھول کر اسے وہاں سے لے جانا کیا مسئلہ ہوگا؟ ہاں البتہ بیگم صاحبہ کا خیال رکھنا پڑے گا۔ بہتر ہوگا کہ انہیں کسی ایسے کام میں مصروف کردیا جائے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے دفعان ہوسکیں۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بیگم صاحبہ کھڑی ہوگئیں۔ فون کا ایک کنکشن لاؤنج کے کچن والے کونے پر تھا اور دوسرا خواب گاہ میں۔ غالباً" وہ "خاص" کال تھی' اس لیے بیگم صاحبہ خواب گاہ کی طرف چلی گئیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نازش کی موجودگی میں بات نہ کرنا چاہتی ہوں۔

خواب گاہ کا دروازہ بند ہوتے ہی نازش اپنی جگہ سے اٹھی اور وینٹی بیگ لے کر کتے کے قریب پہنچ گئی' مگر اس نے جوں ہی اسے اٹھانا چاہا' وہ ایک خوف ناک غراہٹ کے ساتھ کھڑا ہوگیا' پھر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"چارلی... چارلی... کیا بات ہے؟" ملازمہ نے کچن سے نکل کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری تھی۔ غالباً" وہ شام کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اور سبزی کاٹ رہی تھی۔

چارلی کوں کوں کرتا ہوا اس کی ٹانگوں کے قریب چلا گیا۔

"یہ آپ کیا کررہی ہیں؟" اس نے چونک کر نازش سے پوچھا۔ "اپنا بیگ آپ نے کیوں کھولا ہوا ہے؟"

"اس میں سے میں چارلی کے لیے چاکلیٹ نکال رہی تھی۔ اسے چاکلیٹ پسند ہیں نا؟"

"چارلی دوسروں کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھاتا۔" ملازمہ نے کہا۔

چارلی پر غنودگی طاری تھی' اس لیے وہ چند لمحوں کے لیے تو ملازمہ کے نزدیک کھڑا رہا' پھر الٹے قدموں چلتا ہوا ٹیلی ویژن کے قریب چلا گیا اور ایک مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔ گھروں میں کتے اور بلیاں ایک مخصوص جگہ پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔

بیگم صاحبہ کے باتیں کرنے کی آوازیں خواب گاہ سے آرہی تھیں۔ نازش کو ایک کارڈلیس لاؤنج کے گوشے میں رکھا دکھائی دیا۔ مگر بیگم صاحبہ نے اسے آن کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ ملازمہ چند لمحوں تک وہیں کھڑی رہی' پھر کچن میں چلی گئی۔ نازش کی حالت عجیب ہورہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نیند کتے پر غالب آرہی ہے اور دو منٹ بعد اسے ہاتھ لگایا جائے گا تو وہ مزاحمت نہیں کرے گا۔ لیکن اندیشہ تھا کہ بیگم صاحبہ سر پر سوار نہ ہوجائیں۔

اچانک لائٹ چلی گئی اور گھپ تاریکی چھا گئی۔

اس وقت پاور فیل ہوجانا نازش کے لیے کسی رحمت سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنا وینٹی بیگ لے کر گئی اور اس نے اندازے سے ٹیلی ویژن کے قریب فرش کو ٹٹولا۔ کتے کی کمر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے اسے بیگ میں ڈال لیا۔

اچانک ایمرجنسی لائٹس جل اٹھیں۔ ایک کچن میں' دوسری لاؤنج میں۔ کافی روشنی ہوگئی۔ نازش الٹے قدموں چلتی ہوئی صوفے کے نزدیک گئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ یہ سب ایک یا ڈیڑھ منٹ میں ہوگیا تھا۔

دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ خواب گاہ سے نکل آئیں۔ "محشر صاحب کا فون تھا۔ وہ مجھ سے ایک جلسے

کی صدارت کرانا چاہتے تھے۔ ایک این جی او ہے ان کی۔ کافی مال کھا رہے ہیں' یو این او والے چائلڈ رائٹس پر 29 جون کو تقریب منا رہے ہیں نا۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟" نازش نے یوں ہی پوچھ لیا۔ ورنہ اب اسے بیگم صاحبہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا آخری مرحلہ مکمل کرلیا تھا۔ کتا اس کے پرس میں تھا۔ گویا وہ پچیس ہزار کی مالک بن چکی تھی۔

29 تاریخ کو میں ایک اور جگہ بزی ہوں۔ شاپنگ سینٹر کا افتتاح کرنا ہے۔ بریگیڈیئر انعام الحق مہمان خصوصی ہوں گے۔ مگر فیتہ میں کاٹوں گی۔ شاپنگ سینٹر میں واشنگ فیکٹری ہے۔ کلاسک والوں نے اپنی ایک شاخ کھولی ہے۔ پلانٹ کے لیے انہوں نے بوائلر خریدا ہے۔ اپنے ہی ملک کا بنا ہوا ہے۔ باہر کا ہوتا تو اچھا تھا۔ خیر بریگیڈیئر صاحب اس بوائلر کا افتتاح کریں گے اور ملکی مصنوعات کے فروغ پر تقریر فرمائیں گے۔ پھر ڈنر ہوگا اور اپنے گھروں کی واپسی۔ یہ جب تک ڈنر وغیرہ نہ ہو' مزا ہی نہیں آتا' حالانکہ میں زیادہ نہیں کھاتی ہوں' ویسے بھی چاول' بریانی وغیرہ منع ہے۔ اس لیے میں ٹھیک سے کھا نہیں پاتی۔ اف یہ لائٹ نہ جانے کب آئے گی۔ جنریٹر اسٹارٹ ہو تو پنکھے وغیرہ چلیں۔ یہ غفورا نہ جانے کہاں مرگیا۔ ایک تو یہ لائٹ نے بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ میز کریم پچھلے مہینے نیویارک میں رہ کر آئی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ پانی اور لائٹ وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں ٹینکر سے پانی ڈالو۔ بجلی چلی جائے تو جنریٹر چلاؤ۔ میں نے تو کئی بار کہا ہے ان سے کہ اب نیویارک چلتے ہیں' فاکہہ بھی تو وہیں رہ رہی ہے۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ وہاں ٹھیکے کہاں سے ملیں گے۔ کمیشن وغیرہ کا بھی کوئی چکر نہیں ہے۔

"لائٹ چلی گئی ہے۔ اس لیے آپ پریشان ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کل آجاؤں۔" نازش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آں... ہاں... بھئی یہ ایرکنڈیشنر بند ہوجاتا ہے تو طبیعت بولانے لگتی ہے۔ جنریٹر چلنے بھی لگے تو زیادہ سے زیادہ پنکھا چل پڑے گا اور بس۔ اچھا تم جاؤ' مگر کل آنے سے پہلے فون کرلینا۔" انہوں نے اپنا کارڈ نازش کو تھمادیا۔

نازش نے اس پر نظر ڈالے بغیر پرس میں رکھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ 9/11 ہے اور وہاں مسز اورنگ زیب رہتی ہیں۔

وہ ان کا شکریہ ادا کرکے سائیڈ والے دروازے سے نکل آئی۔ بیگم صاحبہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ اچانک پچھواڑے لگا ہوا جنریٹر چل پڑا اور سارے بنگلے میں پھر سے روشنی پھیل گئی۔ غالباً پرانا تھا' اس لیے آواز دے رہا تھا۔

نازش جب گیٹ سے نکلنے لگی تو انہوں نے کہا۔ "تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ ڈرائیور سے کہتی ہوں تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔"

"یہیں چوراہے پر۔" نازش بولی۔

وہ حقیقت میں کار میں لفٹ لے کر جانا چاہتی تھی' تاکہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل سکے۔ بیگم صاحبہ کی ہدایت پر ڈرائیور نے گاڑی نکالی اور نازش کو لے کر چوراہے پر چھوڑ دیا۔ وہ بوٹ بیسن کے قریب تھی جہاں کیفے ڈولفن میں شہزاد اس کا انتظار کر رہا تھا۔

جب وہ کار واپس چلی گئی تو نازش اترائی ہوئی کیفے میں داخل ہوئی۔ شہزاد سب سے آخری میز پر بیٹھا اور اس کے ہاتھ میں روزنامہ ڈے نائٹ دبا ہوا تھا۔ اس نے نازش کو دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا اخبار تہ کرکے رکھ دیا۔

نازش نے کرسی سنبھالی تو شہزاد نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کیا رہا؟ تمہیں اتنی دیر کیسے ہوگئی؟ جانتی ہو کیا ٹائم ہوا ہے؟ آٹھ بج کر ساڑھے آٹھ منٹ ہوچکے ہیں' میں تو مایوس ہوگیا تھا۔"

"مایوس تو میں بھی ہوچکی تھی۔ شکر ہے کہ لائٹ چلی گئی اور مسز اورنگ زیب اس سے اتنی پریشان ہوئیں کہ..."

"مگر مسز اورنگ زیب کیوں پریشان ہوئیں؟" شہزاد نے ناک سکیڑ کر کہا۔ "ویسے بھی اگر وہ پریشان ہو رہی

"...دیتیں۔"
"مطلب؟"
"مطلب یہ کہ 9/11 میں تو مسز خان رہتی ہیں اور ان ہی کا کتا لاتا تھا۔"
" 9/11 میں مسز خان' یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"
"چونک کر بولی۔ "میرے پاس ان کا کارڈ بھی ہے یہ دیکھو۔" اس نے پرس کھول کر ان کا کارڈ نکال لیا۔ مگر اس پر 6/11 چھپا تھا۔ نام مسز اورنگ زیب ہی تھا۔
"تم اس نمبر پر کیوں چلی گئی تھیں؟"
"اس لیے کہ وہ 9/11 ہی تھا۔" نازش نے جھنجلا کر کہا۔
"اچھا کتا دکھاؤ۔" شہزاد بولا۔
نازش نے وینٹی بیگ کھول کر اس کی جھلک دکھا دی۔
"اوہ خدایا یہ تو... یہ تو... سیاہ ہے... بالکل۔"
"نہیں... آنکھوں کے گرد سفید دائرے بھی ہیں۔" نازش نے سرگوشی میں کہا۔
"مگر مجھے سفید کتا چاہیے جس کی آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے ہیں۔" شہزاد نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم اس کا بالکل الٹ لے آئیں۔ اب کالے کی جگہ سفید اور سفید کا کالا کیسے بناؤں؟"
"جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ میں 9/11 میں گئی تھی اور وہاں..."
"میرا خیال ہے کہ تم پہلے ایک کپ چائے پیو میرے اکاؤنٹ میں۔ جب تمہارا دماغ قابو میں آجائے تب ہم اس موضوع پر دوبارہ بات کریں گے۔" اس نے رسانیت سے کہا' پھر ویٹر کو بلا کر دو کپ چائے لانے کو کہا۔
"ایسے ایریا میں لائٹ زیادہ دیر کے لیے نہیں جاتی ہے۔" شہزاد بولا۔ "اب تک آچکی ہوگی اور اس کتے کی گمشدگی معلوم ہو چکی ہوگی۔ ممکن ہے کھلبلی مچ رہی ہو اور ڈرائیور کو اس طرف دوڑایا جا رہا ہو۔ بہتر ہوگا کہ ہم اسے خود وہاں چھوڑ آئیں۔"
"لیکن یہ بے چارہ تو بے ہوش ہے۔ آہ میرے پچیس ہزار۔"
"ابھی ہوش میں آجائے گا۔" شہزاد نے کہا۔ پھر اپنے بیگ سے ایک سرنج نکال کر اس میں ایک دوا بھری اور کتے کی گردن کے قریب انجکشن کر دی۔ یہ کام اس نے میز کی آڑ میں کیا تھا' تاکہ کسی اور کی نظر نہ پڑے۔ "یہ پہلے والی دوا کا اینٹی ڈاٹ ہے۔ اس کے اثر کو ختم کر دے گا۔"
"مگر یہ ہوش میں آنے کے بعد بھونکنے اور کاٹنے لگے گا۔" نازش نے اندیشے کا اظہار کیا۔
"ہم چائے ختم کر کے اس طرف چلتے ہیں۔ راستے میں اسے ہوش آجائے گا تو تم گود میں لے لینا۔" شہزاد نے اسے سمجھایا۔ "اس کی مالکہ سے یہ کہنا کہ تمہارے پیچھے پیچھے آگیا تھا اور کار میں آکر پہلے سے بیٹھ گیا تھا۔ ساتھ ہی اتر گیا' تمہاری لاعلمی میں' جب تمہیں علم ہوا تو تم واپس کرنے آگئیں۔"
"ہاں... یہ مناسب رہے گا۔" نازش نے کہا۔
ایک چائے کا کپ حلق سے اتارنے کے بعد وہ نارمل ہوگئی۔ شہزاد اپنا اسکوٹر لایا تھا۔ جب وہ بل چکا کر اس بنگلے کی طرف جا رہے تھے تو کتے کو راستے میں ہی ہوش آگیا۔ نازش نے اسے گود میں لے لیا۔ کسی کتے کو گود لینے کا اسے پہلا اتفاق تھا۔
شہزاد نے نہ صرف یہ کہ گیٹ کے قریب لگی گھنٹی بجائی' بلکہ پیتل کی نیم پلیٹ کا بھی بغور مشاہدہ کیا۔ اس پر 9/11 ہی لکھا تھا' مگر ہوا یہ تھا کہ 6 کے ہندسے کی اوپری کیل نکل جانے کی وجہ سے وہ گھوم کر 9 بن گیا تھا۔
چارلی کو پا کر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ نازش نے جو کہانی سنائی' اسے سن کر انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں وہ کہانی ان کے حلق سے اتری بھی یا نہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ لوگ چائے پی کر جائیں' مگر انہوں نے شکریہ ادا کر کے جان چھڑائی۔
شہزاد جب نازش کو واپس لا رہا تھا تو اس نے 9/11 کا دور سے نظارہ کیا اور نازش کو بتایا کہ جائے

واردات یہ تھی بینم پلیٹ پر ایک کیل نکل جانے کی وجہ سے اس نے کہیں اور کانشانہ لے لیا۔

11/9 سفید رنگ کی ایک پروقار عمارت تھی اور اس کا اسٹرکچر سپر اسٹرکچر تھا۔ وہ رہائشی عمارت کے بجائے گورنر ہاؤس لگتا تھا۔

"اس میں تو داخل ہونا ہی دشوار لگ رہا ہے۔" نازش نے سرگوشی میں کہا۔ "اور میں اندر چلی بھی گئی تو کوئی ضروری نہیں کہ بیگم خان مل ہی جائیں' اگر مل جائیں تو ضروری نہیں کہ۔۔۔"

"ان کا کتا بھی مل جائے۔" شہزاد نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ "میں نے تحقیق کرلی ہے۔ بیگم خان اور ان کے شوہر آج کل یہیں قیام پذیر ہیں' ورنہ ان کا ایک پاؤں امریکا' انگلینڈ میں ہوتا ہے اور دوسرا وطن عزیز میں۔ سنجیدہ خاتون ہیں' مگر جیسا کہ ایسے گھرانوں کی خواتین کو فیتے کاٹنے کا شوق ہوتا ہے انہیں بھی ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے بنگلے میں داخل ہوجائیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم انہیں کسی تقریب میں مدعو کرلیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بات دل کو لگتی ہے۔"

"مگر ان کے ساتھ دو گارڈز رہتے ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ لازماً بیگم صاحبہ کے کتے کی خبر گیری بھی کرتے ہوں گے۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ جب وہ کسی پبلک مقام پر آئیں تو ان کا کتا بھی ان کے ساتھ ہو۔" نازش بولی۔

"یہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ ان کی شناخت ہے۔ اب تک وہ باتھ آئی لینڈ میں تھے۔ وہاں کسی بنگلے میں داخل ہوکر کتے کو چوری کرنا بہرحال مذاق نہیں تھا۔ نازش نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا تو شہزاد نے سمجھایا کہ اس نے ایک کوشش کی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی' اس لیے اسے ایسی باتیں کرکے خود اپنی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر بیگم کو کسی تقریب میں مدعو کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔" نازش نے کہا۔

"پھر۔۔۔؟ تمہارے ذہن میں کیا ترکیب ہے؟"

"وہ جن تقریبات میں حصہ لینے والی ہوں' ہم اس میں شریک ہوجائیں اور اپنا کام کرلیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "میں آج رات کو ان کی رہائش گاہ پر فون کرکے ان کے پرسنل سیکرٹری سے معلوم کرلیتا ہوں' بلکہ بہتر ہوگا کہ ہم یہ مشق آفس پہنچتے ہی کرلیں۔"

جب وہ آفس پہنچے اور انہوں نے ڈائریکٹری دیکھ کر مسز خان کو فون کیا تو ان کی لیڈی سیکرٹری ترنم جہاں نے ریسیور اٹھایا۔ شہزاد نے اس کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ ستائیس سے تیس سال کی درمیانی عمر کی دوشیزہ ہے۔ اس عمر پر اسے سہ شیزہ کہنا چاہیے تھا' مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں پچاس سالہ دوشیزائیں بھی ہوتی ہیں۔ شہزاد نے اپنے لہجے کو شیریں بنا کر کہا کہ وہ بیگم خان کو ایک تقریب میں مہمان خصوصی بنانا چاہتا ہے۔

اس پر ترنم نے سیکڑوں سوالات کر ڈالے کہ تقریب کا صدر کون ہوگا؟ کہاں ہوگی؟ اور کس نوعیت کی تقریب ہے؟ کب ہوگی وغیرہ۔۔۔ شہزاد نے نہایت اطمینان سے بتادیا کہ ایک شعری مجموعے کی تقریب رونمائی ہے اور جناب صدر وزیر اطلاعات کے سیکرٹری ہیں جن کا تعلق افواج پاکستان سے ہے۔

"شعری مجموعے کی تقریب؟" ترنم نے بے دلی سے کہا۔

"جی تصور خانم کا تیسرا مجموعہ ہے۔" شہزاد بولا۔ وہ بے حساب جھوٹ بول رہا تھا' تاکہ ترنم سے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھا کرلے۔ تصور خانم شاعرہ ی حیثیت سے بہت مشہور تھیں اور ایک مقامی کالج میں انگریزی کی لیکچرار بھی تھیں۔ اس لیے وہ طبقہ بھی ان کے قریب تھا جو پوش کہلاتا تھا۔ ان کے مجموعے آسانی سے فروخت ہوجاتے تھے۔

"اس روز بیگم صاحبہ ایک اور تقریب میں مدعو ہیں' جس روز کی آپ تاریخ بتا رہے ہیں۔" ترنم نے کہا۔

"آپ ایسا کریں کہ مجھے ان کے پروگراموں کی

تفصیل بتادیں، تاکہ میں اپنی تاریخ سیٹ کرلوں۔"
"مگر آپ تصور خانم کے کون ہیں؟"
تصور خانم غیر شادی شدہ تھیں، اس لیے ان سے کوئی نزدیکی رشتہ نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ "میں ان کے تیسرے مجموعے "جمالستان" کا پبلشر ہوں اور اس کی رونمائی کا فرض مجھے ہی ادا کرنا ہے۔"
ترنم نے اندازہ لگالیا کہ کیس جینوئن ہے اور وہ کسی دھوکے بازی کا مرتکب نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے اس نے بیگم خان کا ایک مہینے کا شیڈول مع جائے تقریب کے گوش گزار کرادیا۔ شہزاد نے اسے یقین دلایا کہ وہ اپنے پروگرام کی کوئی مناسب تاریخ مقرر کرکے انہیں آگاہ کردے گا۔
"اس نامعلوم شخص نے تم سے اس کتے کو کب چوری کرنے کو کہا تھا؟" نازش نے ساری باتیں سننے کے بعد پوچھا۔
"19 جولائی کو۔ اس کا کہنا تھا کہ بعد میں رقم کی ادائیگی نہیں ہوگی۔"
"تم اس سے رابطہ کیسے قائم کروگے؟"
"اس نے مجھے اپنا فون نمبر دیا ہے۔"
"وہ کہاں کا نمبر ہے؟"
"محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کا۔" شہزاد بولا۔
"کس شخص کا ہے؟"
"کوئی پروفیسر ہیں۔ تعلق پشاور سے تھا۔ ایک آدھ عوامی تنظیم سے بھی تعلق رہ چکا ہے۔"
"ایسے لوگ مسز خان کا کتا کیوں چاہتے ہیں؟"
"یہ معلوم کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے، پیڑ کیوں گنیں؟"
"پھر بھی۔۔۔" نازش نے کہا۔ "یہ تو معلوم ہوجائے کہ ہم کسی غلط کام میں تو ہاتھ نہیں ڈال رہے ہیں۔"
"تم صحیح کہتی ہو۔ میں اس کی تحقیق بھی کرلوں گا۔ ویسے ان پروفیسر کا نام سروپ چند ہے۔ معلوم نہیں کس ملک و ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔"
"شہزاد ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔"
"ضرور۔۔۔ لیکن کیا یہ لازم ہے کہ جو شخص کتا چوری کرارہا ہے وہ سروپ ہی ہو۔ اس نے کہا تھا کہ ان نمبروں پر رنگ کرکے اطلاع دے دی جائے۔"
"بہرحال یہ سروپ ان کا آلہ کار بھی ہوسکتا ہے۔"
"ممکن ہے۔"
"تم نے 19 جولائی سے پہلے منعقد ہونے والی تقریبات پر نگاہ ڈالی؟"
"ہاں۔۔۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں، سوائے اس کے کہ ان میں چار روز کا لازمی وقفہ ہے۔"
"تو پھر تم ترنم کو فون کرکے 18 جولائی کو رونمائی کی تقریب کا بتادو۔"
"اس سے کیا فائدہ؟ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ تو ہم نے معلوم کر ہی لیا۔"
"ایسا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے 19 جولائی سے پہلے بیگم خان کو کسی خفیہ پارٹی یا تقریب میں شریک ہونا ہو۔" نازش نے قیاس آرائی کی۔
شہزاد نے اس سے اتفاق کیا اور ترنم کو فون کرکے 18 جولائی بتادی۔
" 18 کو تو انہیں اسلام آباد جانا ہے اور ایوان صنعت و تجارت کی ایک تقریب میں شریک ہونا ہے۔ آپ کوئی اور روز رکھ لیجیے۔" ترنم نے معذرت سے کہا۔ "بلکہ بہتر ہوگا کہ اپنے پروگرام کو اگست میں کرلیں۔"
جب شہزاد نے ریسیور کریڈل کیا تو نازش کو اس نے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ 20 ہی کو کچھ کیا جائے گا۔ کیا؟ یہ میں نہیں بتاسکتی، اس لیے کہ سروپ کو کتا 19 کو چاہیے۔"
"لیکن تمہاری قیاس آرائی پر بھروسا کرکے تو کوئی کام نہیں کرسکتا۔"
"اسے چھوڑو۔۔۔ کتے کو اغوا کرنے کے بارے میں سوچو۔ اب یہ بتاؤ کہ بیگم خان کو اس ہفتے کہاں اور کس تقریب میں آکر فیتہ کاٹنا ہے؟"
شہزاد نے ترنم کا بتایا ہوا پروگرام نکال کر دیکھا اور بولا۔

پاکستان ڈائجسٹ

"پرسوں انہیں ایک اسکول میں جانا ہے' جہاں سالانہ تقریبات منعقد ہورہی ہیں۔ ٹیچرز کو ان کی کارکردگی پر ایوارڈز اور میڈل دیے جائیں گے۔ اسکول کا نام آئن اسٹائن اکیڈمی ہے۔"

"اب کل صبح تم آئن اسٹائن اکیڈمی کو فون کرکے ایک دعوت نامہ خاص کرلو' بلکہ دو۔" نازش نے کہا۔ یہ تقریباً" 17 کو ہورہی ہے' دو روز کتے کو ہم اپنے پاس رکھ لیں گے۔

"نہیں' میں صحافی اور فوٹوگرافر کی حیثیت سے شرکت کروں گا۔ تم سوچو کہ تم کو وہاں کس حیثیت میں رہنا ہے کہ اسٹیج سے قریب رہ سکو' بلکہ ہمیں پہلے وہاں جاکر یہ معلوم کرنا ہے کہ تقریب اسکول ہی میں ہورہی ہے یا پھر کسی ہال میں۔"

آئن اسٹائن اکیڈمی ایک روشن اور چمک دار اسکول کا نام تھا' جہاں طبقہ امرا کے نونہال تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس لیے وہاں تعلیم سے زیادہ رکھ رکھاؤ کے اخراجات تھے جو عوامی طبقے کے لوگ برداشت کرسکتے تھے۔

اسکول اچھے علاقے میں تھا اور اس کی عمارت شان دار تھی۔ مرکزی سڑک پر واقع تھا۔ اس لیے دشواری کے بغیر پہنچا جاسکتا تھا۔ سالانہ تقریبات کا انعقاد اسکول کے آڈیٹوریم میں ہونا قرار پایا تھا۔

یہ ساری معلومات نازش نے حاصل کرلی تھیں اور دوسرے روز دوپہر کو شہزاد کے گوش گزار کردیں۔ شہزاد بھی اس روز مصروف رہا تھا۔ اس نے وہ دن خان فیملی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں گزار دیا۔

"اکیڈمی کی تقریب صبح گیارہ بجے ہوگی۔" نازش نے بتایا اور تقریباً" ڈیڑھ بجے دن تک ختم ہوجائے گی۔ پھر چائے پانی کا سلسلہ چلے گا۔ اس آڈیٹوریم کے باہر لان کے ایک حصے میں اس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ لان کافی خوب صورت ہے اور اس میں شامیانہ لگایا جائے گا۔

"تم کس حیثیت سے شرکت کروگی؟"

"میں نے ایک کام والی سے بات کرلی ہے۔ اس کی طبیعت اس روز خراب ہوجائے گی تو میں اس کی بہن بن کر پہنچ جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ بعد میں چائے کی پیالیاں اور غلیظ پلیٹیں دھونا پڑیں' مگر پچیس ہزار کم نہیں ہوتے۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

☆ ☆ ☆

تقریب کا آغاز گیارہ بجے ہوگیا' مگر بیگم خان کو ساڑھے بارہ بجے آنا تھا' اس لیے کہ انعامات اسی وقت تقسیم کیے جانا تھے۔ اس سے پہلے ٹیبلوز اور اسکول کی کھیلوں کی سرگرمیاں تھیں جن میں ریس اور پی ٹی ورزشیں شامل تھیں۔ نونہالوں کو پھول' جھنڈے اور ستاروں کے روپ میں شامل ہونا تھا۔

نازش معمولی کپڑے پہن کر وقت سے کچھ پہلے ہی چلی گئی تھی' تاکہ داخلے میں دشواری نہ ہو۔ اس نے فاطمہ کا نام لے کر اسے اپنی بہن بتایا تو اسے اندر جانے دیا گیا۔ وہ ایک روز پہلے اس کے سارے گوشوں کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس لیے وہاں کی کوئی چیز اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔

کتوں کی نفسیات پر اس نے احتیاطاً" ایک کتاب بھی پڑھ لی تھی' تاکہ وہ کتے کو خوش اسلوبی سے اغوا کرسکے۔ کتاب میں کھانے پینے اور بھونکنے کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ چھوٹی نسل کے اس کتے کے بارے میں دلچسپ معلومات تھیں۔

بیگم خان کو دوسری بیگمات کی طرح تصنع اور نمائشی چیزیں پسند تھیں۔ اس لیے ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں اور ہار بھی پہنائے گئے۔ وہ اڑتالیس سال کی پختہ عمر عورت تھیں' مگر انہیں دیکھ کر کوئی عمر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھیں اور بال بھی جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ حسب روایت ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ نازش کو حیرت تھی کہ کوئی اس کے لیے پچیس ہزار کیوں خرچ کررہا ہے۔ ایسے کتے تو مارکیٹ میں بہت مل جائیں گے۔

پھر یہ کہ اس کی حفاظت کا کوئی ایسا سخت انتظام

نہیں تھا کہ اسے چوری نہ کیا جاسکے۔ نازش کا خیال تھا کہ اگر وہ اسے اٹھا کر بیگ میں رکھ لے گی تو کسی کو پتا بھی نہ چل سکے گا۔ کتے کا رنگ و روپ اور حلیہ بالکل ویسا تھا جیسا کہ شہزاد نے بتایا تھا۔

اسٹیج پر اسے ساتھ لے کر بیٹھنا بے ادبی تھی اور اسے وقار کے منافی کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے بیگم خان نے اسے ایک گارڈ کے حوالے کردیا اور آہستہ سے کچھ کہا۔ جب وہ اسٹیج پر بیٹھ گئیں تو پریس اور اسکول سے متعلق لوگوں نے ان کی تصویریں اتارنا شروع کردیں۔

یہ بھی معیوب سی بات ہوتی کہ ان کے پیچھے کھڑے ہوئے گارڈ کے ہاتھ میں کتا دبا ہوتا اس لیے وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جانے لگا' جہاں بیگم خان کی کار کھڑی تھی۔ گارڈ نے کار کی ڈکی کھولی۔ اندر سے ایک پنجرہ نکالا' کتے کو اس میں بند کیا اور ڈکی لاک کرکے وہاں سے چلا گیا۔

شہزاد کی نظر اس پر تھی۔ مگر آڈیٹوریم سے لے کر پارکنگ تک اتنی چہل پہل تھی کہ کسی بھی جگہ اسے گارڈ پر حملہ کرکے اس سے کار کی چابی چھیننے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ویسے بھی یہ اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔

اس کی گردن میں کیمرہ لٹکا ہوا تھا اور جیب میں ایک نوٹ بک اور بال پوائنٹ تھا۔ وہ روایتی قسم کا صحافی معلوم ہورہا تھا۔ اپنے ایک دوست سے مقامی روزنامے کا کارڈ لے کر وہ وہاں گیا تھا۔ اسکول والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا' اس لیے کہ وہ اپنی اس تقریب کی بہرحال پبلسٹی چاہتے تھے۔

جب گارڈ وہاں سے چلا گیا تو شہزاد نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ڈکی پر طبع آزمائی کی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک ماسٹر کی اس میں لگ گئی۔ اس نے ڈکی کھولی اور اس کا پنجرہ نکال لیا۔ اسے بے دھیانی میں کھول کر کتا نکالا۔ وہ نرم و ملائم اور گداز کھال والا کتا تھا۔ اچانک شہزاد کو خیال آیا کہ اسے کتا یوں ہاتھ میں لیے دیکھ کر کوئی بھی اعتراض کرسکتا ہے۔ لہٰذا اسے پنجرے میں ڈال کر کسی جگہ چھپا دینا چاہیے۔ وہ ڈکی میں سے پنجرہ نکالنے لگا تو کتا اس کے ہاتھ سے اچھل کر ریت پر گر گیا۔ "غاؤں۔۔۔ غاؤں۔" اس نے جیسے اپنے غصے کا اظہار کیا کہ شہزاد نے اسے گود میں کیوں لیا تھا۔ پھر اس نے لان کی طرف دوڑ لگا دی۔

آڈیٹوریم میں ایوارڈ تقسیم ہونے والی تقریب شروع ہوچکی تھی اور ایک اناؤنسر ناموں کا اعلان کررہا تھا۔ تالیوں کی گونج میں ٹیچرز آکر اپنے ایوارڈ اور میڈل لے جارہی تھیں۔

کتے نے اس شامیانے کی طرف دوڑ لگا دی جو لان میں نصب تھا اور جس کے اندر میزوں پر لوازمات سجے تھے۔ شہزاد نے کیمرہ بند کیا اور دوڑنے کے لیے اسٹارٹ لیا ہی تھا کہ ایک معزز سی خاتون نے اس کے نزدیک آکر کہا۔ "آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟"

"پھر مجھے کہاں ہونا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے تھا؟" شہزاد نے جلدی سے کہا۔

"آپ کو آڈیٹوریم میں جاکر فوٹو گرافی کرنی چاہیے۔ سب سے اہم موقع تو یہی ہے۔"

"اوہ ہاں۔۔۔ معاف کیجئے گا' میں ابھی آتا ہوں۔ آپ یہ کیمرہ لے چلیں' اگر فوٹو گرافی آتی ہو تو اپنا شوق پورا کرسکتی ہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا کہ وہ ٹوائلٹ جانا چاہتا ہے۔ "اچھا' اس طرف" خاتون نے بتایا۔

"آپ کا نام؟"

"روبانہ۔ میں دسویں کلاس کی ٹیچر ہوں۔ ریاضی پڑھاتی ہوں۔" وہ بولیں۔ پھر آڈیٹوریم کی طرف بڑھنے لگیں۔ شہزاد نے چند لمحوں تک انتظار کیا' پھر ٹوائلٹ کے بجائے لان کی طرف دوڑ لگا دی۔

اسے افسوس ہورہا تھا کہ اس اثنا میں کتا نہ معلوم کہاں چلا گیا ہوگا۔ وہ شامیانے میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ "ارے!" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ وہ نازش تھی جس نے ملازمہ کا روپ دھار رکھا تھا۔ "تم!"

"ہاں... میں..." اس نے سرگوشی میں کہا۔

"وہ ناہنجار کتا یہاں آگیا ہے۔" شہزاد نے دبی آواز میں بتایا۔

"کہاں؟" نازش نے بے ساختہ کہا۔

"پھر وہ پلٹے تو شامیانے کے داخلے پر کھڑے شخص نے نازش کو جانے کی اجازت دے دی' مگر شہزاد کو روک لیا۔" ابھی کسی کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

"مگر میں تو فوٹو گرافر ہوں۔ بیگم صاحبہ یہاں آنے والی ہیں نا' میں چاہتا ہوں کہ کسی مناسب سی جگہ پر کھڑے ہو کر ان کی تصویریں بنالوں۔" شہزاد بولا۔

"میں کیسے مان لوں کہ آپ فوٹو گرافر ہیں؟" وہ حجت کرنے لگا۔ "آپ کا کیمرہ کہاں ہے؟ پہلے کیمرہ لے کر آیئے۔"

"میرا کیمرہ مس رومانہ کے پاس ہے۔" شہزاد نے بتایا۔ دراصل انہیں بھی فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ اس لیے میں نے انہیں اپنا کیمرہ دے دیا۔

"ان سے کیمرہ لے کر آیئے اور پھر اپنا کارڈ دکھایئے۔ اسکول کا دعوت نامہ تو ہوگا آپ کے پاس؟"

بات بڑھتی ہی جارہی تھی' اس لیے شہزاد نے مناسب سمجھا کہ پہلے جاکر آڈیٹوریم سے کیمرہ لے آئے۔ اپنی شناخت کرانے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آڈیٹوریم کی طرف سے آواز بند ہوگئی اور کچھ بھگدڑ سی مچ گئی۔ شہزاد نے اندازہ لگالیا کہ تقسیم انعامات کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور اب سب لوگ چائے پینے کے لیے شامیانے کی طرف آرہے ہیں۔

وہ آڈیٹوریم کی طرف پلٹا تو اسے سب سے پہلے رومانہ نکلتی دکھائی دی۔ وہ جھپا جھپ تصویریں کھینچ رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس فن سے واقف ہے۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب گیا اور اس نے اپنا کیمرہ اس سے لے لیا۔ رومانہ نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے تصویر کشی کا موقع فراہم کیا۔

شہزاد نے ہاتھ ہلایا اور شامیانے کی طرف بھاگا۔ اس بار وہاں کھڑے ہوئے شخص نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ شہزاد نے رومانہ سے کیمرہ لیا ہے۔

میزوں پر چائے اور پیپسی کے ساتھ سموسے' گلاب جامن اور دہی بڑے ٹائپ کی چیزیں رکھی تھیں۔ شہزاد ٹہلنے والے انداز میں ان کے قریب گیا' پھر اس نے نازش سے کہا۔ "مجھے پیاس لگ رہی ہے' کیا ایک بوتل مل جائے گی؟"

نازش نے کریٹ سے ایک ٹھنڈی بوتل نکال کر اسے پیش کی اور پھر سرگوشی میں بولی۔ "وہ ادھر چوتھی میز کے نیچے ہے۔ میں نے بہت کوشش کرلی' مگر وہ ادھر سے ادھر ہو جاتا ہے۔"

شہزاد کھسکتا ہوا اس میز کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے پیپسی کی بوتل سے دو تین گھونٹ لیے اور اسے میز پر رکھ دیا' پھر کیمرے کو اٹھا کر شامیانے کے داخلے پر ایڈجسٹ کرنے لگا' جیسے بیگم صاحبہ کی آمد پر تصویریں اتارنا چاہتا ہو۔ اس نے کیمرے کے لینسز پر سے کیپ اتاری تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری' پھر لڑھکتی ہوئی میز کے نیچے چلی گئی۔

شہزاد بیٹھ گیا اور اس نے میز پوش کا ایک کونا اٹھا کر نیچے دیکھا' جیسے لینسز کا کیپ تلاش کررہا ہو' مگر اس کی نگاہ آگے تھی۔ سامنے وہ ناہنجار کتا تھا جس کو وہ چوری کرنا چاہتے تھے۔

"غرغر غر..." کتے نے اسے دیکھ کر کان جھٹکے اور دانت نکوسنے لگا۔

ربڑ کیپ اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ شہزاد نے سیٹی بجائی' پھر کیپ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جھپٹ کر کتے کو دبوچ لیا۔ اس بار وہ دھوکا کھا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزاد دیر کی گول کیپ اٹھا رہا ہے اور اسے کچھ نہیں کہے گا مگر اس کی کمر شہزاد کی گرفت میں آگئی۔

شہزاد نے کیپ اپنی جیب میں رکھی اور کتے کو لے کر میز کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ مسلسل غرغر کررہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت شامیانے میں اسکول کی ہیڈ مسٹریس اور بیگم صاحبہ داخل ہوئیں۔ کتے کی غراہٹ پر انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' پھر بے

اختیار ہاتھ پھیلا دیے۔
شہزاد محجوب ہو گیا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ کتا اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا رہی تھیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ کتا ان کے حوالے کر دے۔ ایک باڈی گارڈ تیزی سے اس کے قریب۔ اس نے کتے کو شہزاد کے ہاتھ سے لیا۔ اپنا رومال نکال کر اس کے پاؤں صاف کیے اور پھر بیگم خان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اسے گود میں لے لیا۔
دوسرا باڈی گارڈ جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں ان سے کچھ کہنے لگا' جسے سن کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ پھر انہوں نے اسے کچھ ہدایت دیں تو وہ تیزی سے شامیانے سے باہر نکل گیا۔
شہزاد کو مایوسی کی ایک لہر نے اپنی گرفت میں لے لیا۔
بیگم خان سامنے کھڑی تھیں' کتا ان کی گود میں تھا اور ایک گارڈ ان کے دائیں جانب کھڑا تھا' جبکہ شہزاد اس کتے کو چوری کرنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت ہوتا تو وہ بجلی آف کرنے والا حربہ استعمال کرتا' مگر اس وقت تو دن کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا اور ہر چیز سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔
شہزاد نے کیمرہ سیدھا کیا۔ دو تین تصاویر اتاریں اور پھر دلی سے شامیانے سے باہر آ گیا۔ وہ چاہتا تو بھگدڑ مچا کر اس کتے کو چوری کر سکتا تھا' مگر اسے یاد آیا کہ اس کے نامعلوم کلائنٹ نے کہا تھا کہ شہزاد کو کتا چوری تو کرنا ہے' مگر جبر کر کے نہیں' یعنی ڈاکا نہیں مارنا ہے۔ کتا چوری کر لیا جائے اور اس کی فوری گمشدگی کا احساس نہ ہو۔ پھر جب اس کی عدم موجودگی کا احساس ہو تو سب اسے تلاش کرنے میں لگ جائیں۔

☆ ☆ ☆

"ایسے کام نہیں چلے گا۔" شہزاد نے منہ بنا کر کہا۔
"پھر کیسے چلے گا؟" نازش تنک کر بولی۔ "اس بار تم نے منصوبہ بنایا تھا جو ناکامی سے ہمکنار ہوا۔ بلکہ سچ پوچھو تو تم نے اس سلسلے میں کوئی منصوبہ ہی نہیں بنایا تھا۔"
"ہاں۔۔۔" شہزاد نے اعتراف کیا۔ "میں نے صرف یہ منصوبہ بندی تو کر لی کہ اس اسکول میں داخل ہونا ہے اور کسی طریقے سے بیگم خان سے قریب ہونا ہے۔ ہم اس میں کامیاب رہے لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس پدی سے کتے پر قابو نہیں پا سکوں گا۔"
"کتا یقیناً" چھوٹی نسل کا ہے' لیکن چھوٹے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" نازش نے مسکرا کر کہا۔ "اس لیے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم نہایت آسانی سے اسے جیب میں ڈال لو گے؟"
"چلو مان لیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔" شہزاد نے سر کھجا کر کہا۔ "مگر اب کیا کرنا ہے؟"
"بیگم خان کا اگلا پروگرام کیا ہے؟"
"پھولوں کی نمائش کا افتتاح کریں گی 18 اگست کو۔"
"مگر وہ تو ہر سال گورنر کی بیگم کرتی ہیں۔"
"گورنر کی بیگم ایک سرکاری تقریب میں مدعو ہیں۔ اس لیے کراچی کے ناظم اعلا نے بیگم خان کو مدعو کر لیا ہے۔" شہزاد بولا۔ "اور یہ تقریب ایک بڑے باغ میں سہ پہر کے وقت ہو گی۔ ممکن ہے غروب آفتاب کے وقت تک چلتی رہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آ رہی ہے۔ تم داد دو گے۔ اس کتے کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟"
"ہاں!"
"بس تو اسے انلارج کرا لو' تاکہ ہم اس کتے کے سارے رگ و ریشوں سے واقفیت حاصل کر لیں۔"
"مگر کیوں؟"
"تاکہ اس کا ڈپلی کیٹ تیار کر سکیں۔"
شہزاد کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہیں آیا' اس لیے وہ الو کی طرح پلکیں جھپکانے لگا۔

☆ ☆ ☆

مقامی باغ میں اس روز رنگ و بو کا ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ وہ تقریب زنانہ تھی، مگر مردوں کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔ ویسے بھی خواتین کو مردوں سے اچھی داد کون دے سکتا ہے۔

خواتین و حضرات صاف شفاف اجلے کپڑے پہنے تھے اور پھولوں سے بھی تیز خوشبو ان کے لباس سے آرہی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بعض خواتین ایک کے بجائے پرفیوم کی دو شیشیوں سے نہا کر آئی ہیں۔

اس بار شہزاد اور نازش پوری تیاریوں سے آئے تھے اور انہوں نے کتے کو چوری کرنے کے لیے متبادل تدبیریں بھی سوچی ہوئی تھیں۔ یعنی یہ نہیں تو وہ۔۔۔

بیگم خان گورنر کی بیگم تو نہیں تھیں، مگر انہیں وی آئی پی کا درجہ دیا گیا تھا۔ جب وہ کار سے اتریں تو ایک باڈی گارڈ سادہ لباس میں ان کے ساتھ تھا۔ جبکہ دوسرا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور کار کو لاک کرنے کے بعد بیگم خان سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس نے شوفروں والی وردی پہن رکھی تھی۔

باغ کا پارکنگ لاٹ وسیع و عریض تھا۔ اس لیے کہ وہ پوش خواتین و حضرات کی تقریب تھی۔ اس لیے سب اپنی کاروں پر آئے تھے۔ شہزاد نے کرائے پر حاصل کی ہوئی کار اس طرح سے کھڑی کی تھی کہ وہاں سے نکلنے میں کوئی دقت نہ ہو، نازش نے اپنے حسن و جمال کی افزائش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

بیگم خان نے فیتہ کاٹا اور دو روپہ پھولوں کی قطاروں میں بڑھتی چلی گئیں۔ جاپانی اور چینی طرز کے پھولوں سے لے کر امریکی گلاب تک وہاں نت نئے انداز سے تراش و خراش کے بعد رکھے گئے تھے۔ فوٹو گرافروں نے نمائش کے افتتاح کے موقع کی تصویریں بنائی تھیں اور اس کے بعد ٹھہر گئے تھے۔ اب انہیں اس کا انتظار تھا کہ نمائش میں رکھے جانے والے پھولوں میں سے اول، دوم اور سوم انعام کا حق دار کون ٹھہرتا ہے۔

ان کا محبوب کتا ابتدا میں تو ان کی گود میں دبا رہا، مگر جب انعامات تقسیم کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے پلٹ کر اپنے شوفر کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے نزدیک گیا اور اس نے سفید کتے کو اپنی گود میں لے لیا۔ پھر وہ وہاں نہیں رکا اور کار کی طرف چلا گیا۔ مگر ابھی وہ کار کی ڈکی کھول ہی رہا تھا کہ نازش جو کچھ فاصلے پر ایک کار کی باڈی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، چیخنے لگی "ارے رے رے بچاؤ۔"

صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ چیخ جاندار نہیں ہے اور وہ صرف اور صرف اس شوفر کو متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ معاملہ ایک خوبرو خاتون کا تھا جو خوف و دہشت کا شکار تھی لہٰذا کار کی ڈکی کھولنے سے پہلے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کتا اس کے بائیں بازو میں دبا ہوا تھا اور دائیں میں چابی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ وہاں شیر چیتے جیسا کوئی خونخوار درندہ تو آ نہیں سکتا۔ خاتون کو کوئی بدقماش شخص چھیڑ رہا ہے یا پھر۔۔۔ یا پھر۔۔۔

اس نے سوچا تھا اس آرائی کرنے کے بجائے وہ خود جا کر دیکھ لے تو بہتر ہوتا۔ اس لیے وہ پھرتی سے نازش کے قریب چلا گیا۔ "م۔۔۔ میں۔۔۔ کک۔۔۔ کار کا لاک کھولنے جا رہی۔۔۔ تھی کہ۔۔۔"

"ٹھہریں۔۔۔ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔" شوفر نے سراسیمگی سے کہا اس لیے کار کی ڈرائیونگ سائیڈ کے لاک پر ایک چھوٹا سا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنی دم لاک میں پھنسا رکھی تھی اور اس کا پھن اٹھا ہوا تھا۔ سانپ پیلے رنگ کا تھا اور اس پر سیاہ دھبے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مصنوعی سانپ ہے اور کسی بچے نے شرارت میں اسے لاک پر اٹکا دیا ہے۔ "یہ ہے ہے۔" شوفر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے بی بی جی۔ آپ تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہیں۔ اسے تھام لیں ذرا۔" اس نے بیگم خان کا کتا اسے تھماتے ہوئے کہا۔ پھر کار کی چابی اس نے پتلون کی جیب میں ڈال لی اور بہادروں کی طرح بڑھ کر اس ربر کے سانپ کو پھن کے نزدیک سے تھام لیا۔ اچانک سانپ کا منہ

کھلا اور "پھس" کی سی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے کھلے ہوئے منہ سے ایک سریع الاثر محلول کی پھوار شوفر کے چہرے پر پڑی۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس نے سانپ کی گردن چھوڑ دی۔ "یہ۔۔۔ یہ یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔ ہے ہے۔۔۔ کیا مذاق ہے۔" اس نے محجوب ہو کر کہا۔ اس لیے کہ سانپ، بہرحال نقلی تھا اور اس کے منہ سے نکلنے والے محلول سے وہ جھجک گیا تھا۔ اس لیے اب اپنی جھینپ مٹا رہا تھا۔ "شش۔۔۔ شرا۔۔۔ ت۔۔۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مم۔۔۔ مگر۔۔۔ اثر۔۔۔ تیز ہے۔۔۔ سب چیزیں۔۔۔ گھوم رہی۔۔۔ ہیں۔۔۔ دو ہو گئی۔۔۔ ہیں۔۔۔ ہے ہے ہے۔۔۔ یہ کک۔۔۔ کیسا۔۔۔ لگ رہا۔۔۔ ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ بو تل۔۔۔ پی۔۔۔ لی۔۔۔ بغیر کچھ ملائے۔۔۔ بغیر۔۔۔ سوڈا۔" وہ خواہ مخواہ مسکرا رہا تھا اور لہرا رہا تھا۔ نقلی سانپ کے منہ سے نکلنے والے محلول نے اس کے سسٹم پر اثر انداز ہونے کے بعد اسے سلانا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کتے کے متعلق بھول گیا جو نازش کی گود میں دبا ہوا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

نازش اس لمحے کی منتظر تھی جب گارڈ کو بے ہوش ہو کر گرنا تھا۔ شہزاد کار کے پیچھے چھپا ہوا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت سامنے آجاتا تو ممکن ہے گارڈ ہوشیار ہو جاتا اور نمائش کی طرف جانے کی کوشش کرتا۔

لیکن وقت گزر رہا تھا اور یہ اندیشہ بھی پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں تقسیم انعامات کی تقریب ختم نہ ہو جائے اور بیگم خان واپس نہ آجائیں۔ اس لیے وہ کار کی آڑ سے گھوم کر نکلا اور شوفر کے پیچھے پہنچ کر اس نے س کی کنپٹیوں پر وار کیا۔

"تم۔۔۔ ت۔۔۔ تم۔۔۔ کون۔۔۔ ہو اور یہ۔۔۔ کیا۔۔۔؟" شوفر نے گردن تھما کر کہنا چاہا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اس لیے کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ وہ لہرا کر گرنے لگا تو شہزاد نے اسے تھام لیا۔ پھر اس کی جیب سے چابی نکالی اور اسے گھسیٹ گھسیٹ کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا اور اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکا دیا جیسے اسے اونگھ آگئی ہو۔

پھر اس نے پھرتی سے کار کی ڈکی کھولی اور بیگم خان کے کتے کی کاربن کاپی کو ڈکی میں رکھے پنجرے میں بند کر کے ڈکی لاک کر دی۔ اسے ایک سفید کتا مل گیا تھا جو قامت میں تھوڑا بڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد اس نے سیاہی سے دائرے بنا دیئے تھے۔ وہ دیکھنے میں ہو بہو اس جیسا ہو گیا تھا مگر اس کا فرق اس کی مالکہ جان سکتی تھی۔ قدرے بڑا ہونے کی وجہ سے اس کا وزن بھی زیادہ تھا۔

یہ محض اس لیے کیا گیا تھا کہ فوری طور پر یہ نہ معلوم ہو کہ کتا چوری کر لیا گیا ہے اور یہ کہ ڈرائیور کو محض اس وجہ سے بے ہوش کیا گیا تھا۔ ڈرائیور زیادہ دیر تک بے ہوش رہتا تو کار کون ڈرائیو کرتا۔ یہ بھی ایک الجھن آمیز بات تھی اس لیے شہزاد نے اس کے بازو پر اینٹی ڈاٹ انجکٹ کر دیا تاکہ پانچ منٹ میں پہلے والے محلول کا اثر ختم ہو جائے۔

اس ساری کارروائی میں انہیں مشکل سے دس منٹ لگے۔ جب وہ کرائے کی کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل رہے تھے تو پھولوں کی نمائش سے بیگم خان واپس آرہی تھیں اور نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ نازش کی گود میں ان کا کتا بیوی تھا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ وہ بھونکنے اور کاٹنے نہ لگے اس کے منہ پر جالی چڑھا دی گئی تھی۔

شہزاد نے آگے جا کر ایک ٹیلی فون بوتھ پر سروپ کا نمبر ملا کر اسے اطلاع دی تو اس نے کہا کہ وہ کتا اس کی قیام گاہ پر پہنچا کر بقیہ رقم لے جائے۔ شہزاد نے اس کے بعد ایک اور فون کال کی، پھر مبہم لہجے میں اسے بتایا کہ کام ہو گیا اور اب اسے اپنا کام کرنا ہے۔

اس نے نازش کو ایک مصروف چوراہے پر اتار دیا اور پھر کتے کو گود میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر وہ اچھل کود مچا رہا ہے، شہزاد نے اس کی ٹانگیں بھی باندھ دیں۔ باقی مرحلے طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس کی ہدایت پر نازش ہل پارک پہنچ گئی۔ شہزاد نے کرائے کی کار سے پیچھا چھڑایا۔ دس ہزار روپے احتیاط سے آفس کی تجوری میں رکھے اور پھر ہل پارک پہنچ گیا۔ نازش اسے معراج پارک میں جوکروں کے جنگلے کے قریب مل گئی۔

جب وہ کون آئس کریم کھاتے ہوئے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف جارہے تھے تو نازش نے کہا۔ "رقم تو ہماری ہوگئی اور کام بھی ہم نے تسلی بخش کردیا' مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سروپ کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ اس نے بیگم خان کا کتا بیوٹی چوری کرالیا؟"

"بیگم صاحبہ کے متعلق میں نے دو روز پہلے جو معلومات اکٹھا کی تھیں اس سے پتا چلا کہ وہ والٹی ہنزہ کی صاحب زادی ہیں اور ان کے شوہر خان وجاہت والی سوات کے بھتیجے۔ یعنی ان دونوں کا سماجی مرتبہ بہت بلند ہے۔ 19 جولائی کی رات کو بیگم خان کو ایک پرائیویٹ تقریب میں شامل ہو کر ایک جہادی تنظیم کے لیے چندے کی اپیل کرنا ہے۔ تقریب میں ایسے افراد شامل ہوں گے جن کا تعلق قبائلی علاقوں سے ہے۔ وہ متمول ہوں گے' مگر ان کا تعلق شہری علاقوں سے ہوگا۔ بیگم صاحبہ کی تصویریں انہوں نے صرف اخبارات میں دیکھی ہیں' لیکن سب ان کے کتے سے بخوبی آشنا ہیں۔ گویا کتا بیوٹی' بیگم صاحبہ کی شناخت ہے۔"

"کتے کو ایک تنظیم نے حاصل کیا ہے۔ سروپ درمیانی آدمی ہے۔ اس تنظیم نے سوچا کہ کیوں نہ بیگم صاحبہ کی ہم شکل عورت کا فائدہ اٹھا کر کروڑوں روپے جمع کرلیے جائیں' مگر انہیں کتے کی ضرورت تھی' اس لیے کہ کتا بیوٹی ان کی شناخت ہے۔ ایک گھنٹے کی اس تقریب میں کسی کو احساس بھی نہ ہوتا کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔"

"مگر یہ ہم شکل عورت کہاں سے ٹپک پڑی؟"

"اس کے بارے میں بیگم صاحبہ متفکر ہیں اور کئی بار اپنی تشویش کا اظہار کرچکی ہیں' اس لیے کہ اس نے بہت سی چھوٹی موٹی وارداتیں کی ہیں اور اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا ہے۔ بیگم صاحبہ نے ایک بار سرسری طور پر یہ کہہ دیا کہ وارداتوں میں ان کی کسی ہم شکل کا ہاتھ ہے۔ تنظیم نے جو میرے خیال میں "را" کی آلہ کار ہے' کسی طرح سے اس عورت کو تلاش کرلیا ہے۔ لہٰذا کتے کی چوری کے بعد اسٹیج مکمل ہوگیا۔"

"گویا نادانستگی میں ہم نے ایک ایسا کام کر ڈالا ہے' جس پر ہم عرصے تک شرمندہ رہیں گے۔" نازش نے تاسف سے کہا۔

"میرا ایک دوست سی آئی اے میں ہے۔ میں نے اسے پہلے سے یہ باتیں بتادی تھیں۔ آج شام کو میں نے اسے فون کرکے الرٹ رہنے کو کہا ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ سازشی تنظیم ایسا اسٹیج تیار کررہی ہے اور عمائدین شہر کو دھوکا دے کر کروڑوں روپے لوٹنے والی ہے؟"

"یہ میری اپنی معلومات ہیں اور میں کسی کو اس کا ذریعہ نہیں بتانا چاہتا۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ اگر ہم سامنے والے ریستوران میں جاکر کباب پراٹھے کھائیں گے تو بل کون ادا کرے گا؟"

"تم ادا کروگے۔" نازش نے تنک کر کہا۔ "اس لیے کہ کون آئس کریم لیتے وقت میں نے اپنا پرس کھولا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر واپسی پر ٹیکسی کا کرایہ تم ادا کروگی۔ اس لیے کہ میں اسکوٹر نہیں لایا ہوں۔ اس کا کلچ وائر ٹوٹ گیا ہے۔"

شہزاد نے نازش کو تاریکی میں رکھا اور حقیقت سے کلی طور پر آگاہ نہیں کیا' مگر ہم آپ کو بتادیتے ہیں کہ اس کے لیے یہ تحقیقات اس کے اسی دوست نے کی تھی' جس کا تعلق سی آئی اے سے ہے' اس کا نام اسلم ملک ہے اور وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ لیکن اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھیے گا۔ کسی اور کو نہ بتایئے گا' ورنہ گڑبڑ ہوجائے گی۔

☆ ☆

انصاف ملا۔۔۔۔

شاہین جمال

جعلی اور ڈھونگی پیر جو چہرے پر تقدس کا ملمع سجاکر مذہب کے نام پر دھوکا دے رہے ہیں۔ اسن جیسے لوگ ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ صحافت سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی کی جرأت اور بہادری کی کہانی جس نے ایسے ہی ایک پیر کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن آخر میں افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

ایک پیر فرتوت کے کارنامے پر مبنی سچ بیانی

پیر کونڈے شاہ نام تھا اس کا۔ علاقے میں اس کی شہرت بھی بہت تھی۔ خاص طور پر خواتین میں اس سے طرح طرح کی باتیں منسوب تھیں۔ اکثر عورتوں سے سنا تھا کہ وہ اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ ان کی دعاؤں سے کیا نہیں ہوتا۔ اولاد نہ ہو تو اولاد ہو جاتی ہے۔ ہارا ہوا مقدمہ جیت لیتے ہیں۔ بے روزگاروں کی قسمت بدل جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے بھی اس قسم کے لوگوں کے حوالے سے بہت سی باتیں سن رکھی ہوں گی۔

میں نے بھی سن رکھی تھیں، لیکن میرا اس شخص سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں تھی ایسے لوگوں کے پاس جانے کی۔ میں حقائق کی دنیا میں رہنے والی عورت ہوں۔

ایسی باتوں پر ذرا کم ہی یقین کرتی ہوں۔

میرا تعلق صحافت سے ہے، ایک باعزت اور پروقار پیشہ جس میں زندگی ہر لمحہ چیلنج میں ہوتی ہے، جس میں دو اور دو چار ہوتے ہیں اور دو اور دو پانچ نہیں ہوتے۔

مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کو اگر دعا ہی کرنی ہے تو براہ راست اپنے مالک سے رابطہ کرلیں، کسی کے حوالے سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بزرگان دین کا بہت احترام کرتی ہوں، لیکن وہ بزرگان دین جنہوں نے دین اور دنیا کی خدمت کی۔ جنہوں نے شعبدے نہیں دکھائے، کیونکہ شعبدہ تو کوئی بھی دکھا سکتا ہے۔

میرا تعلق جس محلے سے ہے وہ زیادہ پوش تو نہیں ہے۔ پھر بھی اچھے خاصے کھاتے پیتے اور باشعور لوگوں کی آبادی ہے۔ یہ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔

چونکہ میری شہرت ایک صحافی کی حیثیت سے بہت اچھی تھی۔ اسی لیے اس محلے کے بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے۔ یہ واقعہ ایک رات نو بجے کا ہے۔

میں کسی فیچر پر کام کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ اس محلے میں میرے ملنے جلنے والے کم ہی تھے یا تو کوئی رشتے دار ہو سکتا تھا یا کوئی دوست۔

لیکن دروازے پر جو لڑکی کھڑی تھی، وہ میرے لیے

اجنبی تھی۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ "جی فرمائیں۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ ہی شاہین جمالی ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔" میں نے بتایا۔ "میں ہی شاہین جمالی ہوں، لیکن آپ کون ہیں؟"

"میرا نام قدسیہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور میں آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انیس بیس برس کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بات کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ پڑھی لکھی بھی ہوگی۔ اسی لیے اسے اندر بلانے میں مجھے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ "آؤ، اندر آجاؤ۔" میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ بڑے مہذب انداز میں میرا شکریہ ادا کرتی ہوئی اندر آگئی۔ میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں اسے بٹھایا تھا۔

"میں اسی محلے میں رہتی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"آپ تو مجھے نہیں جانتی ہوں گی، لیکن میں آپ کو جانتی ہوں۔"

"بتاؤ قدسیہ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"ایک شخص کو بے نقاب کرنا ہے۔" اس نے بتایا۔ "ایسے لوگ ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ آپ ایک صحافی ہیں اور یہ آپ کا فرض بنتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"پیر کونڈے شاہ۔۔۔" قدسیہ نے بتایا۔

"پیر کونڈے شاہ۔۔۔" میں چونک پڑی۔ "میں نے اس کا بہت نام سن رکھا ہے، کیسا آدمی ہے وہ۔۔۔؟"

"اس سے اندازہ لگالیں کہ میں اسے بے نقاب کرنے کی درخواست لے کر آئی ہوں۔"

"کیا اس سے تمہارا واسطہ پڑ چکا ہے۔"

"بہت برا۔۔۔" اس نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ "آپ بتائیں' دیکھیں مجھے' کیا میں بوڑھی ہوگئی ہوں؟ کیا میری عمر نکل چکی ہے؟"

"نہیں تو' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے' تم تو ابھی بالکل ینگ ہو۔"

"بس یہ بات میری ماں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ رشتے کے لیے دعا کرانے اس جعلی پیر کونڈے شاہ کے پاس مجھے لے کر چلی گئی تھیں اور وہاں اس نے۔۔۔" قدسیہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

"بولو قدسیہ۔۔۔ تم مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ' کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

"میں اس کمینے کے ہاتھوں برباد ہوتے ہوتے بچی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی' لیکن میری قسمت اچھی تھی جو میں اس کی گرفت سے نکل آئی۔ وہ اب تک نہ جانے کتنوں کو برباد کرچکا ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ نکلیں۔"

پھر قدسیہ نے جو کہانی سنائی اس میں ایسی کوئی نئی بات نہیں تھی' وہی داستان۔ وہی اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کی' لیکن بہادری خود قدسیہ کی تھی کہ اس نے پیر کونڈے شاہ کا جال توڑ دیا تھا اور اپنے آپ کو بچا کر لے آئی تھی۔

"تم نے اس کے بارے میں اپنے گھر والوں کو نہیں بتایا۔" میں نے پوچھا۔

"گھر والوں کو۔۔۔" وہ تلخ انداز سے ہنس پڑی۔ "نہیں کیا بتاؤں' وہ تو اسے آسمان سے اترا ہوا فرشتہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق وہ شخص ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اگر میں ذکر کروں تو یہ ہی کہا جائے گا کہ میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ پر بہتان لگا رہی ہوں۔"

"حد ہوگئی' کیسا اندھا عقیدہ ہے۔"

"اسی لیے تو یہ لوگ اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔"

"تم نے مجھ سے کیا توقع کر رکھی ہے۔ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ اسے بے نقاب کریں۔" اس نے کہا۔ "اس نے اپنی بزرگی اور روحانیت کی جو عمارت بنا رکھی ہے اس عمارت کا تباہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہ درندہ اسی طرح لڑکیوں کا شکار کرتا رہے گا اور ویسے بھی اس قسم کی باتیں تو آپ کے سبجیکٹ کا حصہ ہیں۔"

قدسیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا' میرا موضوع بھی اسی قسم کے لوگ تھے۔ معاشرے میں زہر پھیلانے والے بہروپیے۔ میں نے کئی ایسے موضوعات پر فیچر لکھے تھے۔ تصویریں بھی اتاری تھیں۔ ویڈیوز بنائی تھیں' لیکن یہاں یہ معاملہ ایک ایسی شخصیت کا تھا جس کو معاشرے میں بڑا مقدس مقام حاصل تھا۔

لوگ اس پر آنکھیں بند کرکے یقین کرتے تھے۔ اس کے خلاف کوئی بھی کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کے ثبوت کہاں سے لائے جاتے۔ کون گواہی دیتا۔

میرا خیال ہے کہ ایسی ہمت صرف قدسیہ ہی نے کی ہوگی' جو ایسے شخص کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے میرے پاس چلی آئی تھی۔ ورنہ اور لڑکیوں نے تو اپنے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا رکھی ہوگی۔

ایسی صورت میں اس شخص کے خلاف ثبوت کس طرح حاصل کرسکتی تھی۔ میں نے دوسرے دن دفتر میں جاکر اپنے ایک کولیگ فرحان سے بات کی۔

فرحان بھی میرے مزاج کا بندہ تھا۔ اس قسم کے ایڈونچر کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ میرے ساتھ رپورٹنگ کرتے ہوئے کیمرہ بھی وہی آپریٹ کیا کرتا تھا۔

میں اس پر اس لیے بھی زیادہ بھروسا کرتی تھی کہ وہ ایک مہم جو قسم کا نوجوان تھا اور اس قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ میں نے جب اسے پیر کونڈے شاہ کے بارے میں بتایا تو وہ پھڑک ہی اٹھا۔ "یار مزا آگیا ہے' بہت بڑی مچھلی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' لوگ اس سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ بہت چاہتے ہیں اس کو۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے

دینے پڑ جائیں' کیونکہ اس کے تعلقات بھی بہت وسیع ہیں۔ ہر طرح کے لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں۔"

"یہ سب باتیں میرے ذہن میں بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔"

"تو پھر ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ تم خود اپنے آپ کو قربانی کا بکرا بنا کر پیر صاحب کے پاس پہنچ جاؤ۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔" فرحان نے کہا۔ "تمہیں اس لیے کچھ نہیں ہوگا کہ تم ان کی طرف سے پہلے ہی ہوشیار رہو گے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اس کے سامنے جا کر اس سے یہ معلوم کروں کہ اس کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کس حد تک درست ہے۔"

"تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔ تم اس کا انٹرویو لینے نہیں جا رہی۔ اس کے بارے میں حقائق معلوم کرنے جا رہی ہو۔" فرحان نے کہا۔ "اسے تو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے کہ تمہارا تعلق کس شعبے سے ہے۔ تم وہاں اپنا کوئی مسئلہ لے کر چلی جاؤ۔ جیسے اولاد نہیں ہو رہی یا شوہر بہت مارتا ہے یا ابھی تک تمہارے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اگر جو کچھ تم نے سنا ہے وہ صحیح ہے تو وہ تم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرے گا اور اس وقت باقاعدہ جال بچھا کر ہم اس کے خلاف ثبوت حاصل کر لیں گے۔"

میرے ذہن میں بھی کچھ ایسی ہی بات تھی اس آدمی پر اسی طرح ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

بالآخر اس موضوع پر سوچنے کے بعد میں نے پیر کونڈے شاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا آستانہ شہر کی ایک مشہور جگہ پر تھا۔ دو منزلہ مکان جس میں کئی کمرے تھے۔ اس کی فیملی کہیں اور رہا کرتی تھی' جبکہ آستانہ صرف آستانہ تھا' جہاں ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔

ضرورت مندوں کے علاوہ اس کے چیلے بھی ہوا کرتے تھے۔ پچھلی طرف ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں لنگر کے لیے دیگیں چڑھی رہتیں۔ یہ لنگر رات دن جاری رہتا تھا۔ اس کی دھوم اس لیے بھی تھی۔

میں بہت عام سے لباس میں ایک نقاب ڈال کر ضرورت مندوں کی لائن میں لگ گئی۔ فرحان بھی مردوں والی لائن میں کھڑا ہوا تھا اور ہم ایک دوسرے کی طرف سے اجنبی بنے ہوئے تھے۔

بہت دیر کے بعد میری باری آئی۔ مجھے پیر کونڈے شاہ کے حجرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ عجیب ماحول تھا اس کمرے کا۔ اگربتی اور لوبان کے دھوئیں سے بھرا ہوا۔ دیواریں گہرے رنگ کی تھیں۔

فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ خود پیر کونڈے شاہ کی شخصیت عجیب تھی۔ بھاری بھرکم جسم' بڑے بڑے بال' سرخ آنکھیں' لانبا سا عبا پہنے ہوئے ہاتھ میں تسبیح جس کے دانے بہت تیزی سے گر رہے تھے۔

میں اسے ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ "بیٹھ جا۔" اس نے حکم دیا۔

میں ایک طرف بیٹھ گئی۔

"اپنی نقاب اتار۔" اس نے دوسرا حکم دیا۔

میں نے نقاب اتار دی۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا' پھر گہری سانس لی۔ "ہاں بتا کیا پریشانی ہے تیرے ساتھ۔"

"سرکار' میں بہت امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"جانتا ہوں میں' یہاں سب ٹوٹے ہوئے لوگ آتے ہیں اور اوپر والا میرے ذریعے ان کی حاجت روائی بھی کر دیتا ہے۔ بول تیرے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔"

"سرکار' میرے لیے رشتہ نہیں آتا۔" میں نے بتایا۔

"ہائیں۔" وہ چونک پڑا۔ "اتنی اچھی صورت کا رشتہ نہیں آتا۔"

"جی سرکار! اگر آتا بھی ہے تو کسی بہانے ختم ہوجاتا ہے۔"

"ہوں' لگتا ہے تیرے لیے لمبا حساب کتاب کرنا ہوگا۔"

"کچھ بھی کریں سرکار' میں اس محرومی سے تنگ آچکی ہوں۔"

پھر اس نے ایک کاپی اور قلم نکال کر مجھ سے میرا اور میری والدہ کا نام اور تاریخ پیدائش وغیرہ دریافت کی۔ میں ان باتوں کے لیے تیار ہوکر گئی تھی۔ اس لیے میں نے فوراً ہی اسے جواب دے دیے۔

وہ پھر کاپی پر نہ جانے کیسا حساب کتاب کرنے بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ اسی میں لگا رہا تھا' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "دیکھ تجھ پر کسی نے بندش کرادی ہے۔"

"جی سرکار! میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔"

"اچھا ہوا کہ تو میرے پاس آگئی ہے۔" اس نے کہا۔ "تیرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"ضرور کریں سرکار' ورنہ تنگ آکر میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"نہیں ایسا نہیں کہتے' سب ٹھیک ہوجائے گا۔" پیر کونڈے شاہ نے اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ تجھے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی دینی ہوگی۔"

"کیسی قربانی....." میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"کوئی خاص نہیں' تجھے ایک رات میرے ساتھ گزارنی ہوگی۔ میں تجھے سامنے بٹھا کر وظیفے پڑھتا رہوں گا اور صبح تک تیری قسمت کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"لیکن میں یہاں تو نہیں آسکتی۔ اس کے لیے خود آپ کو زحمت کرنی ہوگی۔"

"میں تو کہیں نہیں جاتا ہوں۔"

"پھر تو مجبوری ہے سرکار....." میں نے ایک گہری سانس لی "جو میری قسمت....."

"اچھا یہ بتا' کہاں بلانا چاہ رہی ہے؟"

"اپنی ایک دوست کے گھر میں....." میں نے بتایا۔

"وہ آج کل باہر گئی ہوئی ہے۔ اس گھر کی چابی میرے پاس ہے۔"

"وہاں اور کون آتا جاتا ہے۔"

"کوئی نہیں سرکار' وہ گھر بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔"

"ٹھہر' مجھے اپنے مرشد سے مشورہ کرنے دے۔" پیر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر تک وہ اسی عالم میں رہا' پھر آنکھیں کھول کر بولا۔ "ٹھیک ہے' مرشد نے اجازت دے دی ہے' تو پتا سمجھا دے۔ میں رات دس بجے کے بعد پہنچ جاؤں گا۔"

کہتے ہیں کہ جو جس قدر بنتا ہے' وہ اسی قدر آسانی سے پھنس بھی جاتا ہے۔ پیر کونڈے شاہ جیسا چالاک آدمی اتنی جلدی ہمارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائے گا' اس کی توقع بھی نہیں تھی۔

وہ مکان فرحان کا تھا۔ باقاعدہ پلاننگ کی گئی تھی۔ انتہائی حساس قسم کے کیمرے اور خفیہ مائیک نصب کردیے گئے تھے' کیونکہ ان سب کو امید تھی کہ میں پیر کونڈے شاہ کو گھیرنے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔

میں نے پیر کونڈے شاہ کو پورا پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شاہ صاحب! بس اب مجھے آپ ہی سے امیدیں ہیں۔"

"ہاں ہاں فکر مت کر' پیر کونڈے شاہ نے جس پر ہاتھ رکھ دیا' اس کا بیڑا پار ہوجاتا ہے۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرکے باہر آگئی۔

فرحان نے بتایا تھا کہ وہ بلیو مون میں میرا انتظار کرے گا۔ بلیو مون وہاں کچھ فاصلے پر ایک معقول ریسٹورنٹ تھا۔ فرحان میرا ہی انتظار کررہا تھا۔ "کیا ہوا....." اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"اس نے چارا نگل لیا ہے۔" میں نے بتایا۔ پھر میں نے اسے پوری تفصیل بتا دی کہ وہ کس طرح پر سوا دس بجے کے بعد اس مکان پر پہنچ جائے گا۔

"واقعی بہت کمینہ انسان ثابت ہوا ہے۔" فرحان نے کہا۔ "یعنی اس نے تمہیں آفر کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔"

"یہ ہی تو اس کا ہنر ہے' لگتا ہے وہ مسمریزم وغیرہ بھی جانتا ہے' اگر میں پہلے سے ہوشیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گئی ہوتی تو اس کی باتوں میں آجاتی۔"

"اس کی تو ایسی کی تیسی' پرسوں اس سے نپٹ لیں گے۔"

میں نے ایسا گھٹیا اسائنمنٹ پہلے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ میں باقاعدہ میک اپ وغیرہ کر کے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ پیر کونڈے شاہ اپنے مقرر کیے ہوئے وقت سے آدھ گھنٹے بعد آیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی بزرگی کے تاثر کو گہرا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اب کیا بتاؤں کیسے کیسے ضرورت مند پاؤں پکڑ لیتے ہیں۔" اس نے میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔"

"آپ اندر آجائیں۔"

وہ محتاط قدموں اندر آگیا۔ اس وقت پوری سج دھج کے ساتھ آیا تھا۔ مضحکہ خیز حد تک گہرا سرمہ لگا رکھا تھا اس نے۔ "دیکھ مجھے پورے گھر کی بندش کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔ وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اس گھر میں میرے علاوہ تو کوئی اور نہیں ہے۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ برابر کے مکان میں بیٹھے ہوئے کئی لوگ اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ سن رہے ہیں۔

"جی سرکار۔" میں نے دوسرے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ بندش کردیں۔"

اس نے ایک ایک کمرے میں بندش کی۔ ایک ایک باتھ روم میں بندش کی۔ کچن میں جا کر پڑھتا رہا' پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس وقت واقعی اس گھر میں۔۔۔ میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "لڑکی' میں تیرا مستقبل بہت روشن دیکھ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بس آپ کی توجہ چاہیے سرکار۔"

"مل جائے گی توجہ' مل جائے گی۔ آ میرے پاس آ کر بیٹھ جا۔"

انداز فکر

دنیا کی محبت اندھیرا ہے اور اس کا چراغ تقویٰ ہے۔
گناہ اندھیرا ہے اس کا اجالا استغفار ہے۔
قبر اندھیرا ہے اس کا چراغ کلمہ شہادت ہے۔
آخرت اندھیرا ہے اور اس کا چراغ عمل صالح ہے۔
پل صراط اندھیرا ہے اور اس کا چراغ اللہ پر یقین کامل ہے۔

ہمارے ناشاد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس درجہ کا توکل کر لیتے ہیں جس درجہ کا ہمارا ایمان نہیں ہوتا۔

آنسو اس وقت قیمتی اور مقدس ہوتے ہیں جب دوسروں کے دکھ پر نکلیں۔

اللہ سے صلح رکھو تاکہ آخرت سلامت رہے۔
لوگوں سے صلح رکھو تاکہ دنیا برباد نہ ہو۔

سفر کا آغاز اگر تیزی سے کیا ہے تو دیکھو رکنا نہیں ورنہ تمہارا اپنا ہی غبار تمہیں گرد آلود کر دے گا۔

برے لوگ اچھی باتوں میں بھی برائی کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔

کیا بات ہے؟

ہم زبان

فرانسیسی ناول نگار کولیٹ بلیوں کی بڑی شیدائی تھی' امریکہ کا دورہ کرتے ہوئے اسے بازار میں ایک بلی بیٹھی دکھائی دی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے قریب چلی گئی اور دونوں ایک آدھ منٹ تک سر جوڑے میاؤں میاؤں کرتی رہیں۔

پھر کولیٹ اپنے ساتھی کی طرف مڑی اور کہنے لگی: "آخر مجھے کوئی ایسا تو ملا جسے فرانسیسی بولنی آتی ہے۔"

حالانکہ مجھے اطمینان تھا کہ میرے ہمدرد آس پاس ہی موجود ہیں' اس کے باوجود اس کے وجود سے گھن بھی آرہی تھی اور خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

"آ میرے پاس' میں تجھے اپنی روحانی طاقت دکھانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں آہستہ آہستہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔"

"دیکھو۔۔۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تجھے منزل مل جائے گی' کیونکہ میں نے تجھ پر توجہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"سرکار ایک بات بتائیں۔ کیا توجہ کے لیے کسی لڑکی کا آپ کے پاس بیٹھنا بہت ضروری ہے۔"

"ہاں بہت ضروری ہے۔ نہ صرف بیٹھنا ضروری ہے بلکہ خود کو میرے حوالے کرنا بھی ضروری ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میری بات سنتی رہ۔ میں تیرے لیے رشتوں کے ڈھیر لگا دوں گا' بس تو ایک بار میری بات مان لے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر تیرے پاس اسی لیے آیا ہوں۔"

"سرکار میرا خیال ہے کہ آپ نے کسی اور سے ایسی باتیں نہیں کی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کی ہیں۔ میری پوری توجہ کے لیے ہر لڑکی کو میرے قریب ہونا پڑتا ہے۔"

"اور اگر کوئی نہ چاہے تو۔۔۔"

"یہ تو نہیں ہو سکتا۔" وہ مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔ "پھر میں اس کی زندگی برباد کر کے رکھ دیتا ہوں۔ اس شہر میں کون ہے جو میرا احترام نہیں کرتا۔ لڑکیاں چاہے میرے خلاف کچھ بھی بولتی رہیں' ان کے گھر والے میرے خلاف کبھی نہیں سوچ سکتے۔"

"ایسے ہی لوگوں کے عقیدوں نے تو آپ کو شیر بنا دیا ہے سرکار۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" وہ تھوڑا چونک اٹھا تھا۔ "بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی ہے۔"

"ایک بات پوچھوں سرکار' اگر میں آپ کی بات ماننے سے انکار کردوں تو آپ کیا کرلیں گے؟"

"پھر دیکھ لینا میں تیرا کیسا حشر کرتا ہوں۔ تو نے خالی مکان میں مجھے بلا کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔"

"نہیں سرکار' کلہاڑی تو آپ نے یہاں آکر اپنے پیروں پر ماری ہے۔" میں نے کہا۔

میں اتنا کہہ کر کھڑی ہو گئی اور یہ اشارہ تھا اپنے دوستوں کے لیے۔ پیر کونڈے شاہ ابھی کچھ بول بھی نہیں پایا تھا کہ کھلے ہوئے دروازے سے میرے ساتھی اندر آگئے۔

پیر کونڈے شاہ کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ "کون ہو تم لوگ؟" اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

"ہم لوگ تمہارے باپ ہیں بیٹا۔" فرحان نے کہا۔

"اب سمجھا۔" اس نے ایک ہنکاری بھری۔ "تم لوگ اس لڑکی کی مدد سے مجھے لوٹنا چاہتے ہو' بدنام کرنا چاہتے ہو۔"

"پیر کونڈے شاہ۔۔۔" میرا ایک ساتھی بول پڑا۔ "تمہارا تو کونڈا ہونے والا ہے۔ ہم نے تمہاری ویڈیو بنالی ہے۔ تمہاری ساری باتیں اور ساری حرکتیں اس ویڈیو میں محفوظ ہیں۔"

"اور ہمارا تعلق چینل سے ہے۔" میں نے بتایا۔ "کل شہر بھر کے اخبارات اور چینل تمہاری پارسائی کا اعلان کر رہے ہوں گے۔"

"یہ دیکھو۔۔۔" فرحان نے اشارہ کیا۔ "یہ ہے وہ کیمرہ جو ہم نے تمہاری حرکتیں ریکارڈ کرنے کے لیے لگا رکھا تھا۔"

پیر کونڈے شاہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔ واضح طور پر اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ ایک سکتے کے عالم میں ہم سب کو دیکھے جا رہا تھا۔

"اب نکلو یہاں سے۔۔۔" فرحان نے کہا۔ "اور کل کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کل تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہونے والا ہے وہ پوری دنیا کے لیے عبرت کا نشان ہو گا۔"

پیر کونڈے شاہ کچھ نہیں بول رہا تھا' جیسے وہ بولنا بھول گیا ہو یا اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی

ہو۔ وہ آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا' پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''نہیں' کل تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے' کچھ نہیں کر سکو گے۔''

''لے جا۔۔۔'' فرحان نے آگے بڑھ کر اسے دروازے کی طرف دھکا دے دیا۔ ''اب شرافت سے نکل جا' ورنہ۔۔۔''

ہم نے اس کے خلاف ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ہم سب ہی بہت خوش تھے۔

ہم بہت دیر تک ہوٹل میں بیٹھ کر پلاننگ کرتے رہے کہ دوسری صبح کس طرح پیر کونڈے شاہ کے خلاف آغاز کیا جائے۔

ہمارے پاس اس شخص کے خلاف اچھا خاصا مواد موجود تھا۔ اب ہم جو چاہتے وہ کر سکتے تھے۔ بہرحال بہت دیر کی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ہم۔۔۔ ساری فوٹیج مختلف چینلز کے حوالے کر دیں گے۔

دوسری صبح آٹھ بجے فون کی مسلسل گھنٹی نے مجھے بے دار کر دیا تھا۔ دوسری طرف فرحان تھا۔ ''یار' ہم نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیوں کیا بات ہو گئی۔''

''یار۔۔۔ پیر کونڈے شاہ نے رات ہی کو خودکشی کر لی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا۔۔۔'' مجھے بھی یہ سن کر ایک شاک سا لگا تھا۔

''خودکشی کر لی۔''

''ہاں بھئی' اب سمجھ میں آیا کہ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

''اس وقت تو اس کے گھر پر ہنگامہ برپا ہو گا۔''

''ہاں سارے اخبارات اور چینلز والے موجود ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''کسی کو اس کی خودکشی کی وجہ نہیں معلوم' بس مختلف قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔''

''فرحان تم اس کے گھر پہنچو' میں بھی پہنچ رہی ہوں۔''

میں ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ وہاں واقعی بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پیر کونڈے شاہ کے گھر والوں' رشتے داروں اور میڈیا والوں کے علاوہ اس کے پیروکاروں کی بہت بھیڑ تھی۔ میں کسی طرح گھر کے اندر جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کی بیوی اور تینوں بیٹیوں کو دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی تھی۔ وہ بہت سیدھی سادی تھیں۔ بالکل عام گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کی طرح۔۔۔ خاص طور پر پیر کونڈے شاہ کی چھوٹی بیٹی بہت پیاری سی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ برس کی' اس نے بچوں کی سی معصومیت سے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ''آنٹی ایک بات بتائیں' میرے ابو تو اچھے آدمی تھے نا۔۔۔''

میں نے اس بچی کی طرف دیکھا۔

ابھی اسے زندگی کا بہت سفر طے کرنا تھا۔ اگر باپ کی بدنامی کا داغ اس کے وجود پر لگ جاتا تو شاید وہ ساری زندگی کے لیے نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتی۔

''بتائیں نا آنٹی میرے ابو تو اچھے آدمی تھے نا۔''

''ہاں بیٹا تمہارے ابو بہت اچھے آدمی تھے۔ بہت نیک۔۔۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تو پھر انہوں نے خودکشی کیوں کی؟''

''خدا کی مصلحت ہو گی بیٹا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لو۔''

میں اس معصوم بچی کو روتا ہوا چھوڑ کر اس گھر سے باہر آ گئی۔ اس دن ہم نے اس کے خلاف حاصل ہونے والے سارے ثبوت تلف کر دیے تھے۔

جب خدا نے اسے سزا دے دی تھی تو ہم کون ہوتے تھے سزا دینے والے۔

خدا سے بہتر انصاف کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

☆ ☆

شگون

اقبال بھٹی

ان لوگوں کی روداد' جو اپنی غرض کی خاطر دوسروں کے جذبات کا خون کرنے میں دریغ نہیں کرتے ایک نیک دل خاتون کا فسانہ وہ خار کو گل سمجھ کر گلے لگا بیٹھی تھی۔

حساس دلوں کے لیے ایک تاثر انگیز کہانی

جاڑے کا موسم کڑاکے کی سردی اور اس پر لگاتار پانچ دنوں سے چھایا ہوا کہر' جسم و جاں کو راحت بخشنے والی دو ہی چیزیں نظر آتی تھیں' ایک تو انگیٹھی میں شعلوں کی اٹھی ہوئی لال لال زبانیں' دوسری گرما گرم کافی کی پالیاں۔

سرکار نے اسکول' کالج بند کروا کے ملازمت پیشہ عورتوں کے لیے ایک اور سہولت فراہم کردی تھی۔ کالج بند تھا۔ اس لیے میری جگری دوست شیلا بھی میری ہی بیٹھک میں گرم فضا کا لطف لے رہی تھی' وہ عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑی تھی' مگر دوستی میں بھلا عمر کی کیا رکاوٹ؟ اس کے دو بچے تھے اور دونوں دہلی یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ بیٹی ایلا بڑی ہی پیاری' بے حد ملنسار امور خانہ داری میں طاق اور تعلیم میں سب سے آگے تھی۔ اسے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچتی تھی کہ میری بیٹی بھی ایلا کی طرح بنے۔ بیٹا راجو بھی بہت اسمارٹ اور ذہین تھا۔ شوہر یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے' مجموعی طور پر گھرانہ خوش حال تھا۔

اچانک شیلا دیدی کے شوہر رامانند بابو اندر داخل ہوئے اور انگیٹھی کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "واہ! کیا لطف ہے مینا جی! نیپال کا ایمان دار' خدمت گار' شوہر کے بھیجے ہوئے ڈالر اور کالج کی دی ہوئی چھٹی۔ اسے کہتے ہیں سکھ کی انتہا۔"

میں نے کہا۔ "جاڑے میں آپ میاں' بیوی ایک ساتھ ہیں' یہ سکھ نہیں ہے؟ میرے شوہر تو سات سمندر پار ہیں' پیسے سے کوئی کیا آنند حاصل کرسکتا ہے؟"

شیلا دیدی نے کہا۔ "جانتی ہو مینا' ہم لوگ آج کل پیسوں کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ سرکار پابندی سے تنخواہ دیتی نہیں' خرچ تو رکنے والا نہیں' دودھ والے کا بقایا' نوکرانی کا بقایا' بچوں کی فرمائشیں' پچھلے ماہ دس ہزار ایڈوانس لیے تھے تو کام چلا' اس ماہ پھر وہی پریشانی۔"

زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہیے' دوست' شناسا اور رشتہ دار یہی سب تو مصیبت میں ساتھ دیتے ہیں۔ میں نے انہیں سراہا۔

اسی وقت میرا ملازم بہادر' رامانند بابو کے لیے کافی اور پکوڑے رکھ گیا۔ انہوں نے ایک پکوڑہ اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔ "واقف کاروں کا کام یہ ہے کہ راہ چلتے اسکوٹر موٹر سائیکل یا کار کی رفتار ذرا کم کرکے ہاتھ ہلا کر پوچھنا' کہئے فلاں صاحب سب خیریت ہے نا؟" اب سر راہ کوئی چیخ کر تو کہنے سے رہا۔ "نہیں' جی میں

بہت پریشان ہوں' آپ ذرا رکیے تو سہی۔ رشتے داروں کا کام ہے تقریب میں شریک ہو کر کسی سی آئی اے ایجنٹ کی عقابی نظروں سے عیب ڈھونڈنا اور دوسروں سے بیان کرنا۔"

میں نے کہا۔ "مشاہدہ تگڑا ہے آپ کا۔"

"تجربہ بھی تگڑا ہے۔"

ان کی بات سن کر ہم تینوں ہنس پڑے۔ الاؤ میں کچھ اور سوکھی لکڑیاں ڈال دی گئیں۔ میں نے کہا۔ "آپ پیسوں کی فکر مت کریں۔ پیسے کس کام کے لیے ہوتے ہیں۔ راجو کیا میرا بیٹا نہیں؟ اور ایلا پر تو میرے شوہر جان چھڑکتے ہیں۔ کل فون پر کہہ رہے تھے کہ اس مرتبہ امریکا سے لوٹتے وقت ایلا کے لیے ایک سندر سی گھڑی اور چار' پانچ سوٹ لائیں گے۔"

میری بات بات کاٹتے ہوئے شیلا کے شوہر بول پڑے۔ "آپ لوگ ایلا اور راجو کے لیے جتنا کرتے ہیں' اتنا تو شاید کوئی اپنی اولاد کے لیے بھی نہیں کرتا' وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہماری تو دو مائیں ہیں اور دو باپ ہیں۔"

میں خوشی سے کھل اٹھی۔ بچوں کے یہ تاثرات سن کر میرا دل تصور کے پنکھ لگا کر بادلوں کے پار اڑ چلا۔

"تم کہاں کھو گئیں؟" شیلا دیدی نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا شوہر کی یاد آرہی ہے؟"

"شوہر کو وقت بے وقت یاد کرنا بھلی عورتوں کا کام نہیں' دیدی....!"

"رامانند بابو نے ایک قہقہہ لگایا' بھلی نہیں' مذہبی کہیے۔"

شیلا دیدی بولیں۔ "اب چلیں گے بیٹا۔"

"کھانا کھائے بغیر گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ویسے آپ کو بتادوں کہ بہادر نے آپ کا کھانا تیار کرلیا ہے۔" کھانے کے بعد جب وہ گھر جانے لگے تو میں نے دس ہزار کا چیک کاٹ کردیے دیا۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کہانیاں میرے دل کو تھپکی دے رہی تھیں۔

ایک دن میں آفس میں بیٹھی ہوئی تھی کہ شیلا دیدی ہوا کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئیں اور بولیں راجو اور ایلا شام کو فون کریں گے۔ میں خوشی خوشی ان کے گھر پہنچ گئی۔ جیسے ہی فون پر ایلا کی آواز سنائی دی۔ "آنٹی آپ کیسی ہیں؟" میں نے چہکتے ہوئے کہا۔ "جس کی بیٹی آئی ایس آئی ہو رہی ہو اس کی آنٹی ہمیشہ چہکتی رہے گی۔"

میں نے راجو اور ایلا دونوں کو مبارک باد دی اور چار دن کے لیے مظفر پور آنے کو کہا۔ ایلا نے مایوسی سے جواب دیا۔ "آتو جائیں' مگر ممی اور ڈیڈی اس مہنگائی کے دور میں ایک ہزار روپیہ کا ناقابل برداشت بوجھ سہہ سکیں گے؟ انہیں تنخواہ بھی نہیں مل رہی ہے۔"

میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "ایلا' تم آجاؤ' پیسے میں دے دوں گی۔"

بچوں نے خوش ہو کر کہا۔ "شکریہ آنٹی شکریہ۔"

میں گھر لوٹ کر اپنے شوہر کو امریکا خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط کیا تھا۔ شیلا دیدی کے بچوں کی داستان تھی۔ میں جان بوجھ کر دس ہزار دینے والی بات چھپا گئی۔ کسی عقل مند خاتون نے کہا تھا کہ مرد کو نہ کبھی حساب دو' نہ اس سے حساب لو۔ بس ازدواجی زندگی کی گاڑی بڑے پریم سے آگے بڑھتی رہے گی۔ اپنا پیسہ اور اپنی بیوی' مرد کے لیے خفیہ چیزیں ہوتی ہیں۔ میں نے اس پر غور کیا اور عمل کیا' اس لیے ہمیشہ سکھی رہی۔

ایلا اور راجو میرے لیے ایک پرس اور ایک جوڑا چپل لائے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بچے بڑے ہوگئے ہیں اور وہ میرے لیے تحائف لائے ہیں۔ اس احساس نے مجھے جذباتی کردیا۔ میں نے دونوں بچوں کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ میں نے انہیں اپنے گاؤں نہ جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا اور شیلا دیدی سے اجازت بھی لے لی تھی۔ ہم گاؤں پہنچے تو میری ساس نے دونوں کو بڑے پیار سے کھانا کھلاتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹی' تم جب ایس پی بن جاؤ گی تو سب سے پہلے کس کی قدم بوسی کرو گی؟"

ایلا نے جواب دیا۔ "آنٹی کی قدم بوسی کروں گی اور کس کی؟"

وہ ہنس کر بولیں۔ "کیوں بھلا؟ ماں' باپ سے بڑھ کر آنٹی تھوڑے ہی ہیں۔"

راجو نے کہا۔ "یہ شگون والی آنٹی ہیں۔ جب جب آنٹی کے پیسوں سے جس جس امتحان کا فارم بھرا گیا ہم کامیاب ہوتے گئے۔ جب پتا جی کے پیسے لگتے ہیں کام اٹک جاتا ہے دادی اماں۔"

واپس مظفر پور آکر بچوں نے میری تعریف کے پل باندھ دیے' شیلا دیدی نے کہا۔ "تم تو جانتی ہو اگر ایک آدھ بار اور تمہارے گاؤں کی یاترا ہوئی تو راجو اور ایلا ہمیشہ کے لیے تمہارے ہی ہو جائیں گے۔"

میں نے جواب دیا۔ "وہ تو ہیں ہی میرے' گاؤں جانے کی کیا ضرورت ہے' مظفر پور میں ہی پوچھ لیجیے۔"

ہم دونوں ہنس پڑیں' میں جذباتی ہوگئی اور جذبات آنسو بن کر آنکھوں سے جھانکنے لگے۔ شیلا دیدی نے دیکھ لیا۔ "پگلی کہیں کی' کوئی اتنا جذباتی ہوتا ہے۔"

ہم' بچوں کو دہلی جانے والی وشال ایکسپریس میں بٹھا کر آئے تھے۔ شیلا دیدی اور رامانند بابو اپنے گھر چلے گئے اور میں اپنے گھر آگئی' مجھے نڈھال دیکھ کر بہادر نے اپنی نیپالی زبان میں ایک کہاوت دہرائی۔ جس کا مطلب تھا آٹے کی چاہے جتنی روٹیاں بنالو' پرائے بچے اپنے نہیں ہوتے۔

مجھے لگا بہادر نے مجھے زناٹے دار چپت رسید کردی ہے۔ میں تلملا کر رہ گئی' بہادر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم بہت زیادہ بولنے لگے ہو' خبردار جو راجو اور ایلا کو پرایا کہا۔" وہ غریب خاموش ہوگیا۔

سورج روز نکلتا' روز سانجھ ڈھلتی' چڑیاں اپنے گھونسلوں میں لوٹتیں اور رات میں اپنی چادر پھیلا کر سب کو اپنی گود میں سلا لیتی' یہی عمل جیون چکر بنتا ہے۔ شیلا دیدی کے بچوں کے امتحان کے بارے میں سوچ سوچ کر میں خوشی کے پھولوں کی خوشبوؤں سے مدہوش ہونے لگتی لگتا' روح میں خوشیوں کا کوئی جھرنا اس اب پھوٹنے ہی والا ہے' ہر روز شام کو ایلا فون پر اپنے پرچوں کے بارے میں تفصیل سے بتاتی اور میں کچھ اور سرور محسوس کرتی' ایک دن میں آفس میں اکیلی بیٹھی تھی' بیشتر لوگوں نے چھٹیاں لے رکھی تھیں' میں کتابوں کی نئی فہرست کا جائزہ لے رہی تھی کہ ششی کلا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "جوڑی سلامت رہے' مگر جوڑی الگ الگ کیوں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "شیلا دیدی کے مکان کا کام جاری ہے' اسی لیے وہ چلی گئیں۔"

ششی نے کہا۔ "حیرت ہے جس صوبے میں یونیورسٹی میں چھ چھ مہینے کی تنخواہ نہ ملتی ہو' جہاں روزمرہ کی ضروریات پوری کرنا کٹھن ہو وہاں مکان پر مکان لوگ کیسے بناتے جاتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "نچلا حصہ بینک کو کرائے پر دیا گیا ہے' بالائی منزل بن کر تیار تھی' چھت کا کام باقی تھا' اگلے سال ایلا کی شادی ہوگی تو مکان تو چاہیے ہی۔ اسی لیے میں نے تب تک کے لیے کچھ رقم دے دی۔"

اسی وقت ایک طالب علم آگیا اور بات رک گئی' اس کے جانے کے بعد ششی نے کہا۔ "برا مت ماننا مینا' تم بہت سیدھی اور شیلا اور اس کے شوہر بے حد چالاک... تم سے پہلے ایک ڈاکٹر رفعت جہاں ہوا کرتی تھی' کنواری... کسی نواب کی لاڈلی بیٹی تھی' شیلا نے راجو اور ایلا کو اس سے ایسے چپکا دیا جیسے گوند سے کاغذ' ہائی اسکول تک کا سارا خرچا اس بے چاری نے برداشت کیا' رامانند نے اس سے دل بھی لگا لیا' مگر جانے کیا ہوا کہ ایک دن رفعت نے خودکشی کر لی' اب ان کا شکار تم ہو۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بس کرو' ششی' ایلا اور راجو مجھے "شگون آنٹی" مانتے ہیں' اسی لیے پیسے لیتے ہیں' ورنہ انہیں کیا کمی ہے' میاں' بیوی دونوں ہی بہت اچھی تنخواہ لیتے ہیں۔"

ششی چڑھ کر بولی۔ "شگون وگون کچھ نہیں' سب پیسوں کا کھیل ہے' منی پوری یونی ورسٹی میں اتنا لالچی جوڑا کوئی دوسرا نہیں ہے' نئے نئے دوست بنا کر عمدہ شراب حاصل کرنا' نئی نئی آسامیاں بنا کر بچوں کی تمام ضروریات پوری کرنا ان کا پرانا شغل ہے' آگے تم جانو تمہارا کام جانے۔"

"میرے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا' میں اٹھ کر باہر آگئی' رکشہ منگوایا اور شیلا دیدی کے ہاں روانہ ہوگئی' کتنے اچھے ہیں دونوں' کتنے پیارے بچے ہیں' مجھے کتنا پیار ملتا ہے' جب ہی تو لوگ جلتے ہیں۔ جلتے رہیں' مجھے کیا۔ میں دل ہی دل میں سوچتی ہوئی راجو اور ایلا کو یاد کرنے لگی' ایسے بچوں پر کچھ رقم خرچ کر کے انسان اپنی ہی عزت میں اضافہ کرتا ہے' مگر ششی جیسے لوگ کتنی گھٹیا باتیں سوچتے ہیں' دوستی کا راز دوستی کر کے ہی جانا جاتا ہے۔"

ایک دن صبح ہی صبح مجھ پر جیسے بجلی گری' ڈاکیہ نے ایک تیلی گرام دیا' میرے شوہر امریکا میں ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے' جسم جل کر راکھ ہوگیا تھا' میں ہاتھوں میں تار لیے دم بخود کھڑی رہ گئی' دماغ سن ہوگیا تھا' دل نے گویا دھڑکنا چھوڑ دیا تھا' جسم جیسے پتھر کا ہوگیا تھا' بہادر نے تار لے کر پڑھا اور روتا' چلاتا' شیلا دیدی کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

شیلا دیدی اور رامانند بابو آئے' مجھے سنبھالا' نہ جانے کیا کیا کہتے رہے' میں رو بھی نہیں رہی تھی' آنکھیں سلگ رہی تھیں' لیکن ان میں آنسو نہیں تھے' شاید لٹے ہوئے مسافر کے پاس یہ بھی نہیں بچتے' دل میں درد کی ہوک سی اٹھ رہی تھی' کنپٹیاں گرم ہو رہی تھیں' گلا خشک ہو رہا تھا' سب کچھ خالی ہوگیا تھا' دل بھی اور زندگی بھی۔

مجھے دہلی لے جایا گیا' تمام خانہ پوری ششی کلا اور

اس کے شوہر نے کی' شیلا دیدی کے بچوں کے امتحانات کا نتیجہ نکل گیا تھا' دونوں کامیاب ہوگئے تھے اور کسی کام کے سلسلے میں کسی سے ملنے کہیں باہر گئے ہوئے تھے' خوشی کلانے یہی بتایا تھا۔

مذہبی رسوم گاؤں میں انجام پائیں' کالج کے بہت سے ہم پیشہ شامل ہوئے' مگر میری آنکھیں راجو اور ایلا کو ڈھونڈ رہی تھیں' آخری دن شاید میرا شعور بے دار ہوا' میں نے اپنے ایک ہم پیشہ سے پوچھا۔

"رامانند بابو یا شیلا دیدی؟"

وہ میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولے۔ "آپ کے گھر میں پہلا واقعہ کریا کرم کا تھا' اس لیے وہ لوگ نہیں شامل ہوئے' کہہ رہے تھے کہ آپ کے بچوں ابو' انا کی شادی میں شریک ہوں گے۔ ویسے وہ لوگ مظفر پور میں ہیں ہی نہیں' باہر گئے ہوئے ہیں۔"

مجھے دکھ تو بہت ہوا' مگر دکھوں کے ساگر میں ایک بوند کے ٹپکنے سے کیا ہوتا ہے' میں اپنے ہی کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سوچا' شیلا دیدی کا سپنا سچ ہو رہا ہے' وہ سدا سکھی رہیں' نہ جانے کس خیال نے مجھے ابو اور انا کو سینے سے چپکا لینے کو بے چین کر دیا' میں انہیں سینے سے لگا کر شوہر کے غم میں ڈوب گئی۔

تین ماہ بعد میں گاؤں سے لوٹی' ساس' سسر کو چھوڑنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا' مگر دونوں نندوں نے مجھے یہ کہہ کر جبراً بھیج دیا کہ کام میں مصروف رہو گی تو دھیرے دھیرے غم بھول جاؤ گی' کالج میں شیلا دیدی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"معاف کرنا بیٹا' ہم لوگ نہیں آسکے' دو چار بڑے افسروں سے بچوں کو ملانا تھا' اصل میں تمہارا دکھ ہم سے دیکھا نہیں جاتا' اس لیے ہم نہیں آئے' تمہیں سفید ساڑھی میں زندہ لاش بنے دیکھنا ہمارے لیے موت کے برابر ہی ہوتا۔"

وہ رو پڑیں اور میرے دل کا سارا میل ان کے آنسوؤں میں دھل گیا' مجھے لگا' شاید شیلا دیدی ٹھیک ہی کہتی ہیں' میری ماں بھی تو اسی وجہ سے گاؤں نہیں گئی تھیں۔

پرانا گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا' ہر شے سے شوہر کی یادیں جڑی ہوئی تھیں' وہ بالکونی میں بیٹھ کر چائے یا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے شادی کے وقت کی الڑ مستی بھری یاد دلاتے تھے۔ برآمدے میں وہ اپنے دوستوں سے گپیں ہانکتے تھے' ڈرائنگ روم میں لکی' سوہنی' مہینوال کی تصویر' جگر میں کٹار کی طرح اتر جاتی' دل لہولہان ہو جاتا' بستر مجھے شمشان گھاٹ کی چتا کی طرح محسوس ہوتا۔

ان کی پھوپھی اسی شہر میں مٹھن پورہ محلہ میں رہتی تھیں' پہلے کم آنی جانی تھیں' لیکن اب تو ہر روز مجھے دیکھے بنا انہیں چین نہیں آتا تھا۔ انہوں نے میرے مشورے سے اپنے پڑوس میں مجھے ایک پلاٹ خرید دیا' اس پر مکان تعمیر کرنے میں اندازے سے زیادہ خرچ ہو گیا' پانچ ہزار روپے کم پڑ رہے تھے' شیلا دیدی کے نام ایک خط لکھ کر میں نے مزدور کو دے دیا اور اپنی بچی انا کی فراک میں بٹن ٹانکنے لگی' پھوپھی ابو کو گود میں لیے بیٹھی تھیں' ابو نے کہا۔ "دادی اماں' دیکھیے کو امنڈیر پر بیٹھ کر اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہا ہے۔ اچھا شگون ہے نا؟"

پھوپھی نے کہا۔ "وقت اچھا ہو تو سب اچھا ہوتا ہے بیٹا' ورنہ کوے کو ایک بار رانی نے بات مار کر گھائل بھی کر دیا تھا۔"

"کون سی رانی اور کیسا کوا تھا؟"

میں سن رہی تھی... پھوپھی بولیں۔ "بہت پہلے کی بات ہے نیپال میں ایک رانی ہوا کرتی تھی' راجہ پردیس گئے تھے' منڈیر پر کوا بیٹھا تھا' رانی نے کہا' کوے بولو اور شگون کرو کہ راجہ بخیر و عافیت لوٹ آئیں تو میں تجھ کو چاندی کی کٹوری میں دودھ بھات کھلاؤں گی' کوا کائیں کائیں کر کے اڑ گیا' رانی خوش ہو گئی' شگون اچھا سمجھ کر راجا لوٹ آیا۔ رانی سکھ ساگر میں ڈوب گئی' کوا بے چارا روز دودھ بھات کی آس لیے کائیں کائیں کرتا' ایک دن وہ رانی کے جھروکے پر بیٹھ گیا' رانی نے غصہ میں اس پر پتھر کھینچ مارا' گھائل کوا روتا ہوا اڑ گیا

اور بولا' ایک دن کوا شگون تھا۔۔۔ ایک دن کوا' کوا۔۔۔ سو اسی کو تو پان کھلائے' مجھ پر پھینکا پوا۔"

مزدور لوٹ آیا' پرچی پر لکھا تھا۔ "معاف کرنا مینا' تنخواہ کی پوری رقم ہم نے دوسرے کام میں لگا دی ہے۔"

پھوپھی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "دلہن' میں مزدور کو اپنے گھر لے جا رہی ہوں' تمہارے پھوپھا سے رقم لے کر دیتی ہوں' تم فکر مت کرو۔"

مکان تیار ہو گیا اور میں پھوپھی کے پڑوس میں آ گئی' بچے بھی چھٹیاں گزار کر اسکول چلے گئے' کالج میں نیپالی پڑھنے والے صرف تین ہی طلبا تھے' اس لیے پرنسپل سے اجازت لے کر وہ کبھی کبھی درس لینے میرے گھر پر ہی آ جاتے تھے' شیلا دیدی سے بہت کم ملاقات ہوئی تھی' ایک دن ایک طالب علم نے مجھے بتایا کہ ان کے دونوں بچے آئی اے ایس ہو گئے۔

سن کر میں نے کہا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

"سارے شہر میں چرچا ہے۔" وہ بولا۔

میں بھاگی بھاگی گئی کہ انہیں مبارک باد دے دوں' وہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس لیے میں جلدی ہی اٹھ گئی۔ شیلا دیدی کچن میں مصروف تھیں' وہیں سے کہا۔ "برا مت ماننا مینا' پھر آنا۔"

"جب ایلا آئے گی تو ضرور آؤں گی۔" میں نے جواب دیا اور لوٹ آئی۔

ایک دن اچانک ایک طالب علم پھوپھی کو ایک کارڈ دے گیا' بہادر بازار گیا ہوا تھا' میں چائے بنا رہی تھی' جا کر کارڈ دیکھا' راجو اور ایلا کے ولیمہ کا کارڈ تھا' میں بھونچکی رہ گئی' مجھے اس طرح نظر انداز کیے جانے پر اپنی ذلت کا شدید احساس ہو رہا تھا' شادی کب ہوئی' کچھ پتا نہیں' میں صرف دس دن سے چھٹی پر تھی' مگر شیلا دیدی نے ذکر تک نہیں کیا تھا' پھر سوچا ممکن ہے' بچوں نے محبت کی شادی کی ہو۔

میری طبیعت ست تھی' پھوپھی نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بخار ہے' مت جاؤ۔"

میں نے جواب دیا۔ "ایلا اور راجو کو میں نے سات برس سے بچوں کی طرح پالا ہے' پھوپھی' ہر شگون میرے ہاتھ ہوا' آج نہیں جاؤں گی تو ایلا اداس ہو جائے گی' مجھے جانے دیجیے۔"

میرج ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا' میں دندناتی ہوئی اندر گئی' اسٹیج پر راجو اپنی دلہن کے ساتھ اور ایلا اپنے دولہا کے ساتھ براجمان نظر آئے' راجو کے ہاتھ میں میرے شوہر کی ہیرے جڑی ہوئی گھڑی تھی جو مجھے دور ہی سے نظر آ گئی' جب امریکا سے میرے شوہر کا سامان آیا تھا تو شیلا دیدی نے وہ گھڑی روتے ہوئے اٹھالی تھی۔ "انکل کی نشانی راجو کے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔"

میں نے سوچا جیسے ابو' ویسے راجو' شگون کے طور پر دونوں دلہنوں کے لیے بنارسی ساڑھیاں اور کانوں کے جھمکے تھے' دولہوں کے لیے ایک ایک انگوٹھی اور سوٹ کا کپڑا تھا' میں نے بینک سے رقم نکلوائی تھی' تو پھوپھی نے کہا تھا کہ یہ میری فضول جذباتیت ہے' مگر میں اپنے راجو اور اپنی ایلا کے یہ شگون لیے ندی کی دھارا کی طرح ان کی طرف بڑھی' اسٹیج پر پہنچ کر میں نے ایلا کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا' تب ہی شیلا دیدی نے ایلا کی بانہہ میں چٹکی کاٹی' ایلا جلدی سے الگ ہو گئی' میں اس کے شوہر کے ہاتھوں میں سوٹ کے کپڑے کا پیکٹ تھما رہی تھی تو ایلا نے اس سے کہا۔ "شرد' یہ مینا آنٹی ہیں۔"

دولہے نے اپنے ہاتھ میرے پاؤں کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ ایلا نے سرگوشی کی۔ "چھونا مت۔۔۔ بیوہ ہیں۔"

میرا سر چکرانے لگا' مجھے کچھ ہوش نہیں کہ میں نے شگون کا پیکٹ کیسے راجو اور اس کی دلہن کو پکڑا دیا۔ ان کا بھی ہاتھ جوڑ کر بے رخی سے پرنام کرنا دیکھ کر میں تیزی سے واپس مڑ گئی' اس گھائل کوے کی طرح جو ایک دن شگون تھا۔

✿ ✿

جوش بے ہوش

شائستہ نعیم

جس طرح نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح جوش سے کام لینے کے لیے ہوش کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کہانی کا اہم کردار نقل کو عقل سے، جوش کو ہوش سے لا تعلق سمجھتا تھا اس کا خیال تھا۔ کہ جب سب کچھ کرنے کا مصمم ارادہ کرلو تو پھر جذبات اور احساسات کو پس پشت ڈال دو خود کو بے لگام موجوں کے حوالے کردو اور نتائج اللہ پر چھوڑ دو۔

ایک شخص کی پر سرار داستان جو سڑک پر چلتے چلتے اچانک غائب ہوگیا تھا

جب کانسٹیبل اینڈریو جیسا جوان آدمی سراغ رساں بننے کی خواہش ظاہر کرے تو یہ طے ہے کہ افسر سمجھیں گے کہ وہ کام چوری کی وجہ سے یہ خواہش کررہا ہے اور ساتھی کانسٹیبل کہیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے، کھال سے باہر ہورہا ہے لیکن اینڈریو کو دونوں باتوں کی پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے اور کس طرف جارہا ہے۔

ایسے معاملات میں حتمی فیصلہ پیٹریلا کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ گبریل اسٹریٹ کے اسٹیشن پر ڈی ٹیکٹو انسپکٹر تھا لیکن بہرحال اس کی سفارش وزن رکھتی تھی۔ "وہ بہت کم عمر ہے" پٹریلا نے کہا۔ "اس میں خود اعتمادی بلا کی ہے۔ ہر کام تنہا کرنا چاہتا ہے۔ کسی کا مشورہ آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اس کے باوجود....."

"اس کے باوجود....." سپرنٹنڈنٹ بنجمن نے جو ایکس ڈویژن کی سی آئی ڈی سرگرمیوں کو کنٹرول کرتا تھا، کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ وہ اچھا سراغرساں ثابت ہوگا۔"

"جی ہاں، میرا یہی خیال ہے۔"

تو ٹھیک ہے۔ ہم اس کا نام آگے بڑھادیں گے۔" بنجمن نے کہا۔ وہ بڑا معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ یہ لفظ بہ لفظ وہی رپورٹ ہے جو پٹریلا کے بارے میں سپرنٹنڈنٹ ہیکسٹل نے اسے دی تھی۔

"میں اسے سارجنٹ کرافٹ کے ساتھ لگادوں گا۔" پٹریلا نے کہا۔ "جلد ہی اسے اندازہ ہوجائے گا کہ سراغرساں کا کام کوئی تفریح نہیں۔"

سارجنٹ کرافٹ شادی شدہ آدمی تھا۔ سی آئی ڈی کے دوسرے افسروں کی طرح اس کی عمر بھی کافی ہوچکی تھی۔ اتنی کہ اب مزید پروموشن کی خود فریبی بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دو مہینے میں اس نے اینڈریو کی بھی تقریباً ہر خود فریبی ختم کردی۔

"یہ تو لگتا ہے کہ صرف فارم بھرنے کا کام ہے۔" اینڈریو نے کہا۔ "یہاں کبھی ایکشن کا موقع بھی ملتا ہے؟"

"ایکشن؟" سارجنٹ کرافٹ نے حیرت سے کہا۔ "ایکشن کی خواہش کیوں ہے تمہیں؟ تم نوجوانوں کے

ساتھ خرابی ہی یہی ہے۔ چلو۔ اب چھٹی کریں۔"

وہ ایک ساتھ گھر کی طرف چل دیے۔ آدھی رات ہو چکی تھی لیکن ایکس ڈویژن والے وقت کی قید سے آزاد تھے۔

"میں تو بور ہو گیا ہوں۔" اینڈریو نے کہا۔ "تمہیں کبھی ایکسائٹ منٹ سے واسطہ نہیں پڑتا۔"

"یہ میری پیشانی پر گھاؤ کا نشان دیکھ رہے ہو؟ یہ تحفہ مجھے اس وقت ملا جب میں نوجوان اور بے وقوف تھا۔ میں ایک مسلح شخص کو گرفتار کر رہا تھا۔"

"تو اس نے تم پر گولی چلا دی؟"

"ہوا یہ کہ اس نے مجھ پر ریوالور تانا تو میں نے کہا' اسے جھکا لو۔ مجھ پر گولی چلا کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس نے کہا۔۔۔ اچھا! تو یہ لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ ریوالور کو لوڈ کرنا بھول گیا تھا۔"

"لیکن یہ گھاؤ۔۔۔؟"

"سنو تو۔ اس نے ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ اچھا۔۔۔ اب مجھے یہاں سے مڑنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔" اینڈریو نے خشک لہجے میں کہا۔

اینڈریو فوراً ہی اپنی اقامت گاہ کی طرف نہیں چل دیا تھا۔ وہاں اس کے لیے کوئی کشش تھی بھی نہیں۔ وہ وہیں ساؤتھ بورڈ پرائمری اسکول کی' کھیل کے میدان کی چہار دیواری پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ خیالات اس کے نوجوان ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔

وہ سارجنٹ کرافٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ سارجنٹ خطاؤں کا پتلا تھا لیکن اس میں ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ راشی نہیں تھا۔ بکاؤ نہیں تھا اور اینڈریو نے اپنی مختصر زندگی میں راشی بہت دیکھے تھے۔ خود اینڈریو قدامت پرست تھا۔ لہٰذا وہ بکنے والوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے سوچا' عنقریب میں سارجنٹ کرافٹ کی جگہ لے لوں گا۔ پیٹریلا کی طرح ڈی ٹیکٹو

انسپکٹر... بلکہ شاید بنجمن کی طرح سپرنٹنڈنٹ بن جاؤں گا مگر مجھے کوئی چانس تو ملے۔

دور سے ایک کار آرہی تھی... بہت تیز رفتاری سے!

اینڈریو دیوار پر ایڑی مارتے ہوئے سوچتا رہا۔ "اس سسٹم میں خرابی ہے' مسئلہ یہ ہے کہ اس سسٹم کے تحت تمام کریڈٹ... ارے... ارے..." کار اسی کی طرف چلی آرہی تھی۔

کار پہاڑی پر آگئی۔ اس کی ہیڈلائٹس روشن نہیں تھیں۔

اینڈریو نے جھپٹ کر اپنی ٹارچ جیب سے نکالی' اچھل کر دیوار سے اترا' بیچ سڑک پر آیا اور کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کار تقریباً" اس کے سر پر پہنچ کی تھی۔ "یہ تو رکنے والی نہیں لگتی۔" اینڈریو کے ذہن میں چھٹی حس کا یہ پیغام گونجا۔ اس کے ساتھ ہی اینڈریو نے سائیڈ میں چھلانگ لگائی۔

کار راکٹ کی سی رفتار سے اس کے پاس سے گزر گئی۔ ہلکا سا دھماکا ہوا۔ کچھ نکیلی چیزیں اڑ کر اینڈریو کے چہرے سے ٹکرائیں۔ کار کے بریک چرچرائے۔ وہ گھومتی ہوئی بائیں جانب مڑی... اس طرف جہاں سارجنٹ کرافٹ گیا تھا۔ انجن کی دہاڑ کم ہوتی گئی۔

اینڈریو نے ہاتھ پھیر کر دیکھا' اس کے چہرے پر خون تھا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کر کے فٹ پاتھ کا جائزہ لیا۔ کار لیمپ پوسٹ کے پاس سے گزری تھی اور اس کا سائیڈ مرر لیمپ پوسٹ سے ٹکرایا تھا۔ اس مرر کے ٹکڑے تھے' جو اس کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔

اس نے خود کو سنبھالا اور اس طرف دوڑنا شروع کیا' جدھر کار گئی تھی لیکن یہ لاحاصل تھا۔ کیونکہ کار اس وقت تک سو گز دور جا چکی تھی۔ آگے اس نے ایک اور ٹارچ چمکتی دیکھی' کسی کو چلاتے سنا پھر ایسی آواز آئی' جیسے کار کسی سے ٹکرائی ہو۔ انجن کی آواز ایک لمحے کو رکی... اور پھر کار کی رفتار بڑھتی گئی۔

اینڈریو بھاگتا رہا۔ اسے اپنی طبیعت بگڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک پر اسے سارجنٹ کرافٹ پڑا نظر آیا۔ وہ تقریباً" اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک نظر ڈالنا ہی کافی تھا۔ کار سارجنٹ کے اوپر سے گزر گئی تھی!

اینڈریو گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خود پر جبر کر کے ٹارچ کی روشنی میں معائنہ کرتا رہا۔ کار کے گزر جانے کے بعد گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ سارجنٹ کرافٹ دم توڑتی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اینڈریو نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیے۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ سارجنٹ کرافٹ مسلسل اپنی بیوی کا نام دہرا رہا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد وہ آواز رک گئی۔

☆ ☆ ☆

تین دن ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں نیلے رنگ کے آسمان کے نیچے لندن تپتا رہا تھا۔ تھرمامیٹرز میں پارہ بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اس دوران سارجنٹ کرافٹ کے اپنے اسٹیشن کے علاوہ' ایکس ڈویژن اور میٹروپولیٹن پولیس کے دیگر حلقے ان تھک کام کرتے رہے تھے لیکن پیٹریلا کا خیال تھا کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔ پرانے فیشن کی ایک بڑی کار نے ایک پولیس افسر کو کچل دیا تھا' جس نے اس کار کو روکنے کی کوشش کی تھی اور وہ کار بہت تیز رفتار تھی اور اس کی ہیڈلائٹس بھی روشن نہیں تھیں۔ لہٰذا یہ اندازہ لگانا فطری تھا کہ وہ کار مجرموں کے استعمال میں تھی اور جرم یا تو کیا جا چکا تھا یا اسی وقت کیا جانے والا تھا۔ اس کے علاوہ اب تک اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

تیسری شام سپرنٹنڈنٹ بنجمن نے بریک پر پاؤں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پیٹریلا سے کہا۔ "میں تمہارے محسوسات سے واقف ہوں' مجھے ہمدردی ہے لیکن جتنی رفتار تم دکھا رہے ہو اور جتنی بھاگ دوڑ ہو رہی ہے' اس سے تم اسے حل نہیں کر سکو گے۔ اس مشن کو اپنے طور پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔

مجرم چین سے کبھی نہیں بیٹھتے۔ جلد ہی وہ خود تمہیں سراغ فراہم کریں گے۔"

پیٹریلا ہچکچانے کے باوجود مان گیا۔ وہ گھر چلا گیا اور بارہ گھنٹے تک سوتا رہا۔

اگلی صبح اس نے معمول کے مسائل کی طرف توجہ کی جن کا گزشتہ تین دن میں ڈھیر لگ گیا تھا۔ کیونکہ اس عرصے میں کرافٹ کے قاتل کی ناکام تلاش کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ دکانوں میں چوری کی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ لوور کٹ کے ایک میلے میں غنڈہ گردی ہوئی تھی اور ایٹن روڈ پر ڈکیتی کی ایک واردات۔۔۔

"نمبر سات ایٹن روڈ۔" سارجنٹ بلنگ نے بتایا۔ "یہ دکان ہے، جس کے اوپر مکان ہے، مالک چھٹی منانے گیا ہوا ہے۔ اس کا منیجر ہفتے میں دو بار دیکھ بھال کے لیے آتا ہے۔ اس نے کچھ ہی دیر پہلے رپورٹ کی ہے۔"

"پچھلی بار وہ دکان میں کب آیا تھا؟" پیٹریلا نے پوچھا۔

"چار دن پہلے۔"

"چرایا کیا گیا ہے؟"

"وہ لوگ تجوری ہی اٹھا کر لے گئے۔ منیجر کا کہنا ہے کہ اس میں تین مہینے کی آمدنی تھی۔ حتمی گرز تو مالک ہی آکر بتائے گا۔ ڈاکوؤں نے پہلے تو تجوری کھولنے کی کوشش کی، نہیں کھلی تو وہ تجوری ہی لے بھاگے اور وہاں۔۔۔ چوری کی کار کی ایک اور رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ یہ کار چوری کا تین دن میں تیسرا کیس ہے۔ ایک چوری کی کار کامن کی جنوبی سائیڈ میں ایک اندھیری گلی میں کھڑی ملی۔ وہ دو ہفتے پہلے جیرارڈ اسٹریٹ سے چرائی گئی تھی۔"

پیٹریلا نے کہا۔ "اینڈریو کو اس کار کو چیک کرنے کے لیے بھیجیں گے۔ اس جوان آدمی کو جتنا کام دیا جائے، اس کے لیے بہتر ہے۔" اس نے سوچا۔ "اینڈریو ایک اور مسئلہ ہے۔ سارجنٹ کرافٹ کے قتل کی رات سے وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اداس ہو یا کام کرتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔ بس وہ خاموش اور چڑچڑا ہو رہا تھا۔ لگتا تھا، اپنے ہی کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔

"اس نے اس واقعے کو مسئلہ بنا لیا ہے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔ "حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ کار اگر اکیلے کرافٹ کو کچلنے کے بجائے اینڈریو کو بھی کچل دیتی تو صورت حال کچھ بہتر تو نہیں ہو جاتی۔"

"بالکل نہیں۔ تم ایسا کرو، اسے اس کار کی چیکنگ کے لیے بھیج دو۔ ہم جا کر ایٹن روڈ والے کیس کو چیک کرتے ہیں۔ وہ پروفیشنلز کا کام معلوم ہوتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

اینڈریو نے بازیاب شدہ کار کا جائزہ لیا۔ وہ بیس سال پرانی ہنٹلے تھی۔ پرانی ہونے کے باوجود وہ بہت اچھی حالت میں تھی۔ سیٹ کور بہت صفائی سے چڑھائے گئے تھے۔ پیٹرول کا ٹینک فل تھا۔ اگر اس کا نمبر چیک نہ کر لیا ہوتا تو وہ بلاشبہ مہینوں اس اندھی گلی میں کھڑی رہتی۔ لندن کے لوگ ایسے ہی ہیں۔۔۔ دوسروں کے معاملات میں تجسس نہ کرنے والے۔

اینڈریو نے کار کے سیٹ کور زہٹائے پھر اس نے سیٹوں کی اور نیچے فرش کی اچھی طرح سے تلاشی لی۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ ٹول کٹ میں اسے انسپکشن لیمپ نظر آیا۔ اس نے اسے لگا کر دیکھا۔ کار کی بیٹری فل پاور میں تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ کار کو اس گلی میں کھڑے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔

لیمپ کی روشنی میں اسے دو ایک چیزیں ایسی نظر آئیں جنہوں نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ عقبی سیٹ پر اور کار کے پچھلے فرش پر باریک برادے کی خاصی مقدار موجود تھی۔ وہ بہت باریک اور خشک برادہ تھا۔ اس نے سوچا، کسی سخت لکڑی۔۔۔ مثلاً "مہاگنی یا ٹیک کا برادہ لگتا ہے۔ کار کے دروازے پر خاصا گہرا کھرونچا تھا۔۔۔ اچھا خاصا ڈینٹ کہہ لیں اور اس کے اندر گلوس پینٹ کے کچھ ذرے موجود تھے۔ ایسا پینٹ عام طور پر الماریاں بنانے والے استعمال کرتے ہیں۔

اس نے شفاف لفافوں میں برادے اور پینٹ کے نمونے رکھ لیے۔

اس کے بعد اس نے ٹائروں کا معائنہ کیا۔ وہاں اسے ایک ایسی چیز نظر آئی جو واضح طور پر سمجھ میں آنے والی تھی۔ ٹائر کے ڈیزائن کی درزوں میں باریک' زرد بجریلے کنکر اندر تک اترے ہوئے تھے۔ ڈرائیو وے میں جو بجریلے کنکر بچھائے جاتے ہیں' وہ ویسے ہی تھے۔ اینڈریو نے ان کا بھی نمونہ رکھ لیا۔

"یہ کار کسی ایسے ڈرائیو وے میں کھڑی رہی ہے جہاں حال ہی میں بجریلے کنکر بچھائے گئے ہیں۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اور یہ کار اس ڈرائیو وے میں ایک سے زائد مرتبہ لائی اور لے جائی گئی ہے۔"

وہ دور کھڑا ہو رہا تھا کہ اسے ایک اور چیز نظر آئی۔ کار کا سائیڈ مرر ندارد تھا۔ اس نے قریب جا کر معائنہ کیا۔ جہاں ایک ہاتھ سا آئینے کو پکڑے ہوتا ہے' آئینہ وہیں سے ٹوٹا ہوا تھا۔

یہاں تک اینڈریو کا رویہ ایک اچھے پولیس افسر کا رویہ تھا۔ وہ وقتی ہیجان اور ذہنی انتشار میں اس مرر کی کرچیوں کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا' جس نے اس کے رخسار پر خراشیں ڈالی تھیں تو اس میں شکایت کی کوئی بات نہیں تھی' مگر اب وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' اس کے لیے اس کے پاس کوئی عذر لنگ بھی نہیں تھا۔

سراغرسانی سے متعلق کسی بھی فورس کے لیے پہلا... اور کبھی کبھی آخری اصول یہ ہوتا ہے کہ معلومات آپس میں بانٹی جاتی ہیں۔ اینڈریو نے اس اصول کو نظرانداز کر دیا جن وجوہات کے تحت انہوں نے ایسا کیا' ان کی لفظوں میں وضاحت بہت دشوار ہے۔ اب اینڈریو کسی کو کیسے بتاتا کہ اس نے خود پر اپنے ضمیر کی عدالت میں مقدمہ چلایا... اور خود کو مجرم پایا۔ اس نے جان لیا کہ سارجنٹ کرافٹ کو نہیں' مرنا اسے چاہیے تھا۔ بینائی چھین لینے والے اس لمحے میں اگر اس نے اپنی مردانگی نہ کھوئی ہوتی تو کرافٹ کے بجائے وہ مرتا۔ اب اس مردانگی کو واپس لانے کی ایک ہی صورت تھی۔ کرافٹ کے قاتلوں کی گرفتاری! اور عام گرفتاری نہیں... انہیں صرف اس کے ہاتھوں گرفتار ہونا تھا۔

اس اندھی گلی کے سناٹے میں کار کے پاس کھڑا اینڈریو دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا رخ کیا۔ وہاں وہ اپنے دوست سراغ رساں بیسٹ سے ملا۔ دونوں ایک ساتھ بھرتی ہوئے تھے۔ اب بیسٹ لیبارٹری میں تھا۔ اینڈریو نے اسے تین شفاف لفافے دیے۔ "تم انہیں جلدی سے چیک کر دو۔" اس نے بیسٹ سے کہا۔ "ان میں ایک تو میرے خیال میں برادہ ہے' لیکن میں یقینی طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ دوسرا پینٹ ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پینٹ کس قسم کا ہے۔ تیسرے لفافے میں باریک کنکر ہیں۔ ان میں الجھن والی کوئی بات بظاہر نہیں ہے۔"

"کہاں سے اٹھا لائے ہو یہ کباڑا؟" بیسٹ نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ایک مسروقہ کار میں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چیک کر لوں گا۔ رزلٹ کہاں بھجواؤں؟"

"اگر کوئی کام کی بات ہو تو مجھے فون کر لینا یا گبریل اسٹریٹ اسٹیشن پر چند سطری پیغام بھجوا دینا۔"

"یہ گبریل اسٹریٹ کہاں ہے؟" بیسٹ نے پوچھا۔ اس کے خیال میں لندن تھیمز سے شروع ہو کر تھیمز پر ختم ہو جاتا تھا۔

اینڈریو نے اسے گبریل اسٹریٹ کا محل وقوع سمجھایا اور رخصت ہو گیا۔ وہ اب تک لنچ بھی نہیں کر سکا تھا اور ابھی کام بہت پڑا تھا... اور کام بھی ٹانگوں کی ورزش والا۔ سب سے پہلے وہ ایک تعمیراتی کمپنی کے دفتر گیا جو ٹون برج اسٹریٹ میں تھا۔

"باریک بجری؟" معمار نے کہا۔ "وہ اس علاقے میں زیادہ استعمال نہیں ہوتی۔"

"مگر مجھے چاہیے۔ میں کس سے ملوں اس سلسلے میں؟"

معمار نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے ایک فرم کا

نام بتایا۔ اینڈریو وہاں چلا گیا۔ انہوں نے اسے ایک اور فرم کی طرف دھکیل دیا۔ وہاں سے اسے تیسری فرم کا پتا دیا گیا۔ اس وقت تک ساڑھے تین بج چکے تھے اور گرمی نے اینڈریو کو بے حال کر دیا تھا۔

تیسری فرم سے اینڈریو کو ایک لیڈ ملی۔ انہیں یاد تھا کہ کوئی دو ماہ پہلے انہوں نے آرڈر پر زردباریک۔ بجری فراہم کی ہے۔ کسے؟ ایک کنٹریکٹر کو' جو کامن کے جنوبی سرے پر فلیٹس کا ایک بلاک تعمیر کر رہا تھا۔

یہ کلیو اینڈریو کی سوچ سے مطابقت رکھتا تھا۔ مجرموں نے تجوری وہاں پہنچائی ہوگی' جہاں وہ اس پرسکون سے کام کر سکیں پھر انہوں نے کار سے پیچھا چھڑایا ہوگا اور اندھی گلی میں کار چھوڑنے والے کو واپسی کا سفر پیدل کرنا پڑا ہوگا۔ اینڈریو جانتا تھا کہ تمام مجرم کاہل ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ پیدل نہیں چلنا چاہتے۔ اندھی گلی سے کامن کے اس مقام کا فاصلہ بمشکل آدھا میل ہوگا۔ یعنی بات بن رہی تھی۔

اینڈریو نے مذکورہ فلیٹس کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بجری بالکل ویسی ہی تھی۔ ایسی چمکیلی زرد رنگ کی بجری کوئی عام چیز نہیں۔ ہر جگہ نظر نہیں آتی۔ دھوکے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ فلیٹس کے عقب میں گیراج بنے تھے۔

اینڈریو نے پورٹر کو تلاش کیا اور اسے اپنا کارڈ دکھایا۔

یہاں پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ پورٹر کو پورا پورا یقین تھا کہ اسی طرح کی ہنٹلے گزشتہ دو مہینوں میں فلیٹ کے کسی گیراج میں بھی نہیں دیکھی گئی ہے۔ پورٹر اس اعتبار سے مستند آدمی تھا کہ کسی زمانے میں ایک مکینک کے ساتھ کام کر چکا تھا اور گاڑی کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔

"ہنٹلے دیکھی ہوتی تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔" پورٹر نے کہا۔ "یہاں تو بیشتر فیملی کاریں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور نازک ایسی کہ ٹک کر کھڑے ہو جاؤ تو ڈینٹ پڑ جائے۔ جنگ سے پہلے کی کاروں کی کیا بات ہے۔ اس میں تو اسٹیل استعمال ہوتا تھا۔ اسٹیل اور انجن بے مثال۔۔۔"

اینڈریو کی بے اطمینانی دیکھ کر اس نے چابیاں نکالیں اور ایک ایک گیراج کھول کر دکھایا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ہر گیراج میں چمچماتی' چھوٹی جدید کار کھڑی تھی۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سے کسی کے پاس دوسری کار نہیں ہوگی۔" پورٹر نے کہا۔ "لیکن وہ رکھی کہاں جائے گی۔ کھلے میں رکھی جاتی تو مجھے ضرور نظر آتی۔"

اینڈریو کو اس سے متفق ہونا پڑا پھر اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ فلیٹ مجرموں کے ایسے گینگ کے لیے ہر گز مناسب نہیں' جو کوئی تجوری لاکر وہاں سکون سے توڑنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اب جو صورت حال ہے' اس میں اسے کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اس نے پورٹر کو کسی حد تک صورت حال بتا دی۔

"یہ آپ مجھے پہلے بتا دیتے تو اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔" پورٹر نے کہا۔ "وہ ادھر ایک مکان ہے۔۔۔" اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ وہاں درختوں کے درمیان چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ "پرانے طرز کا اکیلا مکان' انہوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی اپنا ڈرائیو وے بنوایا تھا۔ بجری بھی اسی فرم سے لی تھی' جس سے ہم نے لی ہے۔ اب سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے۔ میں نے دیکھی تو نہیں لیکن بہت رات گئے ایک کار کی آواز سنتا رہا ہوں۔ وہ آپ کی مطلوبہ ہنٹلے ہو سکتی ہے اور وہیں آپ کے مطلوبہ لوگ ہوں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اینڈریو نے کہا۔

☆ ☆ ☆

انسپکٹر پیٹرلا نے بھی مصروف دن گزارا تھا۔ صبح کا ابتدائی وقت اس نے نمبر سات اٹن روڈ میں گزارا۔ دکان کے مالک سے اب تک رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ چینل آئی لینڈز میں ہوگا۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ معقول لوگوں

کی طرح وہ اپنی رقم بینک میں کیوں نہیں رکھ سکتا۔" پٹریلا نے کہا۔

"آج کل بینک بھی تو اتنے اچھے نہیں رہے۔" سارجنٹ بلنگ بولا۔

"لیکن اس سے تو بہتر ہیں۔" پٹریلا نے دیوار کے سوراخ کی طرف اشارہ کیا' جہاں نقب لگائی گئی تھی۔ اس سوراخ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ تجوری تین فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی رہی ہوگی۔

"خوب کام دکھایا ہے بدبختوں نے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد کرمنل ریکارڈ آفس والے بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔۔۔ لیکن مختلف انداز میں۔ "ایسے گروہ کم ہی ہیں جو تجوری بھی لے بھاگیں۔" ریکارڈ آفس کا سارجنٹ فلپس کہہ رہا تھا۔

"اس کے لیے منظم ہونا ضروری ہے۔ ٹرالیاں' جیک اور جانے کیا کیا۔ اگر وہ تجوری کو کاٹنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ساز و سامان تجوری تک لے جانا آسان ہوگا۔ نہ کہ تجوری کو سامان تک لے جانا۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں' سمجھ رہا ہوں۔" پٹریلا نے کہا۔ "لیکن یہ واردات میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔"

"ایک شخص ہے۔۔۔" سارجنٹ فلپس نے اپنے ریکارڈز کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کیا نام ہے اس کا۔۔۔ امریکی پولش ہے وہ۔۔۔ ہاں ڈوبروسکی۔" اس نے ایک کارڈ باہر کھینچ لیا۔ "خیال کیا جاتا ہے کہ جنوبی لندن اس کا میدان ہے۔ زیادہ تر دکانیں اس کا ہدف بنتی ہیں۔"

پٹریلا نے کارڈ لے کر پڑھا۔ "ہرمن ڈوبروسکی۔ فوج سے بھاگا۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ تین ماہ معاف کر دیے گئے۔ پولیس مین پر حملہ۔۔۔ چھ ماہ کی سزا۔۔۔" وہ کارکردگی اور نتائج کی ایک طویل فہرست تھی۔ کار چرانا۔۔۔ ڈکیتی۔۔۔ مار پیٹ۔۔۔ تشدد۔۔۔

تین یا چار افراد کا گروہ بتاتا ہے۔ تجوریوں کو اٹھا کر لے جانا اس کی اسپیشلی ہے۔ عمومی طریق کار یہ ہے کہ ایک بڑی کھلی کار چرائی جاتی ہے اور کسی واردات تک اسے چھپا کر رکھا جاتا ہے واردات کرتے ہی کار سے پیچھا چھڑا لیا جاتا ہے۔۔۔" ساتھ ہی سرخ روشنائی سے لکھا تھا۔ "ہمیشہ مسلح رہتا ہے۔"

"یہ تو تمام کڑیاں مل رہی ہیں۔" پٹریلا نے کہا۔ "کامن کے علاقے میں ایک کار ملی ہے۔ لگتا ہے' وہ اس واردات میں استعمال کی گئی ہوگی۔ بہت بہت شکریہ سارجنٹ۔"

"ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں جناب۔" سارجنٹ فلپس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

پٹریلا ڈوبروسکی کے لیے ہر طرح کے جال بچھانے میں مصروف ہو گیا۔ ایک ٹیلی ٹائپ پیغام کمپوز کیا جا رہا تھا۔ رابطے کیے جانے تھے۔۔۔

دوپہر کے وقت وہ رقعہ آیا۔ اس پر ڈی ٹیکٹو اینڈریو کا نام تھا لیکن رقعہ سرکاری لفافے میں تھا۔ اس پر پرائیویٹ بھی نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ سارجنٹ بلنگ نے اسے کھول لیا۔ رقعہ پڑھتے ہی وہ اسے لے کر انسپکٹر پٹریلا کی طرف لپکا۔ "میرا خیال ہے' اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ کچھ چیزوں کے بارے میں رپورٹ ہے' جو اینڈریو نے صبح اسکاٹ لینڈ یارڈ بھجوائی تھیں۔"

پٹریلا نے رقعہ پڑھا۔ "تمہیں اس بارے میں معلوم تھا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

"اینڈریو کہاں ہے؟"

"صبح وہ اس کار کا معائنہ کرنے کے لیے گیا تھا۔ تب سے اسے نہیں دیکھا ہے۔"

پٹریلا پھر رپورٹ پڑھنے لگا۔ بجری والا معاملہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ پینٹ کے ذروں نے اسے چونکا دیا۔ "ڈارک گرین۔۔۔ ایسا پینٹ' جو دھاتی سطح پر کیا گیا تھا! اور یہ کیا۔۔۔ برادہ؟ سخت لکڑی' ممکنہ طور پر ٹیک کا برادہ' جس میں خاصی مقدار۔۔۔ کس چیز کی ملائی گئی ہے؟"

"میں نے برادے میں پھٹکری کی قلموں کی آمیزش

کے بارے میں پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ آپ کو دکھانی چاہیے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

"اگر یہ رپورٹ ان چیزوں کے متعلق ہے جو اینڈریو کو مسروقہ کار میں ملی تھیں اور اگر اینڈریو اپنے طور پر اس کیس کے پیچھے پڑ گیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ جلد از جلد اینڈریو کو تلاش کر لیا جائے۔ جلدی کرو بلنگ۔" پیٹریلا نے وال کلاک کو دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ اینڈریو پانچ گھنٹے سے غائب تھا اور وہ کہیں بھی ہو سکتا تھا۔۔۔ اپنے ڈسٹرکٹ میں یا ڈسٹرکٹ سے باہر۔

"میں ایک کار عملے سمیت لے کر جا رہا ہوں۔" اس نے بلنگ کو بتایا۔ "کازوے سے کچھ اور عملہ پکڑو اور انہیں اسٹینڈ بائی رہنے کی ہدایت کرو۔ یہ بھی کہنا کہ وہ وائرلیس پر رابطہ رکھیں۔ تم یہاں کے پیغامات سنبھالتے رہو۔ تمام پولیس باکسز اور اسٹیشنوں سے رابطہ رکھنا اور پیغامات نوٹ کرنا۔"

☆ ☆ ☆

ایک مایوس کن گھنٹا گزر گیا!

وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک رینگتے رہے۔ ڈیوٹی آف کرنے والے ایک پولیس مین نے اینڈریو کو تین بجے دیکھا تھا۔ ایک اور پولیس مین نے چار بجے سے کچھ پہلے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس کے آگے اینڈریو کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سڑکوں پر چلتے چلتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔

دوسری کار وقفے وقفے سے وائرلیس پر رابطہ کرتی رہی لیکن پیٹریلا کے پاس کوئی اطلاع ہی نہیں تھی کہ وہ انہیں کسی ایکشن کی ہدایت دیتا۔ سوا چار بجے اس نے اپنے ڈرائیور کو گیریل اسٹریٹ واپس چلنے کی ہدایت دی۔

سارجنٹ بلنگ کے پاس ٹیلی فون پر موصول ہونے والے پیغامات کا انبار لگا تھا لیکن اس میں کام کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ "لگتا ہے کہ اینڈریو پیدل چلنے کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے چکر میں ہے۔" بلنگ نے پیٹریلا کو بتایا۔ "لیکن یہ تمام اطلاعات تین بجے سے پہلے کی ہیں اور اب تو اندھیرا ہو رہا ہے۔"

"طوفان کی آمد آمد ہے۔" پیٹریلا نے کہا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون کے سب سے قریب پیٹریلا ہی تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"میں کامن سے گرووز بول رہا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ تم نوجوان اینڈریو کو تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ تمہیں وہ ملا تھا کہیں؟"

"نہیں لیکن ہمارے ایک آدمی کی جنوبی علاقے میں جو نئے فلیٹ بنے ہیں، اس کے پورٹر سے بات ہوئی ہے۔۔۔"

سارجنٹ بلنگ ٹیلی فون کی کھرکھراہٹ سنتے ہوئے سوچتا رہا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا ہو گا پھر اس نے اچانک پیٹریلا کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

"شکریہ۔" پیٹریلا نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ان نئے فلیٹس کے پیچھے ایک پرانے طرز کا بڑا مکان۔ ہم ابھی دیکھتے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے بلنگ تنہا تھا۔ باہر سے اسے ایک دروازہ بند ہونے کی اور پھر دو گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

☆ ☆ ☆

اینڈریو نے اس مکان کے دروازے پر چند لمحے توقف کیا۔ وہ مکان کیا، اچھی خاصی حویلی تھی۔ کسی زمانے میں عظیم الشان کہلاتا ہو گا لیکن اب وہ رنگ و روغن سے محروم تھا۔ مرمت کی ضرورت بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

مکان کا باغیچہ حیرت انگیز طور اچھے حال میں تھا۔ ڈرائیو وے حال ہی میں بنایا گیا تھا لہٰذا چمک رہا تھا۔ وہاں زرد چمکیلی بجری استعمال کی گئی تھی۔ اینڈریو کو ڈرائیو وے میں ٹائروں کے نشانات نظر آئے تھے۔ کوئی بھاری گاڑی حال ہی میں اندر بھی آئی تھی اور باہر بھی گئی تھی۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ اینڈریو نے حیرت سے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے چار بجے تھے

لیکن آسمان پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ سناٹا اس قدر گہرا تھا کہ سو گز دور فلیٹس میں چلنے والی لفٹس کی گھرگھراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ سڑک پر ایک سائیکل سوار کھنکارا تھا۔

اینڈریو نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

دروازہ ایک موٹے آدمی نے کھولا' جو اوور آل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں ایسی پھرتی دکھائی تھی کہ لگتا تھا' وہ ایک ہاتھ کنڈی پر رکھے کسی کی آمد کا منتظر رہا ہوگا۔

اینڈریو نے اپنا تعارف کرایا۔

"آیئے۔ تشریف لایئے۔" موٹے نے اندر ہال کے اس طرف ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا پھر خود اس کی طرف بڑھ گیا اور اسے آدھا کھول دیا۔

اینڈریو وہاں پہنچا تو عقب سے کسی نے اس کے کندھوں کے درمیان وار کیا۔ اینڈریو آگے کی طرف گرا اور دروازے کے کنارے سے ٹکرایا۔ جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ اینڈریو اندر گرا۔ وہ ایک کمرا تھا۔

وہاں دو آدمی موجود تھے' جو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "تم ہمیشہ سر کی ٹکر سے دروازہ کھولتے ہو؟" ان میں جو بھاری بھرکم تھا' اس نے پوچھا۔

"یہ بکے سر والا لونڈا ڈی ٹیکٹو ہے۔" دوسرا بولا۔ اس کے سر کے بال سفید اور رخسار گلابی تھے۔

اینڈریو نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب ستارے ناچ رہے تھے۔

"اب سناڈالو جلدی سے۔" بھاری بھرکم آدمی نے کہا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ لہجہ امریکیوں کا سا تھا۔

اینڈریو اب جھٹکے سے سنبھل رہا تھا۔ کمرے کے افتادہ گوشے میں اسے ایک تجوری رکھی نظر آئی۔ تجوری دیوار سے لگی رکھی تھی۔ اس کا پٹ اکھاڑ دیا گیا تھا۔ "مجھے تم سے کچھ سوالات پوچھنے ہیں۔" اینڈریو نے پروقار لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں تمہارے موزے اتار کر تمہارے منہ میں ٹھونس دوں تو کیا ہوگا؟"

"میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو پھر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اینڈریو نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"ایسی کوشش نہ کرنا۔ ہاں' اپنے لیے ایک اور پیٹ بنوانا چاہتے ہو تو کرلو۔" بھاری بھرکم آدمی کا داہنا ہاتھ تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب میں گیا۔ باہر آیا تو اس میں ریوالور موجود تھا۔

اینڈریو اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

"ہاں... یہ ٹھیک ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اوور آل والے موٹے نے کہا۔ "اب اس کا کیا کریں گے ہم؟"

اینڈریو کو احساس ہوا کہ وہ نقل مکانی میں مخل ہوا ہے۔ وہاں شیلف اور الماریاں خالی تھیں۔ دروازے کے پاس تین بڑے سوٹ کیس رکھے تھے۔

"ایک پیکنگ کیس اوپر بھی ہے۔ اسے نیچے لے آؤ۔" بھاری بھرکم آدمی نے کہا۔

"اور ایک ہتھوڑا؟"

"اور چار انچ کی کیلیں۔ ہم اس لڑکے کو باندھیں گے' پیک کریں گے اور مال گاڑی کے ذریعے اسکاٹ لینڈ یارڈ بھجوا دیں گے۔ انہیں یقیناً خوشگوار حیرت ہوگی۔"

اینڈریو اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا سراغرسانی کا کیریر' جو کچھ دیر پہلے بہت تابناک نظر آرہا تھا' اب قریب الختم ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر اس بار بھی خود کو صورت حال کے سپرد کردیا تو آئندہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکے گا اور اگر...

ریوالور بردار شخص دو گز دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس پر چھلانگ لگانے میں بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ریوالور والا ہاتھ اٹھا۔ دو دھماکوں کی بازگشت آپس میں گھل مل گئی۔ ایک دھماکا کمرے کے اندر ہوا تھا مگر اس کی آواز کو باہر کے دھماکے نے نگل لیا تھا اور باہر کا دھماکا طوفان کا تھا۔ طوفان اچانک یوں پھٹ پڑا تھا' جیسے آسمان نیچے گر پڑا ہو۔ بارش کی بوچھاڑ ایسی تھی کہ

الاماں۔۔۔
یا تو طوفان کی دہاڑ نے اس کے نشانے کو اپ سیٹ کردیا تھا یا پھر اینڈریو کے احمقانہ اور ناقابل یقین اقدام نے اسے حیران کردیا تھا۔ بہر حال اہمیت اس بات کی تھی کہ نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ نیچا اور سیدھا نشانہ لینے کے بجائے ڈوبروسکی نے اونچا اور بائیں جانب شوٹ کیا تھا۔
تاہم اس نے اینڈریو کو مس نہیں کیا۔ اتنے سے فاصلے سے مس کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن گولی پیٹ میں یا سینے میں لگنے کے بجائے اینڈریو کی ہنسلی کی ہڈی کے نیچے لگی اور کندھے سے باہر نکل گئی۔ اس سے اینڈریو کا داہنا ہاتھ بے کار ہوگیا لیکن وہ گولی مارنا تو کجا، اینڈریو کو روک بھی نہ سکی۔ اینڈریو نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دشمن کی گردن میں لاک لگایا۔ پھر وہ گرتا چلا گیا۔ ڈوبروسکی کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ سعادت مندی سے گرے ورنہ اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔
سفید بالوں والے آدمی کے پاس بھی ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور نکالا بھی۔۔۔ لیکن پھر اسے ریوالور ہٹانا پڑا۔ اینڈریو، ڈوبروسکی کے نیچے تھا۔ اور وہ دونوں ایک ہی کانٹے میں پھنسی دو مچھلیوں کی طرح فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ایسے میں گولی چلانا بے سود ہی ہوتا۔
پھر سفید بالوں والے نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اب یہ ضروری نہیں ہے۔ اس نے میز پر سے بوتل اٹھائی اور اینڈریو کے سر پر وار کرنے کے لیے بڑھا۔
پیڑیلا کی پارٹی ڈرائیو وے میں پہنچ تھی کہ طوفان نازل ہوگیا۔ گاڑیوں کی کھڑکیاں بند کرنے کا موقع نہیں تھا۔ آگے والی کار پوری رفتار سے ڈرائیو کی جاتی رہی۔ اسے عین دروازے کے سامنے روکا گیا۔ پیڑیلا اچھل کر کار سے اترا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن طوفانی بارش کے شور نے ہر آواز کو نگل لیا تھا۔ "دروازہ توڑ دو۔" اس نے کہا۔
اس کے ایک ماتحت نے کار سے چودہ پونڈ کا ہتھوڑا نکالا اور بڑی مہارت سے دروازے پر لاک کے عین نیچے مارا۔ دروازہ کھل گیا۔
سفید اوور آل پہنے ہوئے موٹے آدمی کی قسمت ہی خراب تھی کہ وہ دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ اندر داخل ہونے والے پہلے شخص نے اسے گرایا اور بعد والے اسے روندتے چلے گئے۔
سفید بالوں والے نے کھڑکی کے راستے بچ نکلنے کی کوشش کی اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔
جہاں تک ڈوبروسکی کا تعلق ہے، جب پیڑیلا نے اسے اینڈریو کی گردن توڑ آہنی گرفت سے نجات دلائی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔
"میں آپ کی توجہ۔۔۔" پیڑیلا بیٹھا ڈسٹرکٹ کے لیے سرکاری رپورٹ لکھ رہا تھا۔ عبوری ڈی ٹیکٹیو اینڈریو کی بے مثال جرات اور مستقل مزاجی کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ محض تجربے کی کمی کی وجہ سے وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ برادے میں ملی پھٹکی کی قلمیں پرانے طرز کی تجوریوں کو ایسے کھولنے میں استعمال ہوتی ہیں کہ آگ بھی نہ لگے اور پینٹ کے ذرے ڈارک گرین دھاتی سطح سے اکھڑے تھے۔ یوں یہ بات صاف ہوجاتی تھی کہ اس مسروقہ کار کا تعلق ایٹن روڈ کی ڈکیتی سے ہے۔
اگر ڈی ٹیکٹیو اینڈریو تجربہ کار ہوتا اور یہ بات سمجھ لیتا تو مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنے طور پر پورے معاملہ کو نمٹانے کی ہرگز کوشش نہ کی ہوتی۔ پیڑیلا لکھتے لکھتے رکا اور پین کا پچھلا حصہ چبانے لگا۔ باہر بارش کے بعد ہر چیز دھلی دھلی اور تروتازہ لگ رہی تھی۔
پیڑیلا کو رپورٹیں لکھنا بہت برا لگتا تھا۔
درحقیقت جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، وہ یہ تھا کہ پولیس کے کام میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے، وہ جرات اور حوصلہ ہی ہوتا ہے اور وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے خیال میں اینڈریو نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے، لیکن یہ تاثر منتقل کرنے کے لیے اسے دفتری خط و کتابت کے موجہ ذخیرہ الفاظ میں لفظ نہیں مل رہے تھے۔

✡ ✡

خود گم

نازی سلمان

ایک خاتون کا قضیہ اس کا اصرار تھا کہ اس کے گھر کے صحن میں لاش پڑی ہونی مگر پولیس سمیت کوئی اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان لمحوں کی روداد جب انسان اپنی ذات میں گم ہوجاتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے بطور خاص ایک تحفہ

مسز زینب عثمانی نے جب پہلے پہل اس لاش کو دیکھا' اس وقت ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ مسز عثمانی کا یہ روزانہ کا معمول تھا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ سب سے پہلے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے عقبی باغیچے میں جاتیں' جہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں مختلف سبزیاں اگائی ہوئی تھیں وہیں کیاریوں کے پاس کوٹھی کے پچھلے گیٹ سے چند قدم ادھر مسز عثمانی کی خود تیار کردہ قدرتی کھاد کا بڑا سا ڈھیر تھا۔

اس روز جب مسز عثمانی برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر پچھلے باغیچے میں آئیں تو انہوں نے بھورے اوور کوٹ میں ملبوس کسی شخص کو اسی کھاد کے ڈھیر پر پہلو کے بل' بلکہ تقریباً" اوندھا پڑے ہوئے دیکھا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی پہلے تو وہ سخت حیران ہوئیں کہ یہ اجنبی ان کے گھر میں داخل کیسے ہوگیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ یہ سوچ کر آگ بگولا ہوگئیں کہ اس شخص نے ان کی کئی مہینوں کی لگاتار محنت سے تیار ہوا کھاد کا ڈھیر برباد کرکے رکھ دیا ہوگا' بلکہ اس کے دونوں پیر' جو نیچے کیاری تک تک پہنچ رہے تھے' ان کی وجہ سے اس کیاری میں اگے ہوئے گوبھی کے کئی پودے بھی اکھڑ گئے ہوں گے۔

قدرتی کھاد کا یہ ڈھیر مسز عثمانی نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے تیار کیا تھا۔ اس کی تیاری میں انہوں نے اپنے پرانے مالی کے برسوں کے تجربات اور اپنی سہیلیوں اور پڑوسنوں کے قیمتی مشوروں کے علاوہ زراعت کے موضوع پر لکھی ہوئی متعدد کتابوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ کھاد کے اس ڈھیر کے مرکز میں' یعنی سب سے نیچے بھینسوں کا گوبر تھا' جس پر بڑے اہتمام سے بھیڑوں اور بکریوں کی ان گنت مینگنیوں کو سجایا گیا تھا اور یہ سب اشیا مسز عثمانی کے نوعمر ملازم اصغر علی نے نہ جانے کہاں کہاں سے مہیا کی تھیں۔ اس نادر و نایاب مواد پر مسز عثمانی نے مختلف کلی سڑی سبزیوں اور کئی طرح کے سوکھے پتوں کی تہیں جمائی تھیں۔ اگلے مرحلے میں اس ڈھیر پر بازار سے خریدے گئے کچھ خشک اور مائع کیمیکلز ڈالے گئے اور سب سے آخر میں اس پر پتلے کیچڑ کا چھڑکاؤ کیا گیا۔

کئی ہفتوں کے صبر آزما انتظار کے بعد اب یہ کھاد استعمال کے لیے تیار ہوچکی تھی۔ اس کا اندازہ دو تین روز پہلے مسز عثمانی کو اس وقت ہوا جب انہوں نے ایک لکڑی اس ڈھیر میں گھونپ کر دیکھی۔ وہ لکڑی بغیر کسی دقت کے اس ڈھیر کے اندر تک دھنستی چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی انتہائی ناگوار بدبو کا ایک شدید بھبکا باہر کی طرف لپکا تھا۔ پھر جب مسز عثمانی نے

لکڑی باہر نکالی تو اس کے اگلے سرے پر مختلف شکلوں اور رنگوں کے ان گنت کیڑے کلبلاتے ہوئے نظر آئے۔ یہ سب علامات اس بات کا ثبوت تھیں کہ کھاد مکمل طور پر تیار ہو چکی ہے۔ مسز عثمانی کو یقین تھا کہ یہ کھاد سبزیوں کی کیاریوں میں ڈالی گئی تو سبزیاں سائز میں بڑی اور بہت ذائقے دار ہو جائیں گی۔ اسی طرح پھولوں کی کیاریوں میں ڈالنے پر پھول زیادہ خوش رنگ اور زیادہ خوشبودار ہو جائیں گے۔

مگر اب یہ منحوس اجنبی کیسے مزے سے اس قیمتی کھاد پر محوِ خواب ہے، مسز عثمانی غصے میں بھنبھناتی ہوئی تیزی سے اس ڈھیر کے قریب گئیں۔ "اے مسٹر۔ کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے اپنی چھڑی اس شخص کے پہلو میں چبھوتے ہوئے کہا، مگر اس شخص کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

"ہائیں...؟ لگتا ہے بے ہوش ہو گیا ہے" مسز عثمانی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹیں اور بغور اس شخص کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے جسم پر بھورے رنگ کا اوور کوٹ تھا، جس کے نیچے اس نے چاکلیٹ کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے پیروں میں بھاری سیاہ بوٹ نظر آ رہے تھے۔ قریب سے دیکھنے پر مسز عثمانی کو پتا چلا کہ اس اجنبی نے بے ہوش ہونے سے پہلے ایک براؤن پی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔ جو اب اس کے سر کے بجائے چند انچ پرے کھاد کے ڈھیر پر پڑی ہوئی تھی۔"

اس شخص کو دیکھتے ہوئے مسز عثمانی کو برسوں پہلے دیکھی ہوئی ایک انگلش فلم یاد آ گئی۔ اس فلم کا ہیرو ایک بھگوڑا فوجی ہوتا ہے جو کسی وجہ سے اپنے یونٹ

سے فرار ہو کر شہر میں آجاتا ہے اور اسی طرح کسی دولت مند کے بنگلے کی بیرونی دیوار پھلانگ کر اس کے لان میں آکر سو جاتا ہے۔ اس بھگوڑے فوجی نے بھی ایسا ہی بھورے رنگ کا اوور کوٹ اور براؤن پی کیپ پہن رکھی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ فلم میں وہ گھاس کے ڈھیر پر نہیں، بلکہ لان میں پڑے ہوئے ایک بینچ پر سو رہا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم میں جب بنگلے کے مالک کی بیٹی، یعنی ہیروئن آکر ہیرو کو جگاتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے، جبکہ یہ شخص تو بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"مگر یہ فلم نہیں ہے۔" مسز عثمانی کو اچانک احساس ہوا۔ اس کے علاوہ یہ شخص ہیرو بھی نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کوئی چور یا ڈاکو وغیرہ ہو۔ مسز عثمانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں، پہلے اندر جاکر اپنے شوہر کو اطلاع دیں یا اس اجنبی کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں۔ چند لمحوں تک وہ اسی کشمکش میں رہیں۔ اس دوران اجالا پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ آخر مسز عثمانی نے اپنے آپ کو ہمت دلائی اور وہ آگے بڑھیں اور جھک کر قریب سے اس اجنبی کا جائزہ لینے لگیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مسز عثمانی پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ شخص بے ہوش نہیں ہے..... بلکہ مر چکا ہے۔

اس شخص کی گردن، ٹھوڑی اور اوور کوٹ کے بالائی حصوں پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔ خون جو جم چکا تھا اور سیاہ ہو چکا تھا۔ پہلے پہل تو مسز عثمانی یہ سمجھیں کہ کسی نے اس کا گلا کسی تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہے، مگر قریب سے اور زیادہ غور سے دیکھنے پر انہیں اس شخص کی گردن اور شہ رگ پر کئی گہرے سوراخ نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاتل نے کسی تیز اور نوکیلے ہتھیار سے پے در پے وار کر کے اس شخص کو ہلاک کیا ہے۔

مسز عثمانی کو دوسری مرتبہ گھبرا کر پیچھے ہٹنا پڑا، مگر یہ گھبراہٹ جلد ہی ایک گہرے صدمے اور رنج میں بدل گئی۔ معلوم نہیں یہ بدنصیب کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس کے گھر والے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں یہ بے چارہ یہاں مرا پڑا ہے۔ دکھ کی شدت سے مسز عثمانی کا دل بھر آیا، آنکھیں نم ہو گئیں اور گلا رندھ گیا۔

"مگر اس بے چارے کو مارا کس نے اور کیوں؟؟"

تجسس کی ایک تیز اور قوی لہر نے مسز عثمانی کے دل سے رنج اور صدمے کے احساس کو محو کر دیا اور برس ہا برس سے ان کے وجود میں چھپا ہوا سراغرساں جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ مسز عثمانی ہمیشہ سے جرم و سزا کی کہانیوں اور جاسوسی ناولوں کی دلدادہ رہی تھیں۔ اسکول کے دنوں میں ابن صفی کی حمیدی فریدی سیریز اور عمران سیریز ان کی پسندیدہ کتابیں رہیں۔ کالج میں پہنچیں تو آرتھر کانن ڈائل کا شرلاک ہومز ان کا ہیرو بن گیا۔ پھر جوانی اور ادھیڑ عمری سے لے کر اب تک اگاتھا کرسٹی ان کی محبوب مصنفہ تھیں۔

یہ ان کا بے پایاں شوق اور ان کا وسیع مطالعہ ہی تھا، جس کے باعث انہوں نے اس لاش کے سرسری جائزے سے ہی کئی باتوں کا ادراک کر لیا۔ **مثلاً** "یہ کہ اس واردات کو چند گھنٹوں سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور یہ کہ قاتل ابھی بہت زیادہ دور نہیں جا سکا ہوگا اور..... اور یہ بھی کہ اس قسم کے قاتل کسی بھی شخص پر، کسی بھی لمحے دوبارہ بھی وار کر سکتے ہیں۔

یہ آخری انکشاف کسی بھی عام شخص کو خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا، مگر مسز عثمانی کوئی "عام" ہستی ہرگز نہیں تھیں۔ وہ ایک بہادر اور نڈر خاتون تھیں۔ اس لمحے وہ رتی برابر بھی خوف محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ اس کے بجائے کسی بھی قانون پسند شہری کی طرح اس وقت ان کی تمام سوچیں اس ایک نکتے پر مرکوز تھیں کہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فی الفور قاتل کا سراغ لگائے گا اور اس کی تلاش کا کام شروع کیا جانا چاہیے اور جلد سے جلد اسے نہ صرف گرفتار کرانا، بلکہ کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے۔

مسز عثمانی کو رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اس شخص کے جسم کا اور لباس کا تفصیلی جائزہ لینے پر مزید کئی قیمتی

معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، مگر ایک تو انہیں ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس کے علاوہ وہ اس لاش کو چھونے سے گھبرا رہی تھیں۔ یا یوں سمجھئے کہ کراہیت محسوس کر رہی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ سب سے پہلے انہیں اپنے شوہر کو اس لاش کے بارے میں اور اس بھیانک واردات کے بارے میں بتانا چاہیے۔

فیصلہ کرتے ہی مسز عثمانی تیز قدموں سے واپس کوٹھی کے رہائشی حصے کی جانب چل دیں۔ برآمدے میں پہنچنے تک انہوں نے بلا مبالغہ آٹھ دس مرتبہ پلٹ کر کھاد کے ڈھیر کی جانب اور اس پر بے حس و حرکت پڑی لاش کو دیکھا۔ نہ جانے کیوں انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ جب وہ اپنے شوہر کو لے کر دوبارہ اس جگہ پہنچیں گی تو وہاں کچھ بھی نہ ہوگا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ اس قسم کی شرمندگی سے دوچار ہو چکی تھیں۔ "مگر اس بار ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" انہوں نے خود کو یقین دلایا۔ "یہ لاش سو فیصد حقیقی ہے۔"

"اسرار۔۔۔ اسرار الحق کہاں ہو تم؟" مسز عثمانی نے برآمدے سے گزر کر کوریڈور میں آتے ہی اونچی آواز میں پکارنا شروع کر دیا۔ پہلی چند آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ مگر جب وہ خواب گاہ کے قریب پہنچیں تو کہیں سے ان کے شوہر کی ہلکی سی "ہوں" نے ان کی بے تابانہ پکار کی رسید دی۔

مسز عثمانی تیزی سے خواب گاہ میں داخل ہوئیں۔ فوری طور پر انہیں اپنا شوہر کہیں نظر نہ آسکا، مگر جب وہ چند قدم آگے بڑھیں تو اپنے شوہر کا پسندیدہ نائٹ گاؤن انہیں کپڑوں کی الماری کے ادھ کھلے پٹ کے پیچھے جھکا ہوا دکھائی دیا۔

"اسرار۔۔۔ اسرار۔۔۔ وہاں اپنے لان میں، کھاد کے ڈھیر کے اوپر ایک آدمی پر پڑا ہوا ہے۔" مسز عثمانی نے تیز اور جوشیلے انداز سے کہا۔

"اچھا ڈیر!" چند سیکنڈ کے توقف کے بعد اس اوور سائز نائٹ گاؤن کے اندر کہیں سے ان کے شوہر کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ متحرک نائٹ گاؤن الماری میں پہلے سے موجود کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے اپنے آپ کو دفن کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔

"وہ آدمی مر چکا ہے۔" مسز عثمانی نے نائٹ گاؤن کے قریب جا کر قدرے اونچی اور واضح آواز میں انکشاف کیا۔

اس مرتبہ وہ نائٹ گاؤن سیدھا ہوا۔ مسز عثمانی نے اپنے دل کی ناقابل برداشت بے تابی کو دباتے ہوئے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر اس چہرے پر جھنجلاہٹ تھی اور کسی قدر غصہ بھی۔ "میری ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ کہاں ہے؟" انہوں نے اپنے شوہر کو کہتے ہوئے سنا۔ "اور میری وہ ڈارک گرے ٹائی بھی نہیں مل رہی، وہ جو میں دبئی سے لایا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر مجھے دفتر پہنچنا ہے۔"

"اسرار، تم نے شاید میری بات سنی ہی نہیں۔" مسز عثمانی نے بے تابانہ انداز سے کہا۔ "ادھر ہمارے لان میں ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی نے تیز اور نوکیلے ہتھیار سے اسے ہلاک کیا ہے۔ اسرار ہمیں جلد کچھ نہ کچھ کرنا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔" اسرار نے اپنی بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کرنا یہ چاہیے کہ جلد سے جلد ایک کپ چائے بنواؤ، پھر دو گولی ڈسپرین کھانے کے بعد اوپر سے گرما گرم چائے کا ایک کپ پیو۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولا۔ "آج پھر وہی کل والا میلا اور شکن آلود سوٹ پہن کر جانا پڑے گا۔ استری کرنے کا بھی وقت نہیں ہے۔"

مسز عثمانی جھنجلا کر رہ گئیں۔ "ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اپنے شوہر کی صورت حال کی سنگینی کا احساس دلائیں۔ "اسرار!" انہوں نے تشویش انگیز لہجے میں پکار کر کہا۔ "تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔ ہمیں جلد سے جلد پولیس سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ شعبہ قتل سے۔"

اسرار الحق عثمانی کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ مگر بیوی کی پکار سن کر ان کا سر دوبارہ دروازے کی اوٹ سے

نمودار ہوا۔ اور بولا۔ ”میرا خیال ہے، تمہارے ماہر نفسیات نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ تمہارے شدید سردرد کے دورے تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں یا نہ پہنچائیں، مجھے ایک روز بستر پر ضرور ڈال دیں گے۔“

مسز عثمانی نے فرط غضب سے اپنا پیر زور سے فرش پر مارا اور چلائیں۔ ”اسرار، تم یقین کیوں نہیں کرتے۔ یہ میرے سردرد کا معاملہ....“ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ وہاں ان کی بات سننے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔

✡ ✡ ✡

کچھ دیر کے بعد جب مسز عثمانی اپنے کپڑوں کی الماری کے سامنے کھڑی باہر جانے کے لیے لباس منتخب کر رہی تھیں۔ غصہ اور جھنجلاہٹ اس وقت بھی ان کے مزاج، بلکہ ان کے سارے وجود پہ طاری تھا گو اس کی شدت اب خاصی کم ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنا کریم کلر کا سوٹ نکالا اور پھر اس سے میچ کرتی ہوئی ڈارک میرون رنگ کی جرسی، مگر پھر کچھ سوچ کر انہوں نے جرسی دوبارہ الماری میں رکھ دی اور اور فر کے کالروں والا براؤن کوٹ نکال لیا۔ اس انتخاب کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باہر سردی کافی شدید تھی۔ اس کے علاوہ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ کوٹ زیادہ بارعب اور متاثر کن ہوگا۔

فر کے کالروں والا یہ کوٹ دو برس پہلے ان کی بڑی بہن کا بیٹا شاہد ناروے سے لایا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کے کالر خالص خرگوش کی کھال کے بنے ہوئے ہیں۔ کوٹ پہن کر انہوں نے آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل کی سب سے نچلی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا ہینڈل والا محدب عدسہ نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شاید اس لیے کہ قتل کی تفتیش کا معاملہ تھا اور انہوں نے اکثر جاسوسی فلموں میں سراغرسانوں کو محدب عدسہ استعمال کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا خبر آج کسی وقت اس کی ضرورت پیش آجائے۔

آخری مرتبہ آئینے کے سامنے انہوں نے اپنا جائزہ لیا، پھر مطمئن ہو کر کمرے سے باہر آگئیں۔ سکینہ، ان کی ملازمہ شاید کچن میں مصروف تھی۔ انہوں نے آواز دے کر اسے طلب کیا۔ اسے بتایا کہ میں پولیس اسٹیشن جا رہی ہوں اور پھر گھر سے باہر نکل آئیں۔

جلدی ہی انہیں ٹیکسی مل گئی۔ انہوں نے ڈرائیور کو پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دل ہی دل میں ریہرسل کرنے لگیں کہ پولیس اسٹیشن جا کر انہیں کیا کیا کہنا ہوگا۔

ٹیکسی نے ابھی بمشکل آدھا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک مسز عثمانی کو خیال آیا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن زیب النسا کے گھر کے بالکل قریب ہیں۔ اسے اس اہم واقعے کی اطلاع دینا بھی بہت ضروری تھا۔ انہوں نے ڈرائیور کا شانہ تھپک کر اسے اپنے ارادے کی تبدیلی سے آگاہ کیا۔

ٹیکسی اگلے چوراہے کے گرد گھوم کر دائیں جانب والی سڑک پر آگئی اور مسز عثمانی کی بہن کے گھر کی جانب رواں ہو گئی۔

زیب النسا گھر پر ہی تھیں۔ مسز عثمانی نے آج صبح جو کچھ دیکھا تھا اس کی سنسنی خیز تفصیلات سے ان کا سینہ اس حد تک بھر چکا تھا کہ پھٹنے کو تھا۔ انہوں نے مختصر ترین الفاظ اور تیز ترین لہجے میں ان ساری تفصیلات کو اپنی بہن کے گوش گزار کیا تو ان کے سینے کا بوجھ جیسے کم ہو گیا اور ان کی سانس کی آمد و رفت قدرے آسان ہو گئی۔

”تم نے دیکھا، زیبو کیا اندھیر مچا ہوا ہے۔“ مسز عثمانی نے داستان کے اختتام پر کہا۔ ”میں اسی لیے پولیس اسٹیشن جا رہی ہوں کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قاتل کی تلاش شروع ہو سکے اور وہ قانون کی گرفت میں لایا جا سکے۔“

زیب النسا جو داستان کے آغاز میں خاصے اشتیاق کا مظاہرہ کر رہی تھی، اب کسی قدر بے زار اور لاتعلق سی معلوم ہو رہی تھی۔ مسز عثمانی کے خاموش ہونے پر اس نے ایسا گہرا سانس لیا، جیسے بہت دور سے پیدل

چل کر آنے والا مسافر کہیں رک کر پہلا سانس لیتا ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک عجیب سی نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتی رہی' پھر اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔ "میں آپ کے لیے چائے بناؤں آپا۔ آپ کی طبیعت ذرا سنبھل جائے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" مسز عثمانی نے غصیلی نگاہوں سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ "ادھر گھر میں کھاد کے ڈھیر پر ایک آدمی پڑا ہے۔ میرا مطلب ہے ایک لاش پڑی ہے اور تمہیں چائے کی سوجھ رہی ہے۔ اری احمق' اس وقت سب سے اہم معاملہ شہادتوں کا ہے' چائے کا نہیں۔"

"شہادتیں؟" زیب النساء نے الجھن سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ "میں سمجھی نہیں آپا؟"

"تم کیا سمجھو گی۔ سدا کی بے وقوف ہو تم۔ اری احمق' شہادتیں ان علامتوں اور ان نشانیوں کو کہا جاتا ہے جن کی مدد سے کسی جرم کی تفتیش کی جاتی ہے۔ مثلاً" سب سے پہلے انگلیوں کے نشانات ڈھونڈے جاتے ہیں' پھر آلہ قتل تلاش کیا جاتا ہے۔ آس پڑوس کے لوگوں' ملازموں اور چوکیداروں وغیرہ کے بیانات لیے جاتے ہیں۔ قتل کا محرک جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر تم نے تو زندگی بھر ہنڈیا چولہے کے علاوہ نہ کچھ کیا' نہ دیکھا۔ تمہیں تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ قتل کی تفتیش میں جتنی تاخیر کی جائے اتنی ہی شہادتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر مسز عثمانی نے اپنے کوٹ کی جیب سے محدب عدسہ نکالا اور اپنی بہن کی ناک کے آگے سے نچاتے ہوئے بولیں۔ "تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ یہ کیا چیز ہے' یہ وہ آلہ ہے جس سے مقتول کے جسم اور اس کے آس پاس کی تمام اشیا کا اور جگہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔"

زیب النساء نے ناگواری سے منہ بناتے ہوئے فوراً" اپنا چہرہ پیچھے ہٹالیا۔ مسز عثمانی کے چہرے پر بھی کچھ کم ناگواری نہ تھی۔ انہوں نے عدسہ دوبارہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور کچھ روٹھے ہوئے سے انداز میں کرسی سے اٹھیں مگر زیب النساء نے فوراً" لپک کر ان کا بازو تھام لیا اور زبردستی دوبارہ کرسی پر بٹھادیا۔ "لے لو' آپ تو سچ مچ خفا ہو گئیں آپا۔ اتنے دنوں کے بعد تو آتی ہیں آپ چائے پلائے بنا تو جانے نہیں دوں گی اور ہاں آپا۔۔۔ رفعت کے ابو ابھی دفتر نہیں گئے' گاڑی میں کچھ خرابی تھی' اسے ٹھیک کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ آپ ان کے ساتھ چلی جانا۔ پولیس اسٹیشن اکیلی کہاں ماری ماری پھریں گی۔ اتنے میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔"

زیب النساء نے اتنا کہا اور اپنی بہن کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ دو ہی منٹ کے بعد وہ چائے کا کپ اٹھائے دوبارہ اسی کمرے میں آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی بچی ہوئی چائے گرم کر کے لے آئی ہیں۔

مسز عثمانی کے چہرے کی خفگی ابھی دور نہیں ہوئی تھی مگر انہوں نے چائے کا کپ لے لیا اور بظاہر بے دلی سے پینے لگیں۔ اس دوران زیب النساء ان کے پاس بیٹھی بغور ان کی صورت تکتی رہی پھر ذرا سا آگے جھک کر اس نے اپنی بہن کا گھٹنا تھپکا اور اپنائیت سے بولی۔ "آپ اپنے سائیکاٹرسٹ کے پاس تو باقاعدگی سے جا رہی ہیں ناں آپا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ پھر دوبارہ تو آپ کو وہ سر درد والا دورہ نہیں پڑا۔۔۔ آپ تو جانتی ہیں آپا' ہم لوگ میرا مطلب ہے' میں اور رفعت کے ابا آپ کی صحت کے بارے میں بہت فکرمند رہتے ہیں۔"

مسز عثمانی کے چہرے کی رنگت پہلے قرمزی ہوئی اور پھر راکھ جیسی ہو گئی۔ ان کے ہونٹ اس انداز میں لرزے' جیسے وہ کچھ کہنے والی ہیں مگر اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور زیب النساء کا شوہر ذکاالرحمٰن اندر آیا۔ اسے دیکھتے ہی مسز عثمانی کے چہرے کی رنگت اور تاثر دونوں بدل گئے۔ "اچھا ہوا ذکا تم آ گئے۔ اتنے سارے احمقوں میں ایک تم ہی ہو جو میری بات سمجھ سکتے ہو اور یقین کر سکتے ہو۔" انہوں نے ایک نئے جوش سے کہا۔

"سلام زینب آپا۔ کیسی ہیں آپ!" ذکاالرحمٰن

نے اپنی سالی کے قریب بچھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "خیریت تو ہے۔ کیا بات ہوگئی؟"

"پہلے یہ بتاؤ ذکی۔۔۔" مسز عثمانی نے اپنے بہنوئی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر اچانک تمہیں کہیں کوئی آہی پڑا ہو دکھائی دے اور قریب جانے پر تمہیں معلوم ہو کہ وہ آدمی زندہ نہیں ہے بلکہ ایک لاش ہے تو تم کیا کرو گے؟"

"کرنا کیا ہے آپا۔۔۔" ذکاالرحمٰن نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اور کسی قدر شریر سے لہجے میں کہا۔ "ایسی صورت میں ہم سب سے پہلے اس میت کے کفن دفن کا بندوبست کریں گے اور جیسے ہی یہ انتظام پورا ہوگا' اس اللہ کے بندے کو دفادی گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور آنکھ ماری۔ اس کا خیال تھا کہ مسز عثمانی نے اس کی یہ حرکت نہیں دیکھی ہوگی۔ مگر اس کا یہ خیال درست نہ تھا۔ مسز عثمانی کی تمام تر توجہ اس کے چہرے پر مرکوز تھی۔ وہ فوراً کرسی سے اٹھیں' چائے کی پیالی تپائی پر رکھی' بہ آوازِ بلند خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"آپا۔۔۔ ارے آپا۔۔۔ سنو تو۔۔۔" زیب النساء اور اس کا شوہر پکارتے رہ گئے مگر مسز عثمانی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ گھر سے نکلیں اور باہر سڑک پر آگئیں۔

مسز عثمانی تھانے کی عمارت میں داخل ہوئیں تو گیٹ پر متعین بندوق بردار نے خاصے مودب لہجے میں پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو بیگم صاحب!" مگر وہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے سیدھی اندر چلی گئیں۔

اندر پہنچنے پر سب سے پہلے جس اہلکار سے ان کا سامنا ہوا وہ ناشتے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک رجسٹر اور چند فائلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور ان کے اوپر ایک چھوٹا سا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ قریب پہنچنے پر مسز عثمانی نے دیکھا کہ اس دسترخوان پر ڈیڑھ تندوری روٹی اور آدھی کٹوری چکڑ چھولے کی پڑی تھیں۔ پولیس اہلکار کا منہ انہماک اور تندہی سے پیٹ پوجا میں مصروف تھا۔

مسز عثمانی نے اس کے قریب جاکر السلام علیکم کہا' مگر اس نے نہ تو سلام کا جواب دیا' اور نہ ہی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ مسز عثمانی چند سیکنڈ تو خاموش اور منتظر کھڑی رہیں' مگر پھر آگے جھکیں اور دسترخوان کے قریب میز کے کونے پر رکھی ہوئی گھنٹی زور سے بجادی۔

پولیس انسپکٹر نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ آخری لقمہ جسے وہ منہ میں ڈالنے ہی والا تھا' اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دوبارہ دسترخوان پر آگرا۔ "کیا مصیبت ہے' کون۔۔۔" وہ کوئی سخت بات کہنے والا تھا' مگر جب اس نے غور سے مسز عثمانی کو اور خاص طور پر ان کے امپورٹڈ کوٹ کو دیکھا تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور بدقت اپنے لہجے کو شائستہ بناتے ہوئے بولا۔ "جی میڈم فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"مجھے اس تھانے کے بڑے افسر سے ملنا ہے۔ فوراً" بہت ارجنٹ معاملہ ہے۔" مسز عثمانی نے کامل سنجیدگی سے کہا۔

ایک تجاہلانہ سی مسکراہٹ پولیس اہلکار کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ "بڑے صاحب تو ابھی گھر سے تشریف۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی نشست پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "میڈم' انچارج صاحب تو ابھی سیٹ پر نہیں ہیں' میرا مطلب ہے گشت پر گئے ہوئے ہیں' آپ مجھے بتائیں میڈم' میں بھی ایک چھوٹا موٹا آفیسر ہوں۔ آپ بتائیں' معاملہ کیا ہے۔"

مسز عثمانی ذرا جھجکیں' مگر پھر اگلے ہی لمحے رازدرانہ انداز میں کہنے لگیں۔ "دیکھیں آفیسر' ایک انتہائی خطرناک واردات ہوگئی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ جلد از جلد کسی تفتیشی افسر یا ہو سکے تو کسی سراغ رساں کو میرے ساتھ بھیجیں تاکہ وہ موقع واردات پر جاکر اس کیس کی تفتیش کرے۔"

مسز عثمانی کا خیال تھا کہ ان کی اس اطلاع پر وہ اہلکار فوراً" کسی رجسٹر یا فائل میں کچھ لکھے گا' کوئی ابتدائی رپورٹ وغیرہ' اور پھر انٹر کام پر کسی انسپکٹر کو طلب

کرے گا' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اہلکار کرسی کی پشت سے کمر ٹکائے' ایک عجیب ڈھٹائی سے ان کی طرف دیکھتا رہا' یوں جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کی شخصیت کی اور ان کی اطلاع کی اہمیت کا اندازہ کر رہا ہو۔

"لگتا ہے' کوئی چوری شوری ہوگئی ہے آپ کی۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"نہیں کوئی چوری وغیرہ نہیں ہوئی۔" مسز عثمانی تیزی سے بولیں۔

"پھر کیا کوئی بچہ وچہ گم ہوگا ہے۔"

مسز عثمانی کا پارہ چڑھنے لگا۔ وہ جانتی تھیں کہ جب اس نچلے درجے کے ملازم کو پتا چلے گا کہ کیا بھیانک واردات ہوئی ہے تو ہکا بکا ہو کر رہ جائے گا۔ "قتل ہوا ہے مسٹر قتل۔۔۔ ایک بہیمانہ قتل!" انہوں نے نپی تلی مگر واضح آواز میں کہا۔

ہکا بکا ہونے کے بجائے اس اہلکار کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا۔ پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے آنکھیں سکیڑیں اور بولا۔ "کیا کہا۔۔۔ کون سا قتل!"

"اوہو۔۔۔" مسز عثمانی جھنجلا کر رہ گئیں۔ "بے رحمی سے کیا ہوا قتل۔"

"قتل تو سارے بے رحمی سے ہی ہوتے ہیں جی۔ رحم کھا کر قتل کون کرتا ہے۔" پولیس اہلکار نے ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "خیر میڈم! آپ یہ بتائیں کہ قتل کس کا ہوا ہے' اور کہاں۔۔۔؟"

"میرے گھر میں۔۔۔ میری کوٹھی کے لان میں!"

"آپ کے گھر میں!" پولیس اہلکار نے اچنبھے سے کہا۔ مسز عثمانی کو اس کے لہجے میں پہلی بار سنجیدگی اور تشویش محسوس ہوئی۔ انہوں نے کہنی میز پر ٹکائی اور ذرا سا آگے ہو کر بولیں۔ "جی ہاں' میری کوٹھی کے پچھلے لان میں' مقتول کی لاش وہاں میرے کھاد کے ڈھیر پر پڑی ہے۔ مجھے لگتا ہے' اس کی وجہ سے میری مہینوں کی محنت برباد ہوگئی ہوگی اور اس کے علاوہ مقتول کے پیروں کے نیچے آکر میرے گوبھی کے چند پودے بھی۔۔۔"

"وہ قتل ہونے والا آپ کا کوئی مالی شالی تھا؟" پولیس اہلکار نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں' وہ ہمارا مالی نہیں تھا۔" مسز عثمانی تندی سے بولیں۔ "میرے لیے وہ سراسر اجنبی ہے۔ آج صبح سے پہلے میں نے کبھی اس شخص کو نہیں دیکھا۔"

"حلیہ کیسا ہے اس کا؟"

"حلیہ۔۔۔؟" مسز عثمانی خلا میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ "وہ عام سی شکل کا آدمی ہے۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ قاتل نے کسی تیز اور نوکیلے ہتھیار سے اس کی گردن پر پے در پے وار کر کے اسے قتل کیا ہے اس کی گردن پر اور اس کے براؤن اوور کوٹ کے کالر پر جمے ہوئے خون کے دھبے تھے۔ وہ کھاد کے ڈھیر پر پہلو کے بل پڑا ہوا تھا' بھورے اوور کوٹ کے علاوہ اس نے گہرے چاکلیٹ رنگ کی پتلون اور سیاہ شوز پہن رکھے ہیں۔"

یہ ساری تفصیل بتانے کے بعد مسز عثمانی نے جب دوبارہ پولیس اہلکار کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے زیر لب مسکراتے اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ مسز عثمانی کے خاموش ہونے کے چند سیکنڈ بعد وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میڈم۔۔۔ برا مت مانئے گا۔"

"جی پوچھئے۔"

وہ اہلکار ایک بار پھر ذرا سا جھجکا' پھر ذرا نیچی آواز میں بولا۔ "میڈم! آپ کہیں جاسوسی ناولوں اور۔۔۔ اور جاسوسی ڈراموں شراموں کی شوقین تو نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" مسز عثمانی کا پارہ چڑھ گیا۔ "تم سمجھ رہے ہو۔ میں اتنی دیر سے تمہیں کوئی فرضی قصہ' کوئی افسانہ سنا رہی ہوں۔ میرے گھر میں ایک شخص کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ کوئی بے رحم قاتل اسے مار کر فرار ہو چکا ہے اور آپ یہاں بیٹھے مجھ سے ٹھٹھا مذاق کر رہے ہیں۔ میں آپ کی اوپر رپورٹ کروں گی۔ آپ ابھی میری رپورٹ درج کر رہے ہیں تو ٹھیک' ورنہ میں آپ کے کسی اعلا افسر کے دفتر میں

جاتی ہوں۔"

"آپ تو ناراض ہو گئیں میڈم۔ پلیز آپ تشریف رکھیے۔" پولیس اہلکار اپنی نشست سے اٹھ کر لجاجت سے بولا۔ مسز عثمانی جو کرسی سے آدھا اٹھ چکی تھیں، دوبارہ براجمان ہو گئیں، مگر ان کا منہ اسی طرح پھولا رہا۔

پولیس اہلکار بھی اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ میز پر رکھے ہوئے دستر خوان کو سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے وہ دھیمی مفاہمانہ آواز میں بولا۔ "میں آپ کی بات کو جھوٹ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اصل میں مجھے جو الجھن تھی، وہ اس بات کی تھی کہ جب بھی کہیں اس قسم کی واردات ہوتی ہے تو اسے دیکھنے والا شخص فوری طور پر فون کر کے پولیس کی اطلاع دیتا ہے۔ مگر آپ نے کسی کو فون نہیں کیا اور پھر اتنی دیر کے بعد... میرا مطلب ہے کہ لاش آپ نے صبح چھ ساڑھے چھ بجے دیکھی، مگر ہمارے پاس آپ اب ساڑھے نو بجے کے..."

"اصل میں میرے پاس تھانے کا فون نمبر نہیں تھا۔" مسز عثمانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پھر تیاری میں اور یہاں آنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ بہرحال اب آپ مزید وقت ضائع نہ کریں اور جلد سے جلد کارروائی شروع کریں۔"

"اوہ... یقیناً۔" پولیس اہلکار نے یہ کہتے ہوئے دائیں جانب پڑے ریک میں سے ایک فارم نکال کر اپنے سامنے رکھا، جیب سے قلم نکالا اور بولا۔ "جی میڈم! اب بتایئے آپ کا نام؟"

"مسز زینب عثمانی۔"

"والد کا نام... اور اگر شادی شدہ ہیں تو شوہر کا نام۔"

"اسرار الحق عثمانی... یہ میرے شوہر ہیں۔"

"مکمل ایڈریس..."

پولیس اہلکار مسز عثمانی سے ان کے بارے میں اسی نوعیت کے سوالات پوچھتا رہا۔ حتیٰ کہ فارم کا پہلا صفحہ ختم ہو گیا۔ ورق پلٹتے ہوئے اس نے اگلا سوال کیا۔

"کبھی آپ شدید بیمار ہوئیں، اگر ہوئیں تو بیماری کی نوعیت کیا تھی... جسمانی... یا... ذہنی۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" مسز عثمانی بپھر گئیں۔ "میں آپ کے پاس ایک خطرناک واردات کی اطلاع لے کر آئی ہوں اور آپ میرے بارے میں ان فضولیات میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"دیکھیں میڈم، میں یہ سوالات خود سے نہیں کر رہا ہوں۔ یہ رومین کی کارروائی ہے۔ یہ تمام سوالات اسی فارم پر چھپے ہوئے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔" پولیس اہلکار نے فارم کھول کر مسز عثمان کے سامنے رکھ دیا اور ایک سیکنڈ کے بعد ہی فارم دوبارہ اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ جو رپورٹ درج کروانے آئی ہیں، اس کے بارے میں سوالات آگے آئیں گے۔ آپ فی الحال اس سوال کا جواب دیں جو میں نے پوچھا ہے۔"

مسز عثمانی اپنی نشست میں ذرا کسمسائیں۔ پھر کسی قدر تذبذب سے بولیں۔ "سر درد کبھی کبھار مجھے ہوتا رہا ہے اور اس کے علاج کے لیے میں ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی ہوں، مگر اب مجھے اس مرض سے نجات مل چکی ہے۔ اب میں سو فیصد صحت مند ہوں، تھینک گاڈ!"

پولیس اہلکار نے فارم پر تیزی سے کچھ لکھا اور پھر اگلا سوال پوچھا۔ سوالات کا یہ سلسلہ مزید چند منٹ تک جاری رہا، پھر آخر کار وہ فارم ختم ہو گیا۔ مسز عثمانی نے اطمینان کا سانس لیا اور بے تابی سے بولیں۔ "اب تو ساری کارروائی پوری ہو چکی ہے نا، پلیز اب آپ جلدی سے اپنے سراغ رساں کو بلوائیں، تاکہ وہ میرے ساتھ جائے اور تفتیش شروع کرے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ ہمیں جلد سے جلد شہادتیں حاصل کرنا ہوں گی اور قاتل کو تلاش کرنا ہو گا ایسا نہ ہو کہ وہ ہماری دسترس سے دور نکل جائے، آپ میری..."

مسز عثمانی کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پولیس اہلکار نے فارم اٹھایا اور بائیں طرف کے ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔ کافی دیر کے انتظار کے بعد

وہ واپس آیا تو فارم اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے لاتعلقانہ سی نظروں سے مسز عثمانی کو دیکھا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میڈم‘ اب آپ تشریف لے جائیں۔ میں نے رپورٹ متعلقہ سیکشن کو دے دی ہے۔ تفتیشی افسر آج کسی وقت آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔“

”کسی وقت؟“ مسز عثمانی نے چیختے ہوئے کہا۔ ”آپ معاملے کی نزاکت کو نہیں دیکھ رہے۔ ادھر ایک لاش پڑی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں‘ کسی وقت۔ جی نہیں آفیسر آپ یا تو تفتیشی افسر کو میرے ہمراہ بھیجیں یا بہت جلد میرا مطلب ہے‘ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اور ہاں... میرا نام مسز رحمانی نہیں‘ مسز عثمانی ہے۔“

”ٹھیک ہے‘ مسز عثمانی۔ میں کوشش کروں گا کہ تفتیشی افسر جتنی جلد ہو سکے آپ کے ہاں پہنچے‘ خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ اہلکار سامنے میز پر رکھی ہوئی فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مسز عثمانی نے اپنا پرس اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گئیں۔

☆ ☆ ☆

مسز عثمانی نے گھنٹی بجنے پر دروازہ کھولا اور کسی قدر ناامیدی سے نووارد کو دیکھا۔ ”تم تفتیشی افسر ہو؟!“ انہوں نے شک سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

”جی میڈم۔“ یہ رہا میرا کارڈ! نووارد نے ایک کارڈ جیب سے نکال کر مسز عثمانی کو دکھایا‘ انہوں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھا اور اسے اندر آنے کو کہا۔ مگر وہ اب بھی شک بھری نظروں سے بار بار اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں سراغ رساں کا جو تصور تھا‘ یہ خوش شکل نوجوان اس سے بالکل مختلف تھا۔ نہ تو اس کی آنکھوں پر چشمہ تھا اور نہ ہی سر پر چیک والی پی کیپ وہ عمر میں بھی بہت کم اور ناتجربے کار معلوم ہو رہا تھا۔ متلاشی نظروں سے گردوپیش کی ہر چیز کا بغور جائزہ لینے کے بجائے‘ وہ یوں لاپروائی سے بازو ہلاتا ہوا چلا آ رہا تھا‘ جیسے تفتیش کے لیے نہیں‘ بلکہ کسی دوست کی دعوت ولیمہ میں شریک ہونے کے لیے آیا ہو۔ ہاں‘ اپنی وردی کے اوپر اس نے گرے رنگ کا ایک اوور کوٹ ضرور پہن رکھا تھا‘ مگر وہ بھی شاید اس لیے کہ آج سردی کچھ زیادہ ہی شدید تھی۔ اس کے ہاتھ میں نہ کوئی چھڑی نظر آ رہی تھی اور نہ محدب عدسہ۔

اس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد مسز عثمانی نے اندر جا کر ملازمہ کو چائے لانے کو کہا اور پھر واپس ڈرائنگ روم میں آ کر اس نوجوان کے سامنے چھوٹے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ وہ نوجوان‘ جس نے اپنا نام زبیر بتایا تھا‘ سر اٹھائے کمرے کی چھت‘ دیواروں اور پینٹنگز کا جائزہ لینے میں محو تھا۔ مسز عثمانی کے آجانے کے بعد وہ اس نے سر سے پاؤں تک بغور ان کے سراپے کا مشاہدہ کیا‘ پھر شک بھرے لہجے میں بولا۔

”مسز کرمانی‘ آپ نے کچھ دیر پہلے تھانے میں آ کر رپورٹ دی تھی کہ آپ کے گھر میں کوئی قتل کی واردات ہوئی ہے۔ کیا آپ اب بھی اپنے اس بیان پر قائم ہیں۔ میرا مطلب ہے‘ کیا واقعی آپ کے گھر میں کوئی لاش وغیرہ موجود ہے... اب تک؟“

مسز عثمانی نے الجھن سے اس نوجوان کو دیکھا۔ وہ الجھن جلد ہی جھنجلاہٹ میں اور پھر طیش میں بدل گئی۔ ان کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ صوفے سے اٹھ کر ایک زوردار جھانپڑ اس نوجوان کے حماقت زدہ چہرے پر رسید کریں یا کم از کم اسے کھری کھری صلواتیں سنائیں‘ مگر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے بمشکل انہوں نے طیش کی اس منہ زور دار لہر پر قابو پایا۔ کچھ دیر میں‘ جب وہ مناسب حد تک نارمل ہو گئیں تو انہوں نے آنکھیں کھولیں اور لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے بولیں۔ ”مسٹر زبیر! ابھی چائے آ رہی ہے۔ آپ چائے پی لیں‘ پھر میں آپ کو لاش تک لے چلوں گی اور ہاں میرا نام مسز کرمانی نہیں‘ مسز عثمانی ہے۔“

زبیر‘ جو بغور مسز عثمانی کی حالت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ چائے آنے تک مزید کوئی سوال پوچھنے کی ہمت نہ

کر سکا۔ چائے پینے کے بعد جیسے ہی اس نے خالی پیالی میز پر رکھی، مسز عثمانی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور "آیئے مسٹر زبیر۔" کہہ کر ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

ایک لمبا کوریڈور طے کرنے کے بعد وہ دونوں کوٹھی کے عقبی برآمدے میں آئے اور وہاں سے پچھلے لان میں اتر آئے۔ برآمدے کی سیڑھیاں ختم ہوتے ہی مسز عثمانی نے نوجوان پولیس آفیسر کے بازو کو تھاما اور کھاد کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"وہ دیکھیے، وہ پڑی ہے مقتول کی لاش، قریب جاکر غور سے دیکھیے۔ وہ اصلی لاش ہے۔ کسی جاسوسی کہانی کا فرضی منظر یا میرے وہم کی پیداوار نہیں ہے۔"

زبیر نے سر اٹھا کر کھاد کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا تو چند لمحوں تک خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا اسی جانب تکتا رہا۔ اس کا منہ جیسے سلوموشن میں کھل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گردن گھما کر مسز عثمانی کی طرف بے یقین نظروں سے دیکھا، پھر تیز قدموں سے کھاد کے اس ڈھیر کی طرف بڑھ گیا، جس پر نامعلوم شخص کی لاش ابھی تک اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ مسز عثمانی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک لیے اور ہونٹوں پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

لاش کے قریب جاکر زبیر نے اپنے اوور کوٹ کی جیب سے ایک کیمرہ نکالا اور مختلف مقامات سے اس لاش کی تصویریں لینے لگا، پھر کیمرہ ایک طرف رکھ کر اس نے اوور کوٹ کی دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا اور کھاد کے ڈھیر کے قریب بیٹھ کر اسے کھولنے لگا۔ مسز عثمانی اس کے عقب میں کھڑی بغور اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہی تھیں۔ زبیر نے اس ڈبے سے چند آلات نکالے اور ڈبا بند کر کے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ مسز عثمانی نے دیکھا کہ ان کی آلات میں محدب عدسہ نہیں ہے۔

زبیر نے پیمائش کرنے والا دھاتی فیتہ کھولا اور لاش کے قریب جاکر اس کو ناپنے لگا۔ مسز عثمانی جو اس دوران اپنی جیب سے محدب عدسہ نکال چکی تھیں، اس کے قریب گئیں اور عدسہ اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولیں۔ "یہ لو برخوردار، اس کی بھی تمہیں ضرورت پڑے گی۔"

"یہ کیا ہے!" زبیر نے سر اٹھا کر الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ محدب عدسہ ہے۔" مسز عثمانی نے اسے مطلع کیا۔ "اسے میگنی فائنگ گلاس بھی کہتے ہیں۔ کسی بھی واردات کے بعد شہادتیں تلاش کرنے کے لیے یہ بہت ہی ضروری ہوتا ہے۔"

"نہیں میڈم! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" زبیر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "اسے آپ رکھ لیں۔"

مسز عثمانی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر زیر لب کچھ بڑبڑائیں اور پیچھے ہٹ گئیں۔ زبیر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے نظریں اٹھائیں تو یہ دیکھ کر ذرا حیران سا ہوا کہ کھاد کے ڈھیر کی دوسری جانب مسز عثمانی پنجوں کے بل دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہوئی رکوع کی حالت میں جھک کر، محدب عدسے کی مدد سے زمین پر کچھ تلاش کر رہی ہیں۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔" زبیر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"میں تمہاری مدد کر رہی ہوں برخوردار۔" مسز عثمانی نے کامل سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس عدسے کی مدد سے شہادتیں تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ قاتل کے قدموں کے نشانات یا اس کی کوئی ایسی چیز یہاں ضرور مل جائے گی جس کی مدد......"

"پلیز مسز یزدانی۔۔۔" زبیر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آپ ایک طرف خاموش بیٹھ جائیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔"

"مسز یزدانی نہیں، مسز عثمانی!" وہ جھنجلا کر بولیں۔ اور یہ ایک طرف خاموش بیٹھ جانے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ قتل کی ایک بھیانک واردات ہو چکی ہے

وہ بھی میرے گھر میں ادھر خطرناک قاتل آزاد گھوم ہے اور تم ہو کہ مجھے ایک طرف خاموش ہو کر بیٹھ نے کا کہہ رہے ہو۔"

"دیکھیے مسز۔۔۔ مسز عثمانی۔" زبیر نے اپنے طیش پر و پاتے ہوئے اور بمشکل اپنے لہجے اور آواز کو نرم کھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا اضطراب سمجھ رہا ہوں پلیز آپ بھی میری مدد کرنے کی کوشش کریں۔"

"مدد ہی تو کر رہی تھی میں تمہاری۔" مسز عثمانی نے کھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میڈم' برا مت مانیے گا۔ جس طرح ابھی پ لان کے کنارے پر چل رہی تھیں' اس سے یت اہم نشانات ضائع ہونے کا امکان ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ مجھے اب اپنے بیڈ روم میں کر سو جانا چاہیے۔" مسز عثمانی نے خفگی سے کہا۔

"نہیں میڈم' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں آپ سے صرف اتنا تعاون چاہتا ہوں کہ جب تک میں اس ہ کا جائزہ اور پیمائش وغیرہ مکمل نہ کرلوں' آپ ایک رف۔۔۔ میرا مطلب ہے' اپنے کمرے میں یا۔۔۔ یا ھر برآمدے میں بیٹھ کر اخبار یا کوئی ناول وغیرہ پڑھ ں۔۔۔ یا اگر کوئی اور آپ کا پسندیدہ مشغلہ ہو تو اس ۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں مشغلہ کیوں نہیں۔" مسز عثمانی نے ں کی بات کاٹی۔ "میں فارغ وقت میں نٹنگ کرتی ں۔"

"لیجیے' پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" زبیر نے خوش تے ہوئے کہا۔ "آپ اپنا بنائی کا سامان لے آئیں ر ادھر برآمدے میں یا چاہیں تو اطمینان سے اپنے مرے۔۔۔"

"نہیں بیٹا' میں یہاں برآمدے میں بیٹھ کر نٹنگ رتی ہوں۔ کیا خبر تمہیں کب کس چیز کی یا کسی شورے کی ضرورت پڑ جائے۔"

یہ کہہ کر مسز عثمانی اپنی خواب گاہ میں آ گئیں۔ وہ ھ بنا سوئٹر جسے وہ پچھلے دو تین روز سے بن رہی یں۔ ان کی مسہری کی سائڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ انہوں نے وہ سوئٹر اور اون کا گولا اٹھایا۔ مگر وہاں سلائی صرف ایک ہی پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر مسہری پر اور نیچے فرش پر دوسری سلائی تلاش کرتی رہیں۔ پھر بیوس ہو کر الماری کھولی اور سلائیوں کا ڈبا نکال لیا۔ مگر ان کی مطلوبہ نو نمبر والی سلائی اس میں بھی موجود نہ تھی۔ مجبوراً انہوں نے دس نمبر کی ایک سلائی منتخب کی اور پھر وہ سب چیزیں اٹھا کر پچھلے برآمدے میں آ گئیں۔

زبیر کھاد کے ڈھیر کے پاس اپنے کام میں منہمک تھا۔ مسز عثمانی ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے پسندیدہ مشغلے میں محو ہو گئیں۔ مگر ان پر ایک جھنجلاہٹ سی طاری تھی۔ تیزی سے سلائیاں چلاتے ہوئے وہ بار بار یہی سوچ رہی تھیں کہ اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم اور یادگار دن میں جبکہ ان کے اپنے گھر میں قتل کی ایک خوف ناک واردات ہو چکی ہے اور مقتول کی لاش ان کی نظروں کے سامنے پڑی ہے' وہ بجائے تفتیش کے اہم کام میں شریک ہونے کے یہاں برآمدے میں بیٹھی ہیں اور ایک معمولی گھریلو عورت کی طرح سلائی بنائی کے اس فضول کام میں مصروف ہیں۔

مسز عثمانی جھنجلائے ہوئے انداز میں سلائیاں چلاتی اپنے خیالوں میں اس حد تک محو تھیں کہ انہیں پتا ہی نہ چلا کہ زبیر نے کب اپنا کام ختم کیا اور کب وہ برآمدے میں داخل ہوا۔ مسز عثمانی کے بالکل قریب پہنچ کر جب وہ کھنکارا تو وہ اپنی نشست پر بری طرح اچھل کر رہ گئیں۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" مسز عثمانی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کھسیانے لہجے میں کہا۔ "اور تمہاری وجہ سے میرے سوئٹر کے کتنے خانے ڈراپ ہو گئے۔"

زبیر جو بہت غور سے مسز عثمانی کو بنائی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا' اطمینان سے ان کے مقابل پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور لاابالی سے انداز میں بولا۔ "آپ تو ماشاء اللہ بہت اچھی نٹنگ کر لیتی ہیں۔ کس کا سوئٹر ہے یہ؟"

"یہ میرے ہزبینڈ کا ہے۔" انہوں نے کسی تاثر کے بغیر کہا اور سوالیہ نظروں سے زبیر کی طرف دیکھنے

لگیں۔ وہ منتظر تھیں کہ زبیر انہیں اپنی اب تک کی تفتیش اور جائے واردات کے جائزے کے بارے میں کچھ بتائے گا' مگر جب کئی لمحے گزرنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔ "لاش کے معائنے سے کچھ پتا چلا؟ اور... اور قاتل کے قدموں کے نشانات اور آلہ قتل وغیرہ کا کوئی سراغ۔"

زبیر ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے کچھ دیر بغور ان کی طرف دیکھتا رہا' پھر اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک اور قلم نکالتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ سے بولا۔ "معاف کیجئے مسز نعمانی' میں آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"سوالات؟" مسز عثمانی کی تیوری چڑھ گئی۔ "اور ہاں برخوردار میرا نام مسز عثمانی ہے۔"

"جی مسز عثمانی' آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ ہماری روٹین کی کارروائی ہوتی ہے۔ یہ بہت عام سے سوالات ہیں۔ ان سے ہمیں کیس کی تفتیش میں مدد ملتی ہے۔"

"سوالات... سوالات۔" مسز عثمانی نے شدید جھنجلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ "جسے دیکھو سوالات پوچھنے کا شوق چرایا ہے۔ ان کم بختوں کو کون سمجھائے کہ یہ موقع فضول اور بے مقصد سوال و جواب کا نہیں' ایکشن کا ہے۔ فوری عمل کا ہے' تاکہ مجرم کو جلد سے جلد گرفت میں لیا جاسکے۔" یہ خیالات مسز عثمانی کے ذہن میں کیچوؤں کی مانند کلبلا رہے تھے' مگر وہ انہیں زبان پر نہ لاسکیں۔ زبیر کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سوال پوچھے بنا نہیں رہے گا۔ مسز عثمانی نے اپنے طیش کو بمشکل دبایا اور بولیں۔ "ٹھیک ہے' پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

زبیر نے نوٹ بک اور قلم سنبھالا اور سوالات پوچھنا شروع کیے۔ "آپ کی عمر کیا ہے' مشاغل کیا ہیں' خاوند کی عمران کا پیشہ' ان کے مشاغل آپ کی صحت کی کیا' پوزیشن ہے۔ کوئی مخصوص بیماری تو لاحق نہیں ہے۔"

مسز عثمانی حتی الامکان سکون اور صبر سے ان سوالوں کے جوابات دیتی رہیں' مگر ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سوالوں کا قتل کی اس حالیہ واردات سے کیا تعلق ہے۔ جس کی تفتیش کے لیے زبیر یہاں آیا ہے۔ جھنجلاہٹ ایک مضطرب کردینے والے غبار کی صورت مسز عثمانی کے وجود سے اٹھنے لگی اور ایک مانوس سی چبھن انہیں اپنی کنپٹیوں پر محسوس ہوئی' مگر وہ خود پر قابو پائے بظاہر پرسکون انداز میں بیٹھی رہیں۔

"ٹھہریے مسز عثمانی' ابھی آپ نے کیا کہا۔" زبیر کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ "آپ کو کبھی کبھار شدید سر درد کے دورے پڑتے ہیں۔"

"دیکھو مسٹر!" مسز عثمانی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ' جس میں ابھی تک انہوں نے بنائی کی سلائیاں تھام رکھی تھیں' جارحانہ انداز میں زبیر کے چہرے کے قریب لے جاتے ہوئے وہ اونچی اور تند آواز میں بولیں۔ "بہت ہوچکا۔ بند کرو اپنے یہ احمقانہ سوالات' غضب خدا کا' ایک شخص کا بہیمانہ قتل ہوچکا ہے۔ ایک وحشی قاتل آزاد پھر رہا ہے۔ عین ممکن ہے وہ دیوانہ ہو اور اس لمحے بھی اپنے اگلے شکار کو قتل کرنے والا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہیں کہیں' ہمارے آس پاس ہی موجود ہو اور ہم...؟ ہم یہاں کیا کررہے ہیں؟ بجائے اس کے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس سفاک قاتل کو ڈھونڈیں اور پکڑیں' ہم یہاں مزے سے ان بے سروپا سوال و جواب میں مشغول ہیں۔ آخر کیا مقصد اور کیا افادیت ہے ان سوالوں کی' بتاؤ؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا میڈم' یہ ہماری روٹین کی کارروائی کا حصہ ہے۔" زبیر نے منمنائی ہوئی آواز میں کہا۔

مسز عثمانی کی آنکھیں شدت غضب سے سکڑ گئیں' انہوں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے نیچی' سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اے مسٹر! مجھے تو اب اس بات میں بھی شک ہورہا ہے کہ تم واقعی پولیس والے ہو بھی یا نہیں۔"

ایک خفیف سی مسکراہٹ زبیر کے ہونٹوں پر

نمودار ہوئی۔ ”میں پولیس والا ہی ہوں۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ ”اور میں آپ کے اضطراب کا بھی اندازہ کررہا ہوں‘ مگر آپ اتنی ٹینشن نہ لیں‘ اگر سردرد محسوس ہورہا ہے تو بہتر ہے کہ ڈسپرین لے لیں۔“

طیش سے مسز عثمانی کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی۔ وہ کچھ کہنے کا ارادہ کررہی تھیں‘ مگر اس سے پہلے زبیر نے ایک وزٹنگ کارڈ ان کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”مسز لاثانی‘ آپ اس نام کے کسی شخص کو جانتی ہیں۔ یہ کارڈ آپ کے بنگلے میں پڑی لاش کی جیب سے ملا ہے۔ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ یہ کارڈ مقتول کا ہے یا کسی اور کا۔ بہرحال اس پر کسی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ بھٹی کا نام درج ہے۔ نیچے جیل روڈ کے مشہور نفسیاتی اسپتال کا پتا بھی دیا ہوا ہے۔ آپ انہیں جانتی ہیں۔“

مسز عثمانی اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور بدن پر کپکپی سی طاری تھی۔ میرے اندیشے غلط نہیں تھے۔ ان کے غبار آلود ذہن میں خیال ابھرا۔ یہ بھی ان ہی کا ساتھی ہے تب ہی مجھ سے ایسے بے سروپا سوال پوچھے جارہا ہے۔ وہی بھورے رنگ کا اوور کوٹ اور ویسی ہی سوالوں کی بوچھاڑ۔۔۔ بے مقصد‘ بے فائدہ سوالات‘ سوالات۔۔۔ آخر مجھے ہوا کیا ہے۔ محض معمولی سا درد۔

”تو تم بھی سائیکاٹرسٹ ہو۔“ مسز عثمانی اونچی آواز میں چلائیں۔ ”تم سب ایک ہی ہو۔“

ایک دھڑکتے ہوئے درد کی تیز لہریں انہیں اپنی آنکھوں کے پیچھے محسوس ہوئیں اور پھر وہی مانوس غبار ان کے وجود سے ابھر کر تیزی سے ان کے ذہن کے ہر گوشے میں سمانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے جارحانہ انداز میں زبیر کی طرف جھپٹیں‘ بنائی کی سلائیاں اور ادھ بنا سوئٹر ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھا۔

زبیر گھبرا کر کرسی سے اٹھا اور پھر الٹے قدموں چلتا‘ گرتا پڑتا ہوا تیزی سے برآمدے سے نکلا اور پچھلے باغیچے میں آگیا۔ مسز عثمانی جن کی آنکھیں وحشت سے پوری کھلی ہوئی تھیں اور جن کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا‘ اس کے پیچھے پیچھے تھیں اون کا گولا کہیں برآمدے میں ہی رہ گیا تھا۔ مگر نگین ڈیوری مسز عثمانی کے ساتھ ساتھ باہر باغیچے تک چلی آئی تھی۔

کھاد کے ڈھیر کے قریب پہنچ کر زبیر کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ کمر کے بل ڈھیر پر جا گرا۔ مسز عثمانی جیسے کسی عفریت کی مانند اس پر چھا گئیں۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ”سوالات۔۔۔ خالی سوالات۔“ وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”کب سے میں چیخ رہی ہوں‘ مگر کسی کی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آرہی کہ یہ موقع سوالات کا نہیں ہے‘ ایکشن کا ہے‘ فوری عمل کا ہے۔ یہاں ایک لاوارث لاش پڑی ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کو قتل کس نے کیا ہے؟“

زبیر نے دہشت زدہ نظروں سے مسز عثمانی کے چہرے کی طرف اور پھر ان سلائیوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں اور پھر بمشکل اٹکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا اب بھی آپ کو پتا نہیں چلا کہ یہ قتل کس نے کیا ہے۔۔۔ یہ قتل آپ نے کیا ہے میڈم۔۔۔ آپ نے بنائی کی سلائیوں سے۔ جن کا نمبر غالباً دس ہے۔“

ایک ثانیے کے لیے مسز عثمانی پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ حیرت اور بے یقینی سے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دھندلاتی ہوئی نگاہوں سے انہوں نے اپنے ہاتھ کی طرف‘ ہاتھ میں جکڑی سلائیوں کی طرف اور پھر سامنے کھاد کے ڈھیر پر پڑے ہوئے دو جسموں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک مردہ اور بے حرکت تھا اور دوسرا بری طرح کپکپا رہا تھا۔ تب ان کی نظر کھاد کے ڈھیر پر پڑی جو خراب ہوگیا تھا اور ترکاری کے ان ننھے پودوں پر جو پیروں کے نیچے آکر کچلے گئے تھے ایک منظر۔۔۔ ایک سیکنڈ کے لیے ان کے ذہن میں واضح ہوا۔ انہیں اپنے دائیں ہاتھ میں ایک سلائی دکھائی دی۔ سلائی جس سے تازہ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے‘ پھر فوراً ہی ایک دوسرا منظر انہیں دکھائی دیا۔ ان کی ہتھیلی پر اور کلائی پر اور آستین پر تاریک رنگ کے دھبے تھے۔ جنہیں وہ

واشنگ پاؤڈر کی مدد سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھیں۔ مسز عثمانی کے پورے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"دس نمبر نہیں... نو نمبر سلائی تھی وہ۔" انہوں نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔

"پلیز مسز عثمانی۔" سامنے پڑے ہوئے بھورے اوورکوٹ میں سے یہ آواز ایک سسکاری کی مانند نکلی اور پھر اس اوورکوٹ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مسز عثمانی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا اور شاید یہی الفاظ اس بھورے اوورکوٹ میں سے بھی نکلے تھے اور... اور اسی طرح اس نے بھی اٹھنے اور بھاگ جانے کی کوشش کی تھی... مگر نہیں... بہت ہوچکا... اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ سرمئی غبار جس نے ان کے سارے وجود کو لبالب بھر دیا تھا' اچانک دھماکے سے پھٹا اور شعلہ رنگ ہوگیا۔ ایک انجانی سی وحشت اور ایک اجنبی حیوانی طاقت کے ساتھ مسز عثمانی سامنے پڑے ہوئے آدمی کے چہرے اور گردن میں سلائیاں گھونپنے لگیں۔

تڑپتے اور بل کھاتے ہوئے اوورکوٹ میں سے ایک غیر انسانی سی کراہ بلند ہوئی' پھر ایک گھٹی گھٹی سی آواز ابھری۔ "ہیلپ... کوئی ہے۔" مسز عثمانی نے دانت پیستے ہوئے اگلا وار ان ہی ہونٹوں کے بیچوں بیچ کیا جن سے یہ آواز نکلی تھی۔

اس مرتبہ ایک غرغراہٹ سی ابھری اور اس کے ساتھ ہی وہ اوورکوٹ بری طرح اچھلا' ایک جوتے کی نوک مسز عثمانی کی پنڈلی سے ٹکرائی' بے اختیار ان کے ہونٹوں سے کراہ بلند ہوئی۔ مگر فوراً" ہی وہ سنبھل گئیں۔ ان لڑکھڑاہٹ میں سلائی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ مسز عثمانی نے سلائی تلاش کرنے کی کوشش کی' مگر وہ غرغراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی اور وہ اوورکوٹ اب بھی اچھل رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔

مسز عثمانی نے سلائی کی تلاش ترک کردی اور اون کی مضبوط ڈوری کو تیزی سے اس خون آلود گردن کے گرد لپیٹنے لگیں۔ کئی بل دینے کے بعد انہوں نے پوری طاقت سے اس ڈوری کو کس دیا۔ دو ایک جھٹکوں کے بعد وہ غرغراہٹ بھی بند ہوگئی اور وہ بھورا اوورکوٹ بھی بالآخر بالکل ساکت ہوگیا۔ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بس بہت ہوچکا۔ اب مزید کوئی سوال نہیں... مگر شرافت کی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔" مسز عثمانی تاسف سے سرہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں اور کامل احتیاط سے اپنی اون کی ڈوری اس خون آلود گردن سے علیحدہ کرنے میں مصروف تھیں۔

جب ساری ڈور علیحدہ ہوگئی تو مسز عثمانی نے ہاتھ اونچا کر کے اس کا جائزہ لیا اور زیرلب بڑبڑائیں۔ "یہ تو خون میں لتھڑ گئی۔ معلوم نہیں' یہ دھبے صاف بھی ہوپائیں گے یا نہیں اور اسرار تو اتنے نفاست پسند ہیں کہ اپنے لباس پر تو وہ ذرا سا داغ برداشت نہیں کرتے۔"

ایک قدم پیچھے ہٹ کر مسز عثمانی نے کھاد کے اس ڈھیر کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ برباد ہوچکا تھا۔ پھر جب ان کی نظر بائیں طرف گئی تو انہیں پتا چلا کہ گوبھی کے پودوں کے علاوہ پالک کے بھی بہت سے پودے اکھڑ چکے ہیں۔ تاسف سے سرہلاتی اور چچ... چچ کرتی ہوئی وہ ان پودوں کے قریب گئیں تو وہاں انہیں اپنی بنائی کی دونوں سلائیاں کیاری میں پڑی دکھائی دیں۔ نو نمبر کی سلائی جو گزشتہ روز سے نہیں مل رہی تھی اور دس نمبر کی وہ سلائی بھی جو آج ان کے ہاتھ سے گری تھی۔ مسز عثمانی نے دونوں سلائیاں اٹھائیں اور پھر سارے باغیچے میں بکھری ہوئی اون کی ڈوری لپیٹتے ہوئے وہ برآمدے میں آگئیں۔

کتنی دیر تک وہ باتھ روم میں مصروف رہیں' انہیں کچھ اندازہ نہ تھا۔ پھر جب کمرے میں آکر وہ تولیے سے اپنے ہاتھ اور بازو پونچھ رہی تھیں تو اچانک انہیں تھکن کا شدید غلبہ محسوس ہوا۔ کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے وہ بستر پر دراز ہوئیں اور فوراً" ہی گہری نیند سو گئیں۔

بہت دیر کے بعد مسز عثمانی کی آنکھ کھلی تو سب سے

پہلے ان کی نظر کھڑکی کی طرف گئی۔ دن کی چمک رخصت ہو چکی تھی اور کوٹھی کے فرنٹ لان کی طرف سے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ ایک انجانے اندیشے کی لہر ان کے وجود میں سرسرائی۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑکی کے قریب گئیں۔ لان میں سب لوگ موجود تھے۔ مسز عثمانی کے شوہر اسرار الحق، ان کی بہن زیب النسا اور ان کے شوہر۔ ان کے علاوہ اسرار کی کزن میمونہ جو بیالیس سال کی ہونے کے باوجود ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں اور اکثر انہوں نے اسرار کو والہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے اور مسکراتے پکڑا تھا۔ وہ سب لوگ ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے اور شام کی چائے پی رہے تھے۔ مسز عثمانی کے وجود میں، کلبلانے والی اندیشے کی لہر کہیں تحلیل ہو گئی۔ اسی وقت زیب النسا کی نظر ان پر پڑی اور وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلائی۔ ”آپا..... جلدی آجائیں، ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔“

مسز عثمانی نے باتھ روم میں جا کر جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور اپنی اون اور سلائیاں لے کر باہر باغیچے میں آگئیں۔ ان کے شوہر نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور ان کے لیے ایک کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔ وہ سب لوگ بہت خوش گوار موڈ میں تھے، لیکن مسز عثمانی کے آنے پر وہ سب سنجیدہ بلکہ کسی قدر فکر مند نظر آنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

”آپا، آپ صبح خفا ہو کر چلی آئیں۔“ زیب النسا نے ٹھٹکتے ہوئے کہا۔ ”ہم آپ کو منانے آئے ہیں اور..... اور یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ وہ لاش واش کا کیا سلسلہ تھا جس کے متعلق آپ صبح بتا رہی تھیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ذکا صبح کی طرح ایک بار پھر غیر ارادی طور پر آنکھ مارنے کو تھا، مگر مسز عثمانی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ اس ارادے سے باز رہا۔

”ہاں بھئی، ایسی کچھ بات تو ہم نے بھی سنی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے مسز عثمانی کے شوہر اسرار الحق نے چائے کا کپ اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھمایا اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیوں زینو ڈیر۔ صبح تم کیا بتا رہی تھیں مجھے۔ اس وقت مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ میں دھیان سے تمہاری بات نہیں سن سکا تھا۔ وہ کیا معاملہ تھا۔ تم شاید یہ بتا رہی تھیں کہ تم نے گھر میں کہیں ایک لاش دیکھی۔“

”تم بھول رہے ہو اسرار۔“ مسز عثمانی نے گرم چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں نے ایک لاش نہیں، دو لاشوں کی بات کی تھی۔“

غور و فکر

حکمت

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔
”حکمت کس سے سیکھی؟“

جواب ملا: ”اندھوں سے..... وہ پہلے زمین کو اچھی طرح ٹٹول لیتے ہیں تب آگے بڑھتے ہیں۔“

توبہ

جو انسان جتنا مؤثر ہوگا اس کا گناہ اتنا ہی بڑا ہوگا۔ ہم اپنے گناہوں کو حلقۂ تاخیر میں سند بنا دیتے ہیں اور یوں ہم زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگر توبہ برملا نہ ہو تو برملا گناہ معاف نہیں ہوتا۔ جتنے بڑے ہجوم میں جھوٹ بولا گیا ہو اتنا ہی بڑا جھوٹ ہوتا ہے اور اس کے لیے اتنی ہی بڑی سزا ہے۔ اس سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اتنے ہی بڑے ہجوم میں توبہ کی جائے یا آئندہ ہجوم کے سامنے آنے سے توبہ کی جائے۔

(اقتباس۔ قطرہ قطرہ قلزم)

"دو لاشیں... اوہ مائی گاڈ... یہ معاملہ تو کچھ زیادہ سنگین نہیں ہوگیا؟" اسرار نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی' پھر معنی خیز نظروں سے پہلے اپنی سالی اور پھر اپنی کزن کی طرف دیکھا۔

"نہیں آپا' مجھے یاد ہے' آپ صبح ایک ہی لاش کے بارے میں بتا رہی تھیں۔" زیب النسا نے پریقین انداز میں اپنے بہنوئی کی تائید کی۔

"تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔" مسز عثمانی نے کڑی نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ تم نے میری بات کو سنجیدگی سے سنا ہی نہیں تھا' ورنہ تمہیں یاد ہوتا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ میں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ صبح جب میں خواب گاہ سے نکل کر باغیچے میں آئی تو وہاں میں نے دو اجنبی آدمیوں کو دیکھا' جو مر چکے تھے۔ کسی نے انتہائی بے دردی سے انہیں قتل کردیا تھا۔"

"مگر آپا باغیچے میں تو ہم سب اس وقت موجود ہیں۔ یہاں دو اجنبی آدمیوں کی لاشیں تو کیا' کسی چڑیا کے بچے کی لاش بھی نظر نہیں آرہی۔"

"احمق ہو تم سب۔" مسز عثمانی ایک شفقت آمیز خفگی سے بولیں۔ "خواب گاہ سے نکل کر صبح سویرے میں اس لان میں نہیں' بلکہ پچھلے باغیچے میں جاتی ہوں۔ جہاں میں نے سبزیاں اگا رکھی ہیں۔ وہ لاشیں میں نے وہیں دیکھی تھیں۔ پچھلے باغیچے میں' کھاد کے ڈھیر پر اور میرا خیال ہے کہ وہ دونوں لاشیں اب بھی وہیں موجود ہوں گی۔"

"تو چلیں نا آپا' ہمیں بھی وہ لاشیں دکھائیں۔" زیب النسا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بچوں کے سے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

"نہ بابا... میں وہ بھیانک منظر دوبارہ نہیں دیکھ سکتی۔" مسز عثمانی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جھرجھری سی لی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولیں۔ "تم سب جانتے ہو' مراد دل کتنا کمزور ہے۔ میں تو فلموں میں اور ڈراموں میں بھی ایسے خوف ناک منظر نہیں دیکھ سکتی۔ حقیقت کی دنیا میں ایسا منظر دوبارہ دیکھنا... نہ بھئی' یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ تم لوگ جاؤ' وہ لاشیں دیکھ آؤ۔ میں تو یہیں بیٹھ کر اسرار کا سوئٹر بنوں گی۔"

"ہائیں... اسرار بھائی کا سوئٹر ابھی تک نہیں بنا گیا۔" زیب النسا نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"آپا' آپ اتنی کاہل کب سے ہوگئیں۔ یہ سوئٹر تو آپ نے پچھلے مہینے شروع کیا تھا۔"

"شروع تو کیا تھا' مگر یہ کم بخت نو نمبر کی سلائی کہیں کھو گئی تھی۔ آج بڑی مشکل سے ملی ہے تو میں نے دوبارہ بُننگ شروع کی ہے۔" مسز عثمانی نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور گود میں رکھے شاپر میں سے ادھ بنا سوئٹر اور سلائیاں نکالتے ہوئے بولیں۔ "اچھا' اب تم سب جاکر پچھلے باغیچے میں پڑی لاشیں دیکھ آؤ اور پھر خدا کے لیے بیٹھ کر سنجیدگی سے سوچو کہ ان کا کرنا کیا ہے۔"

"ہاں بھئی' سب لوگ اٹھو۔" ذکا الرحمن یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مسز عثمانی کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "چلو' پچھلے باغیچے میں جاکر زیبو آپا کی لاشیں دیکھتے ہیں۔"

"خدا کا نام لو ذکی۔" زیب النسا نے اپنے شوہر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "زیبو آپا کی لاشیں نہیں' دو اجنبی آدمیوں کی لاشیں۔"

"ہاں... ہاں وہی!" ذکا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے ساتھ ہی باقی سب لوگ بھی اپنی نشستوں سے اٹھے اور باتیں کرتے' ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور زیر لب ہنستے ہوئے کوٹھی کے پچھلے باغیچے کی جانب چل دیے۔

ان کے جانے کے بعد مسز عثمانی نے اون کی ڈوری' سلائی پر چڑھائی اور کامل اطمینان سے بنائی میں مشغول ہوگئیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ' معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆ ☆

آخری کوشش

بسمیٰ سلمان

محبت وہ طاقت ور جذبہ ہے جس کے آگے تمام کائنات ہیچ ہے۔
محبت میں ہر رستہ نیا اور انجانا ہوتا ہے ان انجانی راہوں میں
کون کس کا ہم سفر بن جائے کچھ کہہ نہیں سکتے۔

محبت کی کریشمہ ساریاں...زمانے کی ریشہ دوانیاں

سڑک کے کنارے پڑے ہوئے اس شخص کو دیکھ کر عامر ایک دم بے چین ہو گیا تھا۔ اس شخص کا سر ایک لڑکی کی گود میں رکھا ہوا تھا جو بے چین نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی' عامر نے فوراً" ٹیکسی روک لی اور سر نکال کر پوچھا۔

"جی کیا ہوا ہے انہیں۔"

"دل کا دورہ پڑا ہے شاید' کوئی بھی نہیں ہے آس پاس پلیز مدد کریں۔"

عامر جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا' پھر اس نے جیسے تیسے مریض کو اٹھا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا جبکہ لڑکی اس کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر جا گھسی تھی۔ عامر نے جلدی سے ٹیکسی ایک اسپتال کی طرف موڑ دی۔ اسپتال کی ایمرجنسی میں مریض کو فوراً" ٹریٹمنٹ دی گئی اور اسے آکسیجن لگا دی گئی تھی' پھر بڑے ڈاکٹر کو بلا لیا گیا اور پھر بڑے ڈاکٹر کی آمد پر وہ لوگ انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگے' عامر تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا' لڑکی کے انداز میں شدید اضطراب تھا' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بار بار مریض کے بیڈ کی طرف دیکھنے لگتی تھی' ڈاکٹر سرمد مریض کا چیک اپ کرتے رہے اور پھر انہوں نے پیچھے ہٹ کر عامر کو بتایا۔

"مسٹر۔۔۔"

"عامر۔۔۔"

"مسٹر عامر! اس مریض کو سیریس قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے' کوشش کی جا رہی ہے ابھی ان کا ای سی جی وغیرہ کرا رہا ہوں' لیکن حالت تشویش ناک ہے' بھرپور کوشش کی جائے گی' آپ نے بڑا اچھا کیا اتنی جلدی انہیں یہاں لے آئے ورنہ شاید یہ اسپتال تک زندہ نہ پہنچ پاتے۔"

"اور مجھے یقین ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپ میرے عزیز پر توجہ دیں گے۔" عامر نے کہا۔ لڑکی اس کے الفاظ سن ہی رہی تھی' ڈاکٹر سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب تمہیں یقین ہے تو مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو' ایسا کرو تم لوگ ذرا باہر جا کر بیٹھو' میں تھوڑی دیر کے بعد تمہیں بلا لوں گا۔"

ڈاکٹر کے کہنے پر عامر اس لڑکی کے ساتھ باہر نکل آیا' لڑکی ممنون نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی' باہر آکر اس نے کہا۔ "دیکھیے میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں' آپ نے جس طرح میری مدد کی ہے وہ۔۔۔"

"ایک منٹ ایک منٹ' آپ مجھے الفاظ کہہ کر شرمندہ نہ کریں' میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے نہیں' بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سب کچھ کیا ہے۔"

"پلیز' میں آپ کو کیا پیش کروں۔"

"دعائیں۔۔۔ اور سنیے۔۔۔ کرائے وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں' آپ سے درخواست کروں گا کہ میری عزتی نہ کریں' ہاں جب آپ کے والد ٹھیک ہو جائیں تو آپ مجھے مٹھائی کھلا دیجیے گا۔"

لڑکی کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے آنسو چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف کر لیا' عامر ایمرجنسی وارڈ کے باہر تقریباً" دو گھنٹے تک رہا' ڈاکٹر سرمد باہر آئے تو ان کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات تھے' انہوں نے عامر کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور بولے۔

"مریض کی حالت ٹھیک نہیں ہے' ابھی کوئی امید افزا نہیں سنائی جا سکتی' اگر ضرورت ہوئی تو انہیں سی سی یو میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

"جی۔"

"میں چلتا ہوں ذرا مجھے کام ہے' آپ لوگ یہیں رکیں' میں تھوڑی دیر کے بعد آپ کو پھر اطلاع دوں گا اس بارے میں' میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے کہ خدانخواستہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کو باہر اطلاع دی جائے۔" لڑکی بے چین نگاہوں سے عامر اور ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی' عامر واپس پہنچا تو وہ بولی۔

"کیا کیفیت ہے؟"

"بس خدا سے دعا کریں' ویسے میں آپ سے ایک

ت کہوں' اگر آپ کسی کو یہاں اپنے والد کی بیماری
کے بارے میں اطلاع دینا چاہیں تو مجھے ان کا نمبر
دیجئے یا پتا دے دیجئے' میں انہیں آپ کے والد کی
اری کی خبر دے دوں۔"

"ہمارا اس شہر میں کیا پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے
ر جو کوئی ہے تو ہماری موجودہ کیفیت اسی کی کرم
رمائیوں کا نتیجہ ہے۔ میں کسی بھی طرح آپ کو کوئی
کلیف نہیں دینا چاہوں گی۔"

"جیسا آپ پسند کریں' میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آپ
ماں تنہا ہیں۔"

"میں اکیلی تنہا نہیں ہوں' پتا نہیں یہاں کس کس
و ایسی ہی تنہائی مہیا ہے' آپ کس کس کے لیے
مارے تلاش کریں گے؟" وہ آنسو بھری آواز میں
لی۔

"اب میں کیا کہوں آپ کو آپ کی مرضی ہے' میں
س طرح آخر اپنے آپ کو آپ کی مدد کے لیے پیش
کرسکتا ہوں۔"

"یہ کم ہے کہ آپ اس طرح میرے کام آئے
یں۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں' بہت وقت
ضائع ہوگیا ہے آپ کا' براہ کرم میرے پاس تھوڑے
سے پیسے ہیں۔۔۔ آپ۔۔۔"

"دیکھیں' میں نے آپ سے کچھ الفاظ کہے ہیں کہ
یں نے یہ سب کچھ انسانیت کے نام پر کیا ہے' آپ
گر چاہتی ہیں کہ میں چلا جاؤں تو میں چلا جاتا ہوں' خدا
آپ کے والد کو صحت دے' آپ یہاں اسپتال میں
رکیں گی اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کے
والد کی صحت معلوم کرنے کے لیے یہاں چکر
لگالوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں انکار کی بھلا
کیا گنجائش ہے۔"

"اوکے۔" عامر نے کہا اور واپسی کے لیے اتر کر
جانے لگا تو وہ بولی۔

"آپ اپنا نام تو بتاتے جائیں' اگر میں کبھی آپ
سے ملنا چاہوں تو۔۔۔"

"میرا نام عامر ہے' مناسب سمجھیں تو یہ میرا
موبائل نمبر ہے' کسی بھی ہنگامی کیفیت میں اس نمبر پر
رنگ کرلیں میں حاضر ہوجاؤں گا۔" عامر نے ایک کاغذ
پر اپنا موبائل نمبر لکھ کر لڑکی کو دے دیا۔

"اوہ۔۔۔ عامر صاحب' بس میں کچھ بھی نہیں کہوں
گی' میرا نام فضیلہ ہے۔"

"اوکے مس فضیلہ' چلتا ہوں۔" عامر نے کہا اور
واپسی کے لیے مڑ گیا' باہر آکر وہ اپنی ٹیکسی میں بیٹھ گیا'
فوراً" ہی واپس جانے کو دل نہیں چاہا تھا' فضیلہ اگر
اجازت دیتی اور خواہش کا اظہار کرتی تو عامر وہاں رک
جاتا' لیکن زبردستی کسی پر مسلط ہونا بھی مناسب نہیں
تھا اور درحقیقت وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا بھی نہیں' یہ
ٹیکسی ڈرائیوری بڑے پر اسرار معاملات کی حامل
تھی۔

عامر کو اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں
معلوم تھا' ہوش سنبھالا تو ایک قفل ساز کے گھر میں پایا
جس کا نام علی احمد تھا' وہ علی احمد کو چچا کہتا تھا' اپنی ماضی
کی زندگی کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ ماں
اسے جنم دیتے ہی مرگئی تھی اور باپ ماں کی موت کے
بعد ذہنی بیماری کا شکار ہوگیا تھا اور پھر ایک دن وہ عامر کو
اپنے قدیم دوست کی گود میں ڈال کر غائب ہوگیا' علی
احمد کی بھی پانچ بیٹیاں تھیں اس لیے اس نے بھی عامر
کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے بچوں ہی کی طرح پروان
چڑھایا' البتہ علی احمد پر بڑی ذمے داریاں تھیں۔

اپنی بوڑھی ماں سمیت وہ گھر کے نو افراد کو پالتا تھا'
بیوہ بہن اس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔
تالے کی چابیوں بنانے والی اس چھوٹی سی دکان سے گھر
کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے' اس لیے وہ
سائیڈ میں ایک دوسرا بزنس بھی کرتا تھا۔ جس کا تعلق
بھی تالے اور چابیاں بنانے سے تھا' مگر وہ ایسے تالے
کھولتا تھا جو دن میں نہیں رات میں کھولے جاتے تھے
اور علی احمد کو اس کا مناسب معاوضہ ملتا تھا' پتا نہیں علی
احمد عامر کو اس لائن پر لگانا چاہتا تھا یا نہیں' لیکن عامر
باقاعدہ اس کی شاگردی میں آچکا تھا' اسے پرانے زنگ

آلو تالے توڑنے اور کھولنے میں مزا آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بارہ تیرہ سال کی عمر میں وہ ہر قسم کے تالوں کی چابیاں بنانے میں ماہر ہو گیا' اتنا ماہر ہو گیا کہ خود علی احمد بھی اس کے آگے کان کترنے لگا۔ وہ اسے شاباشی دیتا اور کہتا کہ کاش میرے پاس وسائل ہوتے تو میں تجھے پڑھا لکھا کر انجینئر بناتا۔

بہرحال تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا اس نے ضرور شروع کیا تھا' اتفاق ایسا ہوا کہ اسے ایک ایسی کمپنی میں ملازمت مل گئی جو سیف بناتی تھی' پانچ سال تک اس نے اس کمپنی میں ملازمت کی اور ہر قسم کے آہنی تالے اور سیف اس کی نگاہوں سے گزرے' وہ ان سب کی ساخت کو بخوبی ذہن نشین کرتا رہا اور اس نے اپنی ذہانت سے کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے اوزار بنائے جن کی مدد سے دنیا کا کوئی بھی تالا کھولا جا سکتا تھا' وہ ایک ہلکی سی آواز سے پتا لگا سکتا تھا کہ تالا کس قسم کا ہے' لیکن بہت عرصے تک استاد علی احمد نے اسے اپنے بزنس کی ہوا نہیں لگنے دی' وہ مجبوراً یہ کام کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ عامر کے قدم بھی اس جانب اٹھیں۔

ایک دن دکان میں کام کرتے کرتے اچانک انہیں دماغی دورہ پڑا اور اسپتال میں بتایا گیا کہ ان کا آپریشن کیا جائے گا جس کے لیے ایک بہت بڑی رقم خرچ ہوگی۔ عامر کو اس گھر کے حالات اچھی طرح معلوم تھے کسی بھی طرح یہ رقم مہیا نہیں ہو سکتی تھی' علی احمد اسپتال میں تھے اور سب کے سب گھر میں پریشان تھے کہ کسی نے گھر کے دروازے پر دستک دی' یہ علی احمد کا ایک پرانا گاہک تھا اور انہیں تلاش کرتا ہوا یہاں آیا تھا۔ علی احمد کی خراب حالت سے وہ بہت فکر مند ہو گیا اور پھر اس نے کہا۔

"بیٹا' ایک بات کہوں تم سے' علی احمد مجھ سے تمہاری مہارت اور تجربے کاری کے بارے میں بڑی باتیں کرتے تھے اس وقت میں شدید مشکل کا شکار ہوں' اگر میرا کام نہ ہوا تو مجھے بہت بڑا نقصان ہو جائے گا سنو' تم اگر چاہو تو میرا یہ کام کر دو' میں تمہیں اس کے لیے بھاری معاوضہ دوں گا۔"

عامر کو ایک دم علی احمد کی بیماری کا خیال آ گیا اور وہ ان صاحب کے ساتھ چل پڑا' جب وہ واپس آیا تو اس کی جیب میں ایک بھاری معاوضہ موجود تھا' لیکن یہ پیسے علی احمد کے کام نہیں آ سکے اور دوسرے ہی دن ان کا انتقال ہو گیا' لیکن عامر کو ان کی بالائی آمدنی کا پتا چل گیا جس کی مدد سے علی احمد اتنے بڑے کنبے کا خرچ اٹھائے ہوئے تھے' بہرحال ان کے چند لگے بندھے گاہک تھے' عامر نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو حالات تیزی سے بدلنے لگے' راتوں رات امیر بننے کی خواہش بلکہ جنون کسی وبائی مرض کی طرح ان لوگوں کے دل و دماغ میں پھیل چکا تھا اور پھر عامر کی صلاحیتوں کا چرچا ایک سے دوسری زبان پر پہنچا' علی احمد تو یہ تمام تر ذمہ داری اس کے کاندھوں پر رکھ گئے تھے' ان کی بیٹیاں شادی کے قابل ہوتی جا رہی تھیں' عامر اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرتا تھا' پھر اس نے اپنے استاد یا پالن ہار کا کام سنبھال لیا اور اپنی ذہانت سے اپنے کاروبار کے بارے میں سوچنے لگا کہ کس طرح اسے بہترین طریقے سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور اسی سوچ بچار کے نتیجے میں اس نے ایک ٹیکسی خرید لی' وہ اپنے آپ کو نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیکسی چلاتا تھا اور رات کو ضرورت مندوں کے کام آتا تھا' لیکن کچھ اصول اس نے ضرور اپنا لیے تھے۔

اس نے اپنا کام صرف تالے توڑنے اور سیف کھولنے کے لیے ہی محدود کر لیا تھا اور اس کا معاوضہ یہ پیشگی وصول کر لیا کرتا تھا' اپنا کام ختم کرنے کے بعد ایک منٹ بھی جائے واردات پر نہیں ٹھہرتا تھا' باقی کام ان لوگوں کے ہوتے تھے جو یہ کام کراتے تھے' اس کے علاوہ اس نے اپنے تین چار ایجنٹ مقرر کر دیے تھے' جس پارٹی کو بھی اس کی ضرورت ہوتی وہ ایجنٹ سے رابطہ قائم کرتی اور ایجنٹ اس کے بارے میں مکمل اطمینان کرنے کے بعد عامر کو آگاہ کرتا' اس انداز میں کام کرتے ہوئے کئی سال بیت چکے تھے اور اس نے علی احمد کے دیے ہوئے فن کی بھرپور ادائیگی کر دی

تھی۔

ان کی بیٹیوں کے شادی کردی' ان کی بیوہ بہن کے بیٹوں کو کام سے لگادیا اور پھر اس کی ذمہ داری لگا کر وہ خود آزاد ہوگیا' اس نے اپنی سرکر میاں بھی محدود کردی تھیں' بہرحال یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہوگیا تھا' زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی ایسا عمل نہیں تھا جس کی اسے ضرورت محسوس ہوئی ہوتی اور پھر اچانک ہی وہ واقعہ پیش آگیا تھا۔ گھر میں اسے بہت عزت اور محبت حاصل تھی' غرض یہ کہ کافی دیر تک وہ ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اندر موجود فضیلہ کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر وہ شام کو اسپتال پہنچ گیا' ڈاکٹر اقبال تو جاچکے تھے لیکن معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ ہارٹ اٹیک کا جو کیس دوپہر کو آیا تھا' شام کو چار بجے مریض کا انتقال ہوگیا' اس کی بیٹی کے کوئی چچا یا ماما قسم کے عزیز اچانک آئے اور مرنے والے کی لاش اور لڑکی دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے' لیکن عامر فضیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے جس طرح اپنے تنہا ہونے کا ذکر کیا تھا وہ ایسا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی سے اس کے خاص تعلقات نہیں ہیں' البتہ کچھ الفاظ اسے یاد تھے' فضیلہ نے کہا تھا کہ جن لوگوں کی وجہ سے اس کے والد کا یہ حال ہوا ہے بھلا وہ اس کے اپنے کیسے ہوسکتے ہیں۔ کئی دن تک وہ فضیلہ کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس نے اپنے آپ کو دوسرے معاملات میں مصروف کرلیا' نامعلوم کیوں اسے یقین ہوگیا کہ فضیلہ سے اس کی دوبارہ ملاقات ضرور ہوگی اور وہ کسی بھی طور اس کے ذہن سے نہیں نکل پائے گی' البتہ وہ کبھی اس کے گھر نہیں گیا جبکہ اسے اس کا گھر معلوم تھا۔

☆ ☆ ☆

کافی دن اسی طرح گزر گئے اس کے بعد ایک دن صبح کے ناشتے کے بعد وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ کال بیل بجنے کی آواز سنائی دی' باہر نکل کر دیکھا تو ایک خوب صورت لڑکی ہلکے میک اپ اور نفیس کپڑے پہنے ہوئے دروازے پر موجود تھی۔

"جی فرمائیے۔" عامر نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے مسٹر عامر سے ملنا ہے۔"

"فرمائیے کیا بات ہے؟"

"میں اپنے بارے میں آپ کو بتاؤں میں دشمن نہیں دوست ہوں اور آپ کی طلب گار ہوں' بڑی مشکل سے مجھے آپ کا پتا چلا ہے' میں جس پریشانی کا شکار ہوں اس میں صرف آپ ہی میری مدد کرسکتے ہیں۔"

"میں نہیں جانتا کہ آپ مجھ سے کس طرح کی مدد چاہتی ہیں' آئیے اندر آجائیے۔" عامر نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور لڑکی اندر آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ کو میرے اچانک آجانے سے حیرت ہوئی ہوگی' آپ کے طریقہ کار کے مطابق میرے بھائی نے کل شام کا وقت دیا تھا' لیکن میرے لیے یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ایک دن کی تاخیر بھی نقصان دہ ہوسکتی ہے' اس لیے آپ کا پتا معلوم کرکے میں خود آپ کے پاس آگئی۔

"جی جی' آگے فرمائیے۔"

"میرا نام فضیلہ ہے۔" اس نے کہا اور اچانک ہی میرا دل دھک سے ہوگیا' اس نے اچانک ہی فضیلہ کی یاد میرے دل میں تازہ کردی تھی' لڑکی بولی۔

"میرے والد ایک ماہر سائنسداں تھے اور وہ کینسر کے علاج کے لیے کام کررہے تھے' ہم لوگوں کی مالی حالت کافی بہتر تھی' لیکن پاپا نے اپنی تمام جائیداد اور بینک بیلنس اپنی ریسرچ میں خرچ کردیا' وہ شاید اپنے کام میں کافی حد تک کامیاب ہوگئے تھے' لیکن سرمایہ ختم ہونے کے بعد وہ تحقیقات جاری نہیں رکھ سکے' انہیں مدد کی ضرورت تھی' انہوں نے کئی سرکاری اداروں سے رجوع کیا مگر کسی کو ان کی مدد کرنے کی توفیق نہ ہوئی' میرے ایک سوتیلے تایا اس شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں' کروڑ پتی آدمی ہیں' پاپا ان کے

پاس گئے اور ان سے تعاون کی خواہش ظاہر کی' حمید صاحب پکے بزنس مین ہیں' انہوں نے پاپا کی مدد تو کی لیکن اس معاہدے کے تحت پاپا کو اس وعدے کا پابند کردیا کہ اگر وہ دوا بنانے میں کامیاب ہوجائیں تو اسے تجارتی پیمانے پر تیار کرنے کا حق صرف حمید صاحب کو ہوگا' پاپا کو اپنی ریسرچ کے مادی پہلو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ تو انسانیت کی خدمت کے جذبے کے تحت کام کررہے تھے' انہوں نے کسی تامل کے بغیر معاہدے پر دستخط کردیئے اور حمید صاحب نے انہیں مالی مدد دی' لیکن ساتھ ہی یہ تقاضا بھی کیا کہ وہ اپنی ریسرچ کے تمام تحریری کام کی ایک نقل انہیں بھی فراہم کرتے رہیں گے۔"

"جی پھر۔" عامر کو اب اس کہانی میں کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

"میرے پاپا کی محنت بار آور ہوئی اور تقریباً" تین ہفتے قبل وہ ایک ایسی دوا کا فارمولا تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جو کینسر کے علاج کے لیے انتہائی شاندار تھی ان کا کہنا تھا کہ اگر اس کی مزید ریسرچ کرلی جائے تو یہ ہر قسم کے کینسر کا علاج کرسکتی ہے' لیکن افسوس قدرت نے انہیں مزید مہلت نہ دی ایک صبح ان کو لیبارٹری میں کام کے دوران دل کا دورہ پڑا اور وہ چند گھنٹوں کے اندر انتقال کرگئے۔"

"جی لیکن آپ نے مجھے ابھی تک اصل بات نہیں بتائی۔" عامر نے کہا۔

"پاپا کی انتقال کی خبر پاتے ہی حمید صاحب نے ہمارے گھر میں واقع لیبارٹری میں موجود ہر قسم کے کاغذات قبضے میں کرلیے' ان میں ظاہر ہے وہ کاغذات بھی تھے جن پر پاپا نے تمام فارمولے نوٹ کررکھے تھے' اب وہ تمام ریسرچ کے نوٹس اور دوا کا صحیح فارمولا حمید صاحب کے بیڈ روم میں اس آہنی سیف میں بند ہے اور مجھے علم ہوا ہے کہ دوا کا وہ فارمولا وہ ایک غیر ملکی کمپنی کے ہاتھوں فروخت کرنے کی کوشش کررہے ہیں' جبکہ آپ جانتے ہیں کہ میرے اپنے وطن کو بھی اس کی ضرورت ہے اور وہ فارمولا اب حقیقتاً" میری ملکیت ہے' حمید صاحب زیادہ سے زیادہ اس دوا کی تیاری کا حق رکھتے ہیں اور اس سے ہونے والی آمدنی میں وہ برابر کے حقدار بے شک ہوں گے' لیکن جو کچھ وہ کررہے ہیں وہ بہت سنسنی خیز ہے' انہیں اس فارمولے کو فروخت کرنے کا ہرگز کوئی اختیار نہیں ہے' اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ ان کے سیف سے وہ تمام کاغذات جو ایک نیلے رنگ کے لفافے میں بند ہیں نکال کر مجھے لادیں' میں آپ کو اس محنت کا کوئی بڑا معاوضہ ابھی نہیں دے سکتی' لیکن پھر بھی میں ایک لاکھ روپے آپ کو پیش کرسکتی ہوں اور فارمولا اگر تیار ہوگیا تو میں آپ کو مزید دس لاکھ روپے ادا کروں گی۔"

"ہوں۔" عامر سوچ میں ڈوب گیا' پھر بولا' تھوڑا مجھے علم ہے اس بارے میں آپ غالباً" پروفیسر ڈاکٹر رشید صاحب کی صاحبزادی ہیں۔"

"جی... حیرت کی بات ہے آپ انہیں جانتے ہیں۔"

"اور آپ کا کہنا ہے کہ میں آپ کے لیے وہ فارمولا چوری کروں۔"

"اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے۔"

عامر سوچ میں ڈوب گیا' پھر اس نے کہا "لیکن اس وقت آپ لوگ کہاں رہائش پذیر ہیں؟"

"ہم لوگ ہوٹل پلٹن میں موجود ہیں' وہاں ایک کمرہ ہم نے لیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کے کام کے لیے تیار ہوں۔" کام پورا ہونے پر ان کی ملاقات کے لیے منتخب کرلی گئی۔ پھر لڑکی چلی گئی' لیکن عامر سوچتا رہا۔ اپنی جانب سے بے حد ذہین بننے کی کوشش کررہی اسپتال میں اس نے کہا تھا کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے' اب اچانک اس کا بھائی بھی سامنے آگیا ضرور کوئی گڑبڑ ہے' عامر نے سوچا پھر وہ ایک منصوبے کے تحت ہوٹل پلٹن کی جانب چل پڑا۔ ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اس نے ایک سنسان کونے میں ٹیکسی روکی اور ہوٹل کی نگرانی کرتا رہا اور پھر اس نے اندازے کے مطابق لڑکی اور اس کے دو ساتھی شام

سات بجے ہوٹل سے نکلے تھے۔ تقریباً" آدھے گھنٹے تک عامر نے انتظار کیا' پھر ساتھ لایا ہوا پیکٹ ہاتھ میں لیا اور ٹیکسی سے اتر کر چل پڑا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے کہا۔

"جناب مس فضیلہ اور ان کے بھائی یہاں اس ہوٹل میں مقیم ہیں' یہ ان کا ایک پیکٹ میری گاڑی میں گر پڑا ہے' جس پر مس فضیلہ کا نام لکھا ہے' میں یہ پیکٹ ان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"لائیے مجھے دے دیجئے' میں پہنچا دوں گا۔" کاؤنٹر کلرک نے کہا۔

"نہیں جناب میری ٹیکسی میں گرا ہے یہ میں ہی انہیں واپس کروں گا۔" آصف نے کہا اور کاؤنٹر کلرک مسکرانے لگا۔

"انعام وغیرہ کے چکر میں ہو گے دوست' چلو ٹھیک ہے جاؤ۔ شاید کچھ انعام مل بھی جائے' وہ کمرا نمبر دو سو دس میں ٹھہرے ہیں' دوسری منزل ہے۔"

عامر نے کاؤنٹر کلرک کا شکریہ ادا کیا اور زینے کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچا' کمرا نمبر دو سو دس دیکھا' راہداری سنسان تھی' چند لمحوں کے اندر اس نے اس کمرے کے دروازے کے قفل کا جائزہ لیا' کوئی خاص نہیں تھا' آسانی سے اسے کھولا جا سکتا تھا اور وہ بھی عامر جیسے آدمی کے لیے جس کے لیے ایسے کام مشکل نہیں ہوتے تھے' اس نے کمرے کی تھوڑی سی تلاشی لی اور کچھ اہم معلومات مل گئیں' پھر اس نے وہ پیکٹ ایک مخصوص جگہ رکھا اور واپس لوٹ آیا' واپسی میں کسی نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور وہ ہوٹل سے واپس اتر کر اپنی ٹیکسی میں آ بیٹھا' ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔

شام ہونے سے پہلے اس نے بی ایس سی اور ایم ایس سی کی کیمسٹری کے پریکٹیکل کی کتابیں خریدیں ان میں عملی تجربات کے جتنے طریقے' فارمولے' نقشے اور دوسری چیزیں دی گئی تھیں' ان سب کی دو دو فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اتروائیں اور اپنے ایک دوست کے ذریعے ایم ایس سی کے ایک سابقہ طالب علم کے پریکٹیکل نوٹس اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حاصل کیے اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک مناسب سائز کا لفافہ جس کا رنگ نیلا تھا دیا اور تمام کاغذات کا ایک سیٹ اس لفافے میں رکھ کر اپنی ٹیکسی کی ڈکی میں محفوظ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

رات کو ساڑھے بارہ بجے وہ اپنی ٹیکسی لے کر شکار پر نکلا' ایسے مواقع پر استعمال کرنے کے لیے اس کے پاس کئی ایسے مختلف فرضی نمبر پلیٹیں موجود رہتی تھیں' ان میں سے ایک نمبر پلیٹ ٹیکسی پر لگائی اور آگے بڑھ گیا' پھر اس کا رخ اس علاقے کی جانب ہو گیا جہاں حمید صاحب کا بنگلہ واقع تھا' لڑکی نے اسے بتایا تھا کہ یوں تو حمید صاحب کے بنگلے میں بہت سے افراد رہتے ہیں جن میں ان کی بیوی ایک بڑا لڑکا اور اس کی بیوی معہ دو بچوں کے اور ایک نوجوان بیٹی شامل ہیں' لیکن آج کل یہ سب کلفٹن منانے کے لیے شمالی علاقے گئے ہوئے ہیں اس لیے رات کے وقت حمید صاحب گھر میں بالکل اکیلے ہوتے ہیں' دو تین ملازم بے شک ہیں مگر ان کے لیے بنگلے کے پچھلے حصے میں سرونٹ کوارٹر بنے ہوئے ہیں' چوکیدار بھی ہے لیکن اس کی عادت ہے کہ رات کو بنگلے کے گیٹ پر چارپائی ڈال کر آرام سے سو جاتا ہے اس لیے تقریباً" ایک بجے کے وقت اسے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی' سوائے اس کے کہ بنگلے کی چار دیواری کو جو ایسی زیادہ اونچی نہیں ہے پھلانگنا پڑے گا۔ لڑکی نے تمام معلومات فراہم کر دی تھیں اور عامر کو کہیں بھی کوئی ایسی دقت پیش نہیں آئی جو ناواقفیت کی بنا پر ہوتی ہے' حالات قدم بہ قدم درست ہوتے گئے۔ ٹیکسی ایک سائیڈ اسٹریٹ پر کھڑی کر کے اس نے گیٹ کی ایک جھری سے جھانک کر دیکھا تو چوکیدار سچ مچ سویا ہوا نظر آیا چنانچہ عامر بغیر کسی مشکل کے چار دیواری پھلانگ گیا' بنگلے کا اندرونی نقشہ بھی لڑکی نے بہت وضاحت کے ساتھ بتا دیا تھا اور پھر چند ہی لمحات کے

بعد عامر حمید صاحب کے بیڈ روم میں کھڑا تھا' البتہ اس قسم کی واردات کا یہ پہلا موقع تھا جس میں اسے تجوری یا سیف کھولنے کے علاوہ کوئی چیز چرانی بھی تھی' عامر بہت محتاط تھا اور تمام تر ضروری انتظامات کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے احتیاط کے ساتھ جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی اسے رومال پر چھڑکا اور اسے آہستہ سے حمید صاحب کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ اتنی غفلت کی نیند سو رہے تھے کہ کلوروفارم کی تیز بو بھی انہیں بیدار نہیں کر سکی اور چند سیکنڈ کے اندر ان کی گہری نیند بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی۔

عامر نے چند لمحے انتظار کیا اور اس کے بعد ہلا جلا کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ وہ بے ہوش ہو چکے ہیں اس کے بعد وہ آہنی سیف کی طرف متوجہ ہوا جو بیڈ روم کی مغربی دیوار میں نصب تھا' وہ نمبروں والا سیف تھا اور کافی اچھی کوالٹی کا تھا' اپنے تمام ضروری اوزاروں کے بکسے اور تجربے کے باوجود آصف کو اس کا کمبی نیشن معلوم کرنے میں تقریباً" بیس منٹ صرف ہو گئے۔ سیف کھلا تو اندر قطار در قطار رکھتے ہوئے کرنسی نوٹ سب سے پہلے نظر آئے' لیکن اس وقت اس نے نوٹوں پر توجہ نہیں دی اور اپنی مطلوبہ شے تلاش کرنا شروع کر دی جو اسے سیف کی نچلی دراز میں مل گئی' ایک نیلا لفافہ جو تقریباً" ایک فٹ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا تھا' اس نے اسے کھولا اور اندر رکھے ہوئے تمام کاغذات جو کچھ ایسے زیادہ بھی نہیں تھے' بڑی احتیاط سے تہہ کر کے اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیے اور اسی جیب میں سے اس نے اپنے تیار کردہ کاغذات کا دوسرا سیٹ نکالا اور اس نیلے لفافے میں رکھ دیا اور جس طرح وہ بند تھا اسی طرح بند کیا اور پھر بالکل اسی انداز میں واپس دراز میں رکھ دیا۔ سیف بند کیا تالے کا ڈائل ادھر ادھر گھما کر اسے دوبارہ مقفل کر دیا' گویا اس کے کام کا ایک مرحلہ ختم ہو چکا تھا' وہ جس طرح بنگلے میں داخل ہوا تھا اسی طرح بنگلے سے باہر نکل آیا' اپنی ٹیکسی میں بیٹھا اور پر اطمینان انداز میں گھر واپس پہنچ گیا۔

یہ تمام کارروائی اس نے بڑی احتیاط سے کی تھی' یہاں تک کہ ہاتھوں میں دستانے بھی پہن رکھے تھے کہ کہیں اس کی انگلیوں کے نشانات وہاں نہ رہ جائیں' باقی سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔

اگلے دن رات کے ٹھیک دس بجے وہ ایک اور لفافے میں اپنے بنائے ہوئے کاغذات کے پہلے سیٹ کے ساتھ وہاں موجود تھا جہاں کے لیے لڑکی نے اس سے وعدہ کیا تھا' اس نے ٹیکسی ایک جانب کھڑی کر دی اور ٹیکسی کے باہر کھڑے ہو کر اس لڑکی کے آنے کا انتظار کرنے لگا' اسے اپنے تیار کردہ لفافے کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ لڑکی اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے تمام دعووں کے باوجود نہیں پہچان سکے گی۔ البتہ اس بات کا عامر کو یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی اور یہی ہوا وہ دس بجے کے قریب مطلوبہ جگہ پہنچ گئی' لیکن اکیلی نہیں تھی' اسی نوجوان کے ساتھ وہ دوسری ٹیکسی میں تھی جسے نوجوان خود چلا رہا تھا' اپنی ٹیکسی سڑک کے دوسری سائیڈ کھڑی کر کے وہ دونوں عامر کی طرف آتے ہوئے نظر آئے اور آخر کار اس کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ میری وہ بھائی ہیں جن کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا پھر جلدی سے بے صبری کے انداز میں بولی۔ "آپ مجھے بتائیے کہ آپ کامیاب رہے یا ناکام۔؟"

"میں جس کام میں ہاتھ ڈالوں اس میں ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" عامر نے سادگی سے کہا۔

"ارے واہ تو پھر لائیے کہاں ہے وہ نیلا لفافہ؟" لڑکی بے ساختہ بولی اور عامر نے گاڑی کی کھلی کھڑکی سے اندر ہاتھ ڈالا' لفافہ اس نے اگلی سیٹ پر رکھ دیا تھا چنانچہ اسے وہاں سے اٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ ہے آپ کی امانت۔" اس نے کہا' لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا' اس نے یا اس کے ساتھی ہیرو نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک عام اور معمولی سے معمولی چور اس وقت لفافہ دینے کے بجائے یہ مطالبہ کرتا کہ پہلے اس کا معاوضہ ادا کر دیا جائے' مگر عامر نے

ایسا نہیں کیا' سوچنا تو چاہیے تھا اسے کہ وہ اتنا مطمئن کیوں ہے۔

"بہت بہت شکریہ۔۔۔" لڑکی کی مسکراہٹ اب اور گہری ہوگئی تھی' "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔

"اس میں احسان کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" عامر نے سرسرے لہجے میں کہا۔ "کوئی بھی مناسب معاوضے کے عوض میری خدمات حاصل کرسکتا ہے اور اب یقیناً" آپ میرا معاوضہ مجھے ادا کردیں گی" نوجوان نے اس طرح کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا جیسے وہ رقم نکال رہا ہو' لیکن جب اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک چھوٹا سا ریوالور سائلنسر لگا ہوا موجود تھا' اسی وقت لڑکی نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے افسوس ہے' مگر میں کیا کرتی' میرے پاس ایک لاکھ روپے کا بندوبست نہیں ہوسکا تھا' اس لیے معافی چاہتی ہوں میں آپ کو رقم ادا نہیں کرسکتی' یہ سمجھ لیجئے کہ آپ نے زندگی میں ایک مرتبہ کسی کے لیے کوئی بلا معاوضہ کام بھی کیا تھا۔ اسی لیے میں آپ کی اس خدمت کو احسان کہہ رہی تھی۔"

"مجھے انتہائی افسوس ہے کہ آپ ایک شریف اور معزز انسان کی بیٹی ہیں' لیکن آپ اس طرح دھوکے بازی کریں گی اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا' اصل میں وہی بات ہے کہ اصول توڑنے کا کوئی نہ کوئی صلہ تو ملنا چاہیے۔" عامر کے لہجے میں جیسے مایوسی تھی۔

"بہت بھولے بھالے سیدھے سادے آدمی ہیں آپ عامر صاحب۔" لڑکی کے لہجے میں طنز تھا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ جس پیشے سے متعلق ہیں اس میں کوئی ایسا احمق بھی ہوسکتا ہے' سمجھ رہے ہیں نا آپ' میں کسی رشید کی بیٹی نہیں ہوں اور نہ ہی میرا نام فضیلہ ہے' بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ فضیلہ واقعی ان کی بیٹی ہے' وہ میری سہیلی بھی ہے سمجھے آپ' مجھے اسی کی زبانی معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پروفیسر صاحب کسی سلسلے میں ریسرچ کررہے ہیں اس ریسرچ میں کامیابی کی خبر بھی مجھے اس کی زبانی ملی تھی اور وہ تمام باتیں جو میں نے آپ کو بتائیں حمید صاحب کے بارے میں' ان کے گھر کے بارے میں' ان کے سیف اور لفافے کے بارے میں یہ سب باتیں بھی مجھے فضیلہ ہی سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں ایک ایسے غریب خاندان کی لڑکی ہوں جو زندگی بھر دولت مند بننے کا خواب دیکھتی رہتی ہے' میں اپنے خواب پورے کرنے کے اس سنہری موقع فائدہ نہ اٹھاتی تو مجھ سے بڑا بے وقوف اور کوئی نہ ہوتا۔"

عامر نے ایک گہری سانس لی اور بولا "ہاں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میڈم' آپ کا جو بھی نام ہے' واقعی بعض اوقات ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔ خاص طور سے اگر فریب دینے کے لیے کسی خوب صورت لڑکی کا استعمال کیا جائے' آپ جو کوئی بھی ہیں آپ نے وعدہ خلافی کرکے اچھا کام نہیں کیا ویسے مجھے اندیشہ ہے کہ اپنی اس کامیابی کے باوجود آپ اس قیمتی دریافت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گی۔"

"اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔" لڑکی نے ایک سریلا قہقہہ لگایا' "اس کا انتظام ہم نے پہلے ہی کرلیا ہے' ہم یہاں سے سیدھے اس جگہ جارہے ہیں جہاں ہمیں اس فارمولے کی خریداری کے لیے اس کے نمائندوں سے ملنا ہوگا اور ہمارا یہ معاملہ پہلے سے طے ہے۔"

"اب تم بے کار باتوں میں وقت کیوں ضائع کررہی ہو؟" نوجوان نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "وہ لوگ ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔"

"اچھا مائی ڈیئر مسٹر عامر' اب اجازت چاہتی ہوں مجھے توقع ہے کہ آپ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے یہ ملاقات کسی تکلیف دہ حادثے پر ختم ہوجائے۔"

لڑکی لفافہ سنبھالے ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی' نوجوان بڑے محتاط انداز میں عامر کو ریوالور کی زد میں لیے ٹیکسی میں بیٹھا پھر ریوالور لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا اور لڑکی اس وقت تک ریوالور عامر کی طرف تانے

رہی جب تک نوجوان ٹیکسی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے نہیں بڑھ گیا' لیکن عامر کو اس موقع پر کوئی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی' جو کچھ کرنا تھا وہ پہلے ہی کر چکا تھا اور جو کچھ کرنا باقی تھا اس کے لیے وہ دونوں اسے کافی مہلت دے گئے تھے' وہ حسین لڑکی یہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے عامر کو بے وقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کر لیا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ احمق خود بنائی گئی ہے' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غضب کی اداکارہ تھی اور بہت ممکن تھا کہ عامر اس کی باتوں میں آجاتا' وہ بے شک اس کی گفتگو سے متاثر ہوا تھا مگر صرف اس وقت تک جب تک اس نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا' جیسے ہی اس نے کہا کہ وہ مشہور بزنس مین حمید کی بھتیجی ہے عامر نے سمجھ لیا کہ وہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے کیونکہ ناشتا کرتے ہوئے وہ اخبار پڑھ رہا تھا' اس کے اندرونی صفحات پر ایک چھوٹی سے خبر کسی لڑکی فضیلہ کے بارے میں تھی۔

وہ لڑکی حمید صاحب کی بھتیجی تھی اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسے بازار سے گھر آتے ہوئے کچھ نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا ہے' چنانچہ وہ اطمینان سے اپنی ٹیکسی میں بیٹھا اور اس ہوٹل کی جانب چل پڑا' ہر چند کہ یہ اس کی لائن نہیں تھی لیکن آخر کار وہ جرائم پیشہ طبقے میں ہر نوعیت اور ہر شعبے کے افراد سے کسی نہ کسی حد تک واقف تھا' چنانچہ اس نے دن میں پوری کوشش کے بعد اپنے ایک ایجنٹ کے توسط سے تقریباً" آدھا کلو چرس حاصل کر لی تھی جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی' وہ لڑکی ہی سہی لیکن وہ اسے سزا دیے بغیر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اب اس انکشاف کے بعد کہ وہ فضیلہ کی سہیلی تھی اسے اپنا یہ فیصلہ درست بھی لگ رہا تھا۔

ہوٹل کے ایک سائیڈ میں ٹیکسی کھڑی کر کے اس نے بریف کیس اٹھایا' ٹیکسی لاک کی اور بڑے پراعتماد انداز میں اندر داخل ہو گیا' وہ اس وقت بہترین لباس میں ملبوس تھا' اطمینان سے چلتے ہوئے وہ لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچا' راہداری میں اکا دکا افراد آجا رہے تھے' اس نے ان کی پروا کیے بغیر جیب سے اپنا مخصوص اوزار نکالا اور کمرہ نمبر دو سو دس کے تالے میں اس طرح ڈالا جیسے کوئی چابی لگاتا ہے' ہاتھ کی ذرا سی ادھر ادھر کی جنبش اور ہلکی سی کلک نے بتا دیا کہ رکاوٹ دور ہو چکی ہے' چنانچہ دروازہ کھول کر اس نے اندر قدم رکھا' بتی جلائی اور اندر سے چٹخنی لگا دی۔

دونوں کا سامان بہت مختصر تھا' صرف دو درمیانے سائز کے سوٹ کیس' اس نے نوجوان کا سوٹ کیس کھول کر چرس کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں تہ میں بچھا دیں' اوپر سے تمام کپڑے رکھے اور سوٹ کیس بند کر دیا' پھر اطمینان سے اٹھا' بتی گل کی اور کمرے سے باہر نکل آیا' اس وقت راہداری بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی' ٹیکسی میں آکر بیٹھا اور گھڑی دیکھی تو گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے' عامر کا اندازہ تھا کہ اگر وہ واقعی کسی غیر ملکی کمپنی کے نمائندے سے ملنے گئے ہیں تو یہ انکشاف ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے کہ لفافے کے کاغذات ردی پیپر سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے اور یہ پتا چلنے کے بعد کہ وہ عامر کو اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش میں خود احمق بن گئے ہیں ان دونوں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ انتقاماً" وہ عامر کے گھر پر چڑھ دوڑیں گے' ممکن ہے لڑکی کوئی دوسرا بہانہ سوچنے کی کوشش کرے' وہاں سے ان کا ہوٹل سیدھے واپس آنا زیادہ قرین قیاس تھا اور عامر کے اندازے کے مطابق انہیں زیادہ سے زیادہ ساڑھے گیارہ بجے تک اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہوٹل کے ایک حصے میں پبلک ٹیلی فون بوتھ بنے ہوئے تھے۔

ایک بوتھ میں داخل ہو کر اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر کے نارکوٹکس کنٹرول ڈیپارٹمنٹ میں فون کیا' دوسری طرف سے رابطہ ہوا تو اس نے اطلاع دی کہ فلاں ہوٹل کے کمرہ نمبر دو سو دس میں ایک نوجوان جوڑا چرس کی تجارت میں ملوث ہے چھاپہ مارا جائے تو اس کے پاس سے چرس برآمد کی جا سکتی ہے' اتنا کہہ کر اس سے پہلے کہ دوسری طرف سے سوالات کیے جائیں

اس نے ریسور کریڈل میں ٹانگ دیا اور وہاں سے باہر نکل آیا' بہتر یہی تھا کہ کسی گوشے میں کھڑے ہو کر پولیس کی آمد کا انتظار کیا جائے' چنانچہ وہ انتظار کرتا رہا۔

پولیس حسب معمول وہاں نہیں پہنچی تھی' لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے لڑکی اور اس نوجوان کو اندر آتے ہوئے دیکھا ان کے چہرے عجیب سی کیفیتوں کا شکار تھے' عامر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ابھی کیا ہے بچو' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پھر بوتھ میں داخل ہو کر کریڈل سے ریسور اتارا اور کمرہ نمبر دو سو دس کا نمبر ڈائل کرنے لگا' کچھ ہی لمحوں کے بعد دوسری طرف سے فون ریسو کر لیا گیا۔

"جی محترمہ کتنے میں سودا ہوا؟"

"تم۔۔۔" لڑکی چونکی پھر سنبھل کر بولی۔ "مسٹر عامر! آئی ایم سوری' میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی' مجھے اس کی سزا مل گئی۔

"ابھی کہاں ڈارلنگ ابھی کہاں۔" عامر نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے مجھے نہیں اپنی عزیز سہیلی کو بھی دھوکا دیا' بلکہ اس کے ساتھ غداری کی' جو حق اس کا تھا اسے فراڈ کر کے حاصل کیا اس کی سزا ابھی آپ کو ملے گی میڈم۔"

"دیکھو جھگڑا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں' تم جانتے ہو کہ اس سلسلے میں تم سے بھی پوچھا جا سکتا ہے' بتاؤ اصل لفافہ کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے۔" عامر نے جواب دیا۔

"سودا کرو گے اس کا۔"

"نہیں بالکل نہیں' وہ اصل فضیلہ کا حق ہے اور اسی کو ملنا چاہیے۔"

"میں تمہارے بارے میں پولیس کو بتا سکتی ہوں۔"

"ہاں ضرور مگر اس کے لیے تمہیں پولیس کے سامنے یہ بیان بھی دینا پڑے گا کہ تم میرے پاس آئی تھیں۔۔۔" ابھی میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اچانک ہی پولیس کے کئی افراد اندر داخل ہوئے اور تیزی سے اوپر جانے والے زینوں کی جانب بڑھ گئے' عامر مسکراتا ہوا واپسی کے لیے پلٹا۔ لیکن پھر رک کر اس نے بوتھ کے ریسور سے اپنے ہاتھوں کے نشانات مٹائے' ظاہر ہے یہ پتا چل سکتا تھا کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ باہر نکل آیا۔

بہت کچھ سوچنے کے لیے موجود تھا آگے کے اقدامات کے بارے میں بھی کہ لڑکی کی طرف سے کیا کیا کارروائی ہو سکتی ہے اسے محفوظ رہنا تھا' لیکن وہ مکمل طور پر محفوظ تھا چونکہ ابھی تک پولیس کے ریکارڈ میں اس کا کوئی نام پتا نہیں تھا اور وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے باعزت روزی کمانے والا شمار کیا جا سکتا تھا پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال کلک کر گیا اور وہ ایک دم سے بے چین سا ہو گیا جس فضیلہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی کہیں وہی تو پروفیسر کی بیٹی نہیں تھی یعنی حمید صاحب کی بھتیجی' یہ تو بڑی سنسنی خیز بات ہوتی' کچھ کرنا ہو گا' وہ دن عامر نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارا' اصل حقیقت جاننے کا خمار اس پر سوار تھا چنانچہ دوسری شب اس نے حمید صاحب کے گھر کا دوبارہ دورہ کیا وہاں تمام حالات معمول کے مطابق تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حمید صاحب پر لفافے کے کاغذات تبدیل ہونے کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ وہ مختلف کمروں کا جائزہ لینے کے بعد ایک ایسے کمرے میں پہنچا جس میں فضیلہ کا قیام ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں کپڑوں کی الماری میں اس نے وہ لباس بھی دیکھا جو فضیلہ نے اس دن پہن رکھا تھا مزید تلاش کرنے سے اس کا اور اس کے والد کا ایک فوٹو بھی مل گیا' اب کسی شک کی گنجائش نہیں تھی' حمید صاحب خیریت سے ہسپتال پہنچے اور فضیلہ کو اپنے ساتھ لے آئے' مگر وہ بڑے سنگدل اور بے ضمیر انسان لگتے تھے کہ انہوں نے سوتیلے بھائی کی دریافت سے خود ہی فائدہ اٹھانا چاہا عامر کو شک تھا کہ فضیلہ کے اغوا میں

کسی نہ کسی طرح حمید صاحب کا ہاتھ بھی ضرور ہے۔ اب اس کے سامنے ایک باقاعدہ لائن تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ حقیقت تھی کہ اس دن فضیلہ سے ملاقات نے اس کے دل پر بہت سے اثرات چھوڑے تھے اور وہ فضیلہ سے متاثر ہو گیا تھا' زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی' چنانچہ اگر فضیلہ کے لیے تھوڑی سی کوشش کرلی جائے تو فائدہ بھی ہوگا' دوسری دن اس نے اپنے ایجنٹوں کے توسط سے جرائم کے انڈر گراؤنڈ حلقوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہاں کسی کو فضیلہ کے اغوا کے بارے میں کچھ معلوم ہے یا نہیں' چار پانچ دن کی مسلسل کوشش کے بعد اسے بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہو گئیں' پتا چلا کہ ایک گروہ جس کا سردار شانی نامی ایک غنڈہ ہے لڑکیوں اور عورتوں کی تجارت کرتا ہے' حسین لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کرکے یا ورغلا کر انہیں اندرون ملک بڑے بڑے عیاش وڈیروں اور جاگیرداروں کے حوالے کر دیتا ہے یا غیر ممالک میں اسمگل کرکے بیرونی منڈیوں میں ان کا سودا کیا جاتا ہے' عامر کو یہی بتایا گیا کہ فضیلہ کے اغوا میں نہ صرف شانی کا ہاتھ ہے بلکہ اس نے اس لڑکی کو بطور خاص اپنے ایک خفیہ مکان میں قید کر رکھا ہے اور یہ کہ یہ اغوا اس نے خود نہیں کیا اس سے کرایا گیا ہے کیونکہ اس سے اسے دہرے فائدے کی امید ہے' اغوا کے لیے بھی اس نے بڑی رقم وصول کی ہے اور اب اسے کسی دولت مند کے ہاتھوں فروخت کرنے کا سودا کر رہا ہے' اس سے بھی اسے موٹی رقم ملنے کی امید ہے' سودا اب تک ہو گیا ہوتا' لیکن قیمت ملنے کے لالچ میں شانی انتظار کر رہا ہے کیونکہ لڑکی کافی خوب صورت ہے' یہ قیمتی معلومات حاصل کرنے کے لیے عامر کو خاصی رقم خرچ کرنا پڑی تھی' مگر وہ اسے گراں نہیں سمجھ رہا تھا' خاصی رقم اس لیے خرچ کی تھی کہ اسے اس مکان کا پتا بھی بتا دیا گیا تھا جہاں فضیلہ کو قید رکھا گیا تھا۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ ممکن ہے اس دن جو لڑکی اتفاق سے اسے ملی تھی اور جس کے لیے اس نے تھوڑا سا کام کیا تھا وہ فضیلہ ہی ہو عامر کے دل میں اور بھی بہت سی باتیں آئی تھیں۔ وہ لڑکی ممکن ہے واقعی اس کی مدد کی محتاج ہو' زندگی میں اپنے لیے ہی نہیں' دوسروں کے لیے بھی بہت کچھ کیا تھا اور اب اگر اس لڑکی کو اس کی مدد کی ضرورت ہے تو پھر کیوں نہ ایک باقاعدہ کھیل کھیلا جائے وہ اپنا ذہن دوڑاتا رہا اور پھر اس نے کچھ تیاریاں کیں' پھر ان تیاریوں کے بعد وہ شام کے وقت ایک مائیکرو کیسٹ ریکارڈر جیب میں رکھ کر حمید صاحب سے ملنے ان کے بنگلے پہنچ گیا' اس نے چوکیدار کے ذریعے کہلوایا کہ وہ ایک انتہائی اہم معاملے میں چند منٹ کے لیے بات کرنا چاہتا ہے' حمید صاحب نے اسے فوراً بلا لیا۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم ہی میں موجود تھے جب عامر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا انہوں نے گہری نگاہوں سے عامر کا جائزہ لیا اور بولے۔

"جی کون ہیں آپ اور کس اہم مسئلے پر مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میرا نام شاداب ہے اور مجھے شانی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

شانی کا نام سن کر حمید صاحب بری طرح چونکے اور پھر سنبھل کر بولے۔ "کون شانی' میں نہیں جانتا اس نام کے کسی آدمی کو۔"

"بے شک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں دو ہفتے قبل آپ اسے نہیں جانتے تھے اور ویسے بھی ایک بار ہی ملاقات ہوئی ہے اس لیے شاید آپ کو یاد نہیں رہا' خیر میں عرض کرتا ہوں آپ کو ضرور یاد آجائے گا' شانی وہ آدمی ہے جس کے ذریعے آپ نے اپنی بھتیجی فضیلہ کو اغوا کرایا ہے۔"

حمید صاحب خاموش رہے' لیکن ان کی آنکھیں اسے بری طرح گھور رہی تھیں وہ یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ کیا واقعی یہ شانی کا بھیجا ہوا کوئی شخص ہے' پھر انہوں نے کہا کہا۔

"کیا بکواس کررہے ہو۔۔۔" عامر نے ان کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور بولا۔

"دیکھیے آپ کا وقت بھی قیمتی ہے اور میرا بھی' اگر آپ کو شانی سے واقفیت اور اس لڑکی کے اغوا کے بارے میں کچھ جاننے سے انکار ہے تو میرا اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے' صاحب سے کہہ دوں گا کہ آپ نے بات کرنے سے انکار کردیا۔"

حمید صاحب کے چہرے پر اضطراری کیفیت پیدا ہوگئی تھی' آخر کار انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ "کہنے کیا آئے تھے تم؟"

"شانی نے کہا ہے کہ اغوا وغیرہ کی بات اور تھی' لیکن وہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔"

"لیکن اب وہ کیا چاہتا ہے؟"

"سودا۔"

"اوہ تو تمہارا صاحب بلیک میلر بھی ہے' بولو مزید کیا قیمت دوں؟"

"ظاہر ہے تم اپنی بھتیجی کو قتل کروانا چاہتے ہو کیونکہ تمہیں اپنی بھتیجی سے کوئی غرض نہیں ہے' تم صرف ایک بھرپور رقم کمانے کے چکر میں ہو' اگر ہم اسے قتل کرتے ہیں تو ہمیں کیا ملے گا؟"

"تم خود ہی سوچ کر بتادو' ظاہر ہے میں اس راز کو ہمیشہ کے لیے دفن بھی کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے فضیلہ کو قتل کرنا پڑے گا۔"

"پورے پچیس لاکھ۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔"

"ایک پائی کم نہ زیادہ۔"

"ٹھیک ہے میں یہ کڑوا گھونٹ بھی پینے کو تیار ہوں' کہاں پہنچانی ہے یہ رقم؟"

"نقد کیش کتنا ہے آپ کے پاس؟"

"کیوں؟"

"پچیس لاکھ کی آدھی رقم ابھی درکار ہے باقی کے بارے میں آپ کے نمبر پر بتادیا جائے گا اور ہاں کسی ہوشیاری کی ضرورت نہیں ہے ورنہ اپنا انجام تم جانتے ہو۔"

حمید صاحب کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے' پھر انہوں نے کہا "ٹھیک ہے پانچ منٹ بیٹھو' انتظام ہوجاتا ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک لفافے کے ساتھ اندر آئے جس میں پورے ساڑھے بارہ لاکھ روپے موجود تھے۔ انہوں نے وہ لفافہ عامر کے حوالے کردیا۔ عامر نے اچھی طرح تسلی کرکے لفافہ اندرونی لباس میں رکھ لیا تھا۔

پھر وہاں سے نکل کر عامر نے اگلا کام یہی کیا تھا کہ ایک منظم منصوبے کے تحت پولیس کی ریڈ اس مکان پر کرائی تھی جہاں فضیلہ قید تھی' اس کام کے لیے اس نے حمید صاحب سے حاصل کردہ پیسوں میں سے کچھ رقم بھی خرچ کرڈالی تھی۔ پھر وہاں سے فضیلہ کو برآمد کروالیا گیا اور بھی لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں۔ فضیلہ نے عامر کو پہچان لیا تھا۔ پھر ضروری کارروائی کے بعد وہ فضیلہ کو لے کر چل پڑا' ایک ریستوران میں پہنچ کر انہوں نے کافی طلب کی اور عامر نے فضیلہ کو حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی عزیز سہیلی ایک دن مجھ سے ملی اور اس نے اپنے دوستوں کی مدد آپ کے تایا کے گھر سے اس فارمولے کو چرانے کا پروگرام بنایا تھا' میں ان کی پوری باتیں سن چکا تھا' چنانچہ میں ان کی تاک میں لگ گیا اور پھر میں نے اس تفصیل کے مطابق عمل کیا وہ بہت خوش تھے اور اس فارمولے کو کسی غیر ملکی دواساز کمپنی کے ہاتھ فروخت کرکے لاکھوں روپے کمانے کے خواب دیکھ رہے تھے' میں کیونکہ مجھے علم ہوگیا تھا کہ یہ سازش آپ کے خلاف کی جارہی ہے تو میں اس تاک میں لگ گیا اور آخر کار میں نے آپ کے تایا کے گھر سے فارمولے کا لفافہ نکال لیا' پھر اس کے بعد میں نے بہت ساری کوشش کی' آپ کے تایا نے اغوا کے لیے ایک بہت بڑے بدمعاش شانی سے رابطہ کیا تھا چنانچہ میں شانی کے پیچھے لگ گیا اور صورت حال میرے علم میں آتی چلی گئی۔"

عامر نے مزید تفصیلات بتائیں اور فضیلہ کی

آنکھیں جھک گئیں وہ بہت زیادہ متاثر نظر آرہی تھی' پھر اس نے گردن اٹھائی اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

"لیکن عامر صاحب آپ سے تو میرا کوئی تعلق ہی نہیں تھا' آپ نے میرے لیے یہ سب کچھ کیوں کیا' میں کیا کہہ سکتی ہوں بس آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں میں نے جو کچھ کیا میں نہیں جانتا کہ کیوں کیا۔"

چچی صاحبہ عامر سے بہت خوش تھیں کیونکہ چچا صاحب کی موت کے بعد عامر نے انہیں ایسے سنبھالا تھا کہ عامر کی ہر مشکل حل ہو چکی تھی۔ انہوں نے بڑی خوش دلی سے فضیلہ کو خوش آمدید کہا اور اس کے لیے بہت اچھا بندوبست کیا' دوسرے دن اخبارات شائی اور اس کے تمام گرگوں کی گرفتاری اور چھاپے کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے' ان چھاپوں کے نتیجے میں دوسری بے شمار غیر قانونی چیزوں کے علاوہ تقریباً" بیس بائیس لڑکیاں آزاد کرائی گئی تھیں' حمید صاحب نے بھی یہ خبریں پڑھی ہوں گی اور وہ اس خیال سے سہمے جارہے ہوں گے کہ اگر ان لڑکیوں میں فضیلہ زندہ مل گئی اور اس نے پولیس کو اپنا بیان دے دیا تو کیا ہوگا۔

عامر کا اندازہ تھا کہ انہوں نے لازمی طور پر پولیس میں فضیلہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرادی ہوگی اور اب وہ معلومات میں لگے ہوں گے' اس کے علاوہ انہیں یہ بھی علم ہو جائے گا کہ اب ان کے سیف میں جو لفافہ رکھا ہوا ہے وہ بیکار کاغذوں کے ایک پلندے سے زیادہ نہیں ہے' اس کے بعد اگر عامر اور فضیلہ ان پر نازل ہوں تو لطف ہی آجائے گا' فضیلہ یہاں آکر بہت زیادہ خوش تھی' عامر نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے آثار دیکھے تھے' ظاہر ہے وہ اس کی احسان مند بھی تھی' پھر ایک ہفتہ گزر گیا اور فضیلہ اور عامر آئندہ کے منصوبے بناتے رہے۔

☆ ☆ ☆

پھر ایک دن صبح ناشتے کے بعد وہ حمید صاحب سے ملنے چل پڑے اور با آسانی ان تک پہنچ گئے' حمید صاحب نے نئے آنے والوں کو اپنی ڈرائنگ روم میں دیکھا جن کے آنے کی اطلاع انہیں ملازم کے ذریعے ملی تھی' لیکن فضیلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا کر رہ گئے ایک لمحے تک تو انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالنے میں وقت گزارا اور پھر ایک دم سے آگے بڑھتے ہوئے فضیلہ کو گلے لگالیا' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"کہاں غائب ہو گئی تھی میری بیٹی تجھے نہیں معلوم کہ مجھ پر کیا گزر رہی تھی' دن کے چین اور راتوں کی نیند سے محروم ہو گیا تھا۔"

"بس بڑے ابا پیچھے ہٹ جائیے یہ ڈھونگ رچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کی پوری سازش سے واقف ہو چکی ہوں۔" فضیلہ نے انتہائی سخت لہجے میں کہا اور حمید صاحب نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

"کیا مطلب' کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟"

"سنئے ان صاحب سے آپ کا تعارف ہے یا نہیں' یہ عامر صاحب ہیں جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اس بدمعاش سے آزاد کرایا ہے اور اس بدمعاش کی قید میں' میں کس طرح پہنچی اس کی تفصیلات آپ کو عامر صاحب بتائیں گے۔ میں آپ کی اس سازش سے مکمل طور پر واقف ہوں۔"

"ہاں۔ میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔" عامر نے کہا۔

پھر ایک دلچسپ تماشا شروع ہو گیا تھا۔ عامر اپنے ساتھ ایک واک مین اور وہ کیسٹ لے گیا تھا جس پر اس نے حمید صاحب کی گفتگو ریکارڈ کی تھی' یقینی طور پر حمید صاحب نے بھی اسے پہچان لیا تھا' بہرحال انہوں نے حیرانی سے مائیکرو کیسٹ کی آواز سنی اور عامر کو گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ عامر کے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ کمرے میں گونجنا شروع ہوئی اور اسے سن کر حمید صاحب کا سرخ و صحت مند چہرہ آن کی آن میں زرد اور پھیکا پڑ گیا۔ عامر نے تقریباً" آدھا کیسٹ چلایا اور پھر اسے بند کر دیا'

لیکن حمید صاحب کا جیسے دم نکل چکا تھا' آخر کار انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور بولے۔

"مجھے میرے کیے کی سزا مل چکی ہے بیٹی' خدا کے لیے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے حق سے محروم رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوں' حقیقت یہ ہے کہ وہ فارمولا جس کے لالچ میں' میں نے یہ سب کچھ کیا تھا میرے سیف کے اندر سے غائب ہو چکا ہے' کسی نے بڑی چالاکی سے اصل فارمولا نکال کر اس کی جگہ اسی لفافے میں سائنس کے کسی طالب علم کے پریکٹیکل کے نوٹس رکھ دیے ہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں تایا صاحب۔" فضیلہ نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

"ہیں۔۔۔ تت۔۔۔ تت۔۔۔ تم جانتی ہو۔"

"جی ہاں' وہ فارمولا اب میرے پاس ہے اور کیسے ہے اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ بھی میری رہائی کی طرح پروردگار کی رحمت کا ایک کرشمہ تھا جو اس کے ایک نیک بندے کے ذریعے مجھ تک پہنچا' آپ کے طرز عمل کے پیش نظر میں اگر چاہوں تو تنہا اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہوں' لیکن میں جانتی ہوں کہ ابو نے آپ سے معاہدہ کیا تھا اور آپ کے مالی تعاون کے بدلے ان کی دریافت سے حاصل شدہ فائدے میں آپ آدھے کے حق دار ہوں گے' میں اپنے والد کی بات کو رد نہیں کرنا چاہتی' لیکن اب یہ فارمولا میرے پاس ہے' آپ یہ دوا خود تیار کرنا چاہتے ہیں یا آپ کا ارادہ اسے کسی دوا ساز کمپنی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ہے۔"

"میرا خیال ہے اسے فروخت کرنا زیادہ مناسب ہے' اسے تیار کرنے کی شکل میں ہزاروں بکھیڑے ہوں گے' حکومت سے لائسنس حاصل کرنا ہوگا' ایک فیکٹری تعمیر کرنی پڑے گی' تمام مشینری امپورٹ کرنا ہوگی اس سے بہتر ہے کہ ہم اسے مناسب قیمت اور آئندہ منافع میں رائلٹی کی بنیاد پر کسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیں۔"

"ٹھیک ہے آپ جس کمپنی سے چاہیں بات کر لیں' لیکن اس کمپنی سے ہونے والی تمام گفتگو کے دوران میں عامر صاحب موجود رہیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" حمید صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اس سلسلے میں اگر ابو سے کیا گیا معاہدہ ناکافی ہو تو آپ اپنے وکیل سے کہہ کر ایک دوسرا کونٹریکٹ تیار کرا سکتے ہیں جس میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو میں نے ابھی آپ سے کہی ہیں۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

"تو اب میں اجازت چاہتی ہوں۔" فضیلہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب بیٹی' کیا تم یہاں نہیں رہو گی۔۔۔ آخر یہ تمہارا بھی گھر ہی ہے۔"

"جی نہیں شکریہ' آپ جانتے ہیں یہ گھر میرے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"فضیلہ میری بیٹی جو کچھ ہو چکا ہے میں اس کے

ہنسئے

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

"بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔"

خاتون نے پریشان ہو کر کہا:

"لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔"

لیے تم سے معافی چاہتا ہوں' مگر اب جبکہ میرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے تو تم تنہا کیسے رہو گی۔"

"آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں زندگی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے' اب میں ہر قسم کے حالات میں گزارہ کر سکتی ہوں۔" فضیلہ نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

فضیلہ نے آگے بڑھ کر بڑے اعتماد کے ساتھ عامر کا ہاتھ پکڑ لیا' عامر نے تو خیر موجودہ حالات کے تحت اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کر لیے کہ حمید صاحب کوئی شبہ نہ ہو سکے' لیکن خود حمید صاحب کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فضیلہ نے پھر کہا۔

"اس شریف انسان نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے۔ آؤ عامر چلیں۔" فضیلہ نے اسی اعتماد سے کہا اور عامر خاموشی سے فضیلہ کے ساتھ قدم بہ قدم چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر حمید صاحب کی طرف دیکھا تو وہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت اور مایوس ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے صاف نمایاں تھا کہ دراصل انہیں شکست پہلے نہیں اب ہوئی تھی۔

سڑک پر آتے ہی فضیلہ نے عامر کا بازو چھوڑ دیا اور بولی۔

"میں آپ سے معذرت خواہ ہوں عامر صاحب' آپ جیسے نیک اور شریف نفس کے ساتھ بس کے مجھ پر ان گنت احسانات بھی ہیں' مجھے یہ حرکت نہیں کرنا چاہیے تھا' مگر میں نے مجبوراً یہ قدم اٹھایا۔ آپ حمید صاحب سے واقف نہیں ہیں' میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں مجھے یقین تھا کہ اس آخری شکست کے بعد بھی وہ میرا پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں' میرے بس میں ہوتا تو میں ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھتی' لیکن ابو نے ان سے معاہدہ کیا تھا ان سے رقم لی تھی ان کے مقروض تھے اور میں اپنے ابو کو ان کے نام کو ان کی روح کو ایک ایسے آدمی کا احسان مند نہیں رکھنا چاہتی تھی۔"

"آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہیں فضیلہ' ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کے لیے جو نوجوان اور خوب صورت بھی ہو زندہ رہنا بڑا مشکل اور قدم قدم پر مصیبتوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ بس میں آپ سے کیا کہوں' لیکن میری زبان نہیں رکے گی' آپ نے جس اعتماد کے ساتھ میرا بازو پکڑا تھا میں آپ کو وہی اعتماد دینا چاہتا ہوں اور اگر میں اس قابل ہو تا تو اپنی چچی صاحبہ سے کہتا کہ آپ کو میرے لیے طلب کر لیں۔"

"کیا مطلب عامر صاحب' آپ نے قابل ہونے کی بات کیوں کی؟"

"اس لیے فضیلہ صاحبہ کہ میں ایک معمولی تعلیم یافتہ ٹیکسی ڈرائیور ہوں اور آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر آپ کے کسی کام آ گیا تو اتنی سی بات کے لیے میری یہ جرات نہیں ہو سکتی کہ میں دل کی کہانی آپ کو سنا دوں۔"

"دل کی کہانی....؟" فضیلہ نے بڑے انداز میں عامر کی طرف دیکھا۔

"جی۔ میں بے مقصد ہی یہ سب کچھ نہیں کرتا رہا ہوں فضیلہ' اس دن سے جس دن آپ کو اتفاقیہ طور پر میری ضرورت پیش آ گئی تھی آج تک آپ کو نہیں بھول سکا تھا' لیکن اپنی حیثیت کا اندازہ تھا۔"

"دیکھیے عامر صاحب' مجھے دنیا کا زیادہ تجربہ نہیں ہے' لیکن زندگی کے نشیب و فراز نے مجھے لوگوں کو پرکھنے کا جو تھوڑا سا شعور دیا ہے اس کی بنیاد پر میں کہہ رہی ہوں کہ آپ جو کچھ بھی ہیں' لیکن آپ ایک باضمیر انسان ہیں' آپ حق کا ساتھ دینے والوں میں سے ہیں' میرا آپ کا تعلق زیادہ پرانا نہیں ہے' لیکن ایسے کئی لمحے آئے تھے جب آپ مجھ سے میرے حالات کا فائدہ اٹھا سکتے تھے' میری عقل کہتی ہے کہ جو شخص اس آزمائش سے بغیر ڈگمگائے گزر جائے اس پر پوری زندگی کے لیے بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔"

فضیلہ کو پتا نہیں تھا کہ جسے وہ آزمائش کہہ رہی

تھی اس سے کہیں زیادہ بڑی اور کڑی آزمائش سے عامر اس وقت دوچار تھا۔ کبھی کبھی صرف یہی بات آدمی کی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے کہ ایک سچے آدمی کو لوگ جھوٹا اور بے قصور کو گناہ گار سمجھیں تو وہ جھلا کر ویسا ہی ہو جاتا ہے اور کبھی کسی بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی اپنا کوئی بھرپور اعتماد دے دے تو وہ اس شخص کی نظروں میں اپنے آپ کو ویسا ہی ثابت کرنے کے لیے راہ راست پر بھی آجاتا ہے اور اس وقت بھی عامر کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ فضیلہ کے خلوص اس کے اعتماد اس کے یقین نے کہ وہ ایک شریف انسان ہے' اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اس نے بے اختیار فضیلہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ کو اگر مجھ پر اتنا ہی بھروسا ہے فضیلہ تو میں آپ کے اس اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

دونوں گھر آگئے' عامر کے ذہن میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اس نے گھر آنے کے بعد چچی جان کو اپنے دل کی کہانی سنا دی۔ یہ گھر عامر کی وجہ سے بڑے پراعتماد انداز میں چل رہا تھا۔ سب کچھ ہو چکا تھا' چچی جان نے بڑے خلوص دل سے فضیلہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ بہرحال یہ مسائل طے ہو چکے تھے۔ عامر کے ذہن میں سب سے بڑی کرید اس لڑکی اور اس کے ساتھی نوجوان کی تھی جس نے فضیلہ بن کر حمید صاحب کی تجوری سے وہ راز چرانے کے لیے کہا تھا اس سلسلے میں عامر نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ دونوں چرس فروشی کے الزام میں سزا پا چکے ہیں اور کئی سال کے لیے جیل کے اندر چلے گئے ہیں۔

ان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ لڑکی جس کا اصل نام روزینہ تھا حمید صاحب کی پرسنل سیکریٹری تھی' حمید صاحب کی کچھ باتیں اس نے سن لیں اور اس کے ذہن میں اس فارمولے کے حصول کا تصور جاگ اٹھا۔ بس اس کے بعد سے وہ اس کی کھوج میں لگ گئی اور اس نے پتا چلا لیا کہ فارمولا کہاں موجود ہے' پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اس فارمولے کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں' لیکن وہاں تک پہنچنا بہت مشکل کام تھا' چنانچہ معلومات حاصل کر کے وہ عامر تک پہنچی اور فضیلہ بن کر اس نے وہ کہانی گھڑی اور اس کے تحت فارمولے کے حصول کی کوشش کی' لیکن اس کے پاس ایک لاکھ روپے نہیں تھے چنانچہ وہ اپنی مشکل کا شکار ہو گئی۔ اگر وہ یہ رقم عامر کو ادا کر دیتی تو شاید صورت حال ہی تبدیل ہو گئی ہوتی اور اصل فضیلہ کی زندگی وہیں اسی بوسیدہ مکان میں گزرتی جو اس کے باپ کی ملکیت تھا اور حمید صاحب کی حرکتوں نے رشید صاحب کو اتنا بددل کیا کہ وہ دل کی تکلیف کا شکار ہو گئے اور اپنی بیٹی کو لے کر خاموشی سے اس گھر میں منتقل ہو گئے۔ وہ وہیں زندگی گزار رہے تھے' لیکن کہانیاں اسی طرح آگے بڑھتی ہیں اگر ایسا نہ ہوتا اور وہ

غور و فکر

☆ عبادت جو تخلیق کے لیے کی جاتی ہے' زمین میں دھنسا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

☆ جس کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ عالم ہے' جس کا باطن' ظاہر سے افضل ہے' وہ ولی اللہ ہے اور جس کا ظاہر باطن سے افضل ہے' وہ جاہل و مکار ہے۔

☆ خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہ جو کچھ بھی سنے بیان کر دے۔

☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔

☆ بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

اتنے بیمار نہ ہوتے تو فضیلہ کس طرح عامر تک پہنچتی اور آخر کار ایک نئی زندگی کا آغاز نہ ہوتا' لیکن جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں اور یہ جوڑا اسی طرح بننا تھا' چنانچہ انتہائی سادگی کے ساتھ چچی جان نے عامر اور فضیلہ کا نکاح کرادیا اور دونوں زندگی کے ساتھی بن گئے۔ عامر نے اپنے غلط کاموں سے توبہ کرلی اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے ٹیکسی چلانے لگا۔

البتہ فضیلہ تھوڑی سی الجھن میں تھی۔ وہ اس سلسلے میں تھوڑا سا غور کررہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے اپنے ابو کے دریافت کردہ سرطان کے علاج کے باعث اسے غیر معمولی دولت مل سکتی تھی اور شاید زندگی کے کسی مرحلے پر کسی موڑ پر کوئی ایسا سوال پیدا ہو جس کے جواب کے لیے کچھ لوگ یہ کہیں کہ عامر نے فضیلہ سے شادی اسی دولت کے لیے کی تھی' لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے' جلد ہی تجربے نے یہ بتادیا کہ اس بارے میں حمید صاحب اور فضیلہ کی توقعات زیادہ تر خوش فہمی پر مبنی تھیں۔ کوئی دواساز کمپنی کسی دوا کا کوئی فارمولا اس وقت تک نہیں خریدتی جب تک اس دوا کے کیمیاوی تجربات' جانوروں پر تجربات بلکہ انسانوں پر بھی استعمال کرکے اس کے مفید ہونے کا یقین نہ کرلیا جائے اور کبھی کبھی ان تمام مراحل میں برسوں بیت جاتے ہیں۔

حمید صاحب مسلسل کوششوں میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں ان کا تعلق عامر اور فضیلہ سے بھی رہتا تھا' مگر انہوں نے جس کمپنی سے بھی بات کی اس نے یہی جواب دیا اور آخر کار حمید صاحب کو اور فضیلہ کو اس وقت کے لیے انتظار پر آمادہ ہونا پڑا جب تک اس دوا پر مکمل تجربات نہ کرلیے جائیں۔ جب ٹھوس بنیادوں پر بات چلی تو حمید صاحب نے ایک مشہور دوا ساز کمپنی کو ان تمام کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کردیں جو انہوں نے پروفیسر رشید صاحب کے انتقال کے بعد ان کی لیبارٹری سے حاصل کیے تھے۔ تقریباً" دو ہفتے کے بعد کسی دواساز کمپنی کا جواب ملا اور جواب یہ تھا کہ ریسرچ کا پراسس نامکمل ہے ایک دو تجربات درمیان سے اور آخری تجربے کے بارے میں کوئی تحریر کوئی فارمولا کوئی نوٹ یا کسی بھی قسم کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

ان کاغذات سے یہ ضرور پتا چلتا تھا کہ رشید صاحب کسی کامیاب علاج کے دریافت کی طرف پیش قدمی کررہے تھے کیونکہ انہوں نے جانوروں پر جو تجربات کیے تھے ان کے اثرات حیرت انگیز تھے' لیکن ان کاغذات پر ان کا وہ فائنل فارمولا موجود نہیں تھا جس کی بنیاد پر انہوں نے دریافت پر کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ کاغذات اس میدان میں ریسرچ کرنے والوں کو ایک نیا رخ ضرور فراہم کرتے ہیں' مگر کسی کامیاب نتیجے پر نہیں پہنچاتے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ دواساز کمپنی کے لیے بے مقصد ہیں۔ یہ ایک دھماکا خیز انکشاف تھا' خاص طور سے حمید صاحب کے لیے' ظاہر ہے وہ سائنس کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھے اور عین ممکن تھا کہ آخری تجربے سے متعلق کاغذات بھی لیبارٹری میں موجود ہوں' لیکن انہوں نے اسے بیکار سمجھ کر نظرانداز کردیا یا ممکن تھا کہ پروفیسر صاحب نے ان کاغذات کو کسی ایسی جگہ رکھا جہاں ہر ایک کا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور بدقسمتی یہ تھی کہ اب اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا' فضیلہ نے اپنے باپ کی لیبارٹری کے وہ تمام آلات اور جملہ چیزیں ایک سائنس کالج کو عطیہ کردیں۔ کیا کہا جاسکتا تھا کہ آگے کیا ہو' لیکن عامر مایوس نہیں تھا' اس نے حمید صاحب سے حاصل کردہ رقم کو ایک مناسب کاروبار میں لگایا تھا اور اس سے ہر ماہ منافع ہوتا تھا اس کے علاوہ اس کی ٹیکسی ان کی تمام ضروریات پوری کررہی تھی۔ چچی جان کے گھر کے معاملات بھی بہتر ہوچکے تھے اور اب چچی جان کے لیے صرف عامر اور فضیلہ رہ گئے تھے۔ پھر عامر کو اللہ نے چاند سا بیٹا دیا اور چچی نہال ہوگئیں' اب گھر میں چچی ہیں' عامر ہے' فضیلہ ہے اور ننھے سعد کی قلقاریاں ہیں۔

☆ ☆

زندگی میں شک اور بے اعتمادی کا بیج پڑجانے تو پھر وہ بڑ کا تناور درخت بن جاتا ہے ایسا درخت جس کی شاخیں زہریلی اور سایہ تکلیف دہ ہوتا ہے ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی دو بہنوں کے درمیان جب شک کے اسی سانپ نے سر ابھارا تو دل کے شفاف آئینے میں برعکس دھند لا ہوتا چلا گیا اور بالآخر آئینہ ٹوٹ گیا۔

شک کا سانپ

نسیم جاوید سیہ

گریٹا اور ارما دونوں بہنیں تھیں اور دونوں عمر رسیدہ تھیں۔ اس وقت وہ اپنے کشادہ آبائی مکان کے روشن اور ہوادار کچن میں میز پر بیٹھی تھیں۔ دونوں بہنوں نے اپنی ممی اور پاپا کے زیر سایہ اسی مکان میں پرورش پائی تھی اور اب بڑھاپے کو پہنچنے کے بعد بھی یہیں رہ رہی تھیں۔ کارٹر کے زمانہ صدارت میں ان کے ممی پاپا کا انتقال ہوگیا تھا۔ تب سے مکان میں صرف دونوں بہنیں ہی رہ گئی تھیں۔

"عجیب بات ہے۔" گریٹا بولی۔ "اس مہینے میرا سوشل سیکورٹی کا چیک ابھی تک نہیں آیا۔" اس نے فریج سے نکالی ہوئی آئس کریم سے ایک بڑا سا چمچہ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"اس مرتبہ تو بہت تاخیر ہوگئی۔" ارما تعجب سے بولی۔ "آج تو آٹھ تاریخ ہے۔"

"نہیں۔ تاریخ تو سات ہے۔" گریٹا نے تصحیح کی۔ "لیکن بہرحال۔۔۔ تاخیر کافی ہوچکی ہے۔ چیک تو ہمیشہ دو تاریخ تک آجاتا تھا۔"

ارما کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس روز آٹھ تاریخ تھی اور دیوار پر آویزاں کیلنڈر بھی اس کی تصدیق کررہا تھا لیکن اس نے گریٹا کی تردید نہیں کی۔ وہ گریٹا کی چھوٹی بہن تھی اور ساٹھ سال کی رفاقت نے اسے یہی سکھایا تھا کہ گریٹا جیسی بڑی بہن سے کبھی بحث یا اس کی بات کی تردید نہیں کرنی چاہیے۔ خواہ وہ غلط ہی کہہ رہی ہو۔

"تم نے پوسٹ مین سے دریافت کیا تھا؟" ارما نے جاننا چاہا۔

"نہیں۔" گریٹا نے جواب دیا۔ "اگر ہم پوسٹ آفس والوں کے بارے میں شک یا بداعتمادی محسوس کرنے لگیں تو پاپا روح پر کیا گزرے گی؟"

ان کے پاپا پوسٹ مین تھے اور اپنی اس حیثیت پر انہیں ہمیشہ بہت فخر رہا تھا۔ ڈاک کے نظام پر ان کا اعتماد غیر متزلزل تھا اور یہی اعتماد ان کا خاندانی سرمایہ تھا۔ انہیں کامل یقین تھا کہ ڈاک کے نظام میں بدعنوانی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا کرتے تھے کہ لوگوں کی اکثریت کا یہ خیال تھا کہ ڈاک میں بہت سی چیزیں گم ہوجاتی تھیں۔ ڈاک کی تعداد کی مناسبت سے گم ہونے والی چیزوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ان کا کہنا تھا اگر ایڈریس صحیح لکھا ہو تو کسی چیز کے گم ہونے کا امکان ایک فیصد سے بھی کم تھا بلکہ بہت سی چیزیں اور خطوط تو ایڈریس غلط ہونے کے باوجود صحیح جگہ پر پہنچا دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے پائپ کے کش لے کر ڈاک کے نظام کی خوبیاں گنوانے لگتے تھے۔

"تم نے سوشل سیکورٹی آفس والوں سے معلوم کیا؟ انہیں فون کیا؟" ارما نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے چیک ارسال کیا جاچکا ہے اور کیش بھی کرایا جاچکا ہے۔" گریٹا نے جواب دیا پھر دھندلائی ہوئی نم آلود آنکھوں سے ارما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم اس سلسلے میں کیا کہو گی؟"

"غالباً کہیں کمپیوٹر سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔" ارما اپنی کافی میں چینی حل کرتے ہوئے بولی۔ "آج کل اگر کوئی کام غلط ہوتا ہے تو اس کے پیچھے عموماً کمپیوٹر کی غلطی کام کررہی ہوتی ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم میرے چیک کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟" گریٹا کی نظروں میں اب شک نمایاں ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ خاندان سے باہر کے لوگوں کے لیے ان دونوں بہنوں کی مشابہت ابھی تک پریشان کن تھی۔ لوگ ان میں امتیاز نہیں کرپاتے تھے کہ کون سی گریٹا تھی اور کون سی ارما۔ دونوں بہنیں حیرت انگیز حد تک ہم شکل تھیں۔ ارما کے لیے گریٹا کا چیک مقامی بینک میں لے جاکر کیش کرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ارما کی آواز بلند ہوگئی۔ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "مجھے بھلا تمہارے چیک کا کیا پتا۔" اس نے اپنی گردن متانت سے اونچی کی اور اپنے سلیقے سے سنورے ہوئے بالوں کو مزید

سنوارنے لگی۔

گریٹا اس کے لہجے اور اس کے انکار سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ اس انداز میں وہ اس سے پہلے بھی ارما کی زبان سے کئی تردیدیں سن چکی تھی جن میں سب سے قابل ذکر تردید 44ء میں سننے میں آئی تھی جب گریٹا کے نئے ریشمی موزے گم ہوگئے تھے۔ اس نے ارما سے دریافت کیا تو اس نے بالکل اسی طرح لاعلمی ظاہر کی تھی لیکن دو تین روز بعد وہ موزے مسلے اور پھٹے ہوئے' دھلائی کے کپڑوں کی باسکٹ میں پڑے ملے تھے۔

گریٹا کو اس وقت بھی ارما کی تردید پر یقین نہیں آیا تھا اور آج اسے اس کی لاعلمی مصنوعی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ پچھلی مرتبہ جرابوں کا بیڑا غرق کرکے تو ارما بچ گئی تھی لیکن اس بار گریٹا کا اسے معاف کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بعد میں اس روز ڈاک آئی تو گریٹا گھر سے باہر تھی۔ ہر منگل کو وہ باقاعدگی سے اپنی کسی دوست کے گھر برج کھیلنے جاتی تھی۔ اس میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی منگل تھا۔ دوپہر کو دروازے پر ہلکی سی کٹ پھٹ سے ارما کو اندازہ ہوا کہ پوسٹ مین ان کے دروازے پر لگے ہوئے باکس میں ڈاک ڈال رہا تھا۔

وہ لپک کر دروازے پر پہنچی۔ دروازے کے عقب میں نصب جالی دار میل باکس میں تین لفافے موجود تھے۔ ایک بجلی کا بل تھا اور دوسرا ان کی کزن لنڈا کا خط۔ یہ دونوں چیزیں ارما نے گریٹا کے لیے ہال کی میز پر رکھ دیں۔ تیسرا لفافہ اسی کے نام تھا۔ یہ اس کے بینک کے شعبہ ادائیگی کی طرف سے ایک اسٹیٹ منٹ تھی۔ اس میں ارما کی طرف تین سو ڈالر نکل رہے تھے۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے تو بہت دن سے اپنا چارج کارڈ دکھا کر کسی دکان سے کوئی خاص خریداری نہیں کی تھی۔ اس کے حساب سے تو اس کے اس مخصوص کھاتے میں خاصی رقم ہونی چاہیے تھی۔ اس نے اسٹیٹ منٹ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کے چارج کارڈ پر لیورائے جیولری اسٹور سے کوئی اچھا خاصا منگا زیور خریدا گیا تھا۔

ارما کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے تو لیورائے کے جیولری اسٹور سے کوئی چیز خریدی ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو پچھلے ایک سال سے اس دکان میں گئی بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر چیزیں نقد ادائیگی کرکے خریدتی تھی۔ چارج کارڈ تو وہ صرف کسی ہنگامی ضرورت کے لیے اپنے پرس میں رکھتی تھی۔

"کہیں اس کا چارج کارڈ چوری تو نہیں ہوگیا تھا؟ یہ سوچ کر وہ گھبرا کر الماری کی طرف لپکی جس میں اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے پرس نکال کر جائزہ لیا۔ اس کے ایک خانے میں کارڈ محفوظ تھا۔

ارما کے خیال میں صرف گریٹا ہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس کے پرس سے کارڈ نکال بھی سکتی تھی اور استعمال کے بعد اسے وہیں واپس رکھ بھی سکتی تھی۔

آج صبح ہی گریٹا یہ بھی بتا رہی تھی کہ اس کا سوشل سیکورٹی چیک اس ماہ موصول نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ رقم کی طرف سے اس کا ہاتھ تنگ ہوگا۔

ارما کو چکر سا آگیا اور وہ ہال میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا گریٹا یہی سمجھتی تھی کہ وہ حساب کتاب میں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ارما کو خود بھی اپنی اس خامی کا احساس تھا۔ اس کی زندگی میں زیادہ نظم و ضبط نہیں تھا۔ وہ حساب کتاب اچھی طرح یاد نہیں رکھ سکتی تھی شاید اسی لیے گریٹا نے سوچا تھا کہ ارما کوئی خاص توجہ دیے بغیر اپنے چارج کارڈ کے بقایاجات کی ادائیگی کردے گی۔

ویسے بھی گریٹا کو جب اور جہاں موقع ملتا تھا' وہ مالی فائدہ اٹھانے سے چوکتی نہیں تھی۔ انہوں نے روز مرہ گھریلو خرچ چلانے کے لیے کچن میں ایک ڈبا رکھا ہوا تھا جس میں وہ مشترکہ طور پر مہینے کے شروع میں کچھ رقم ڈال دیتی تھیں لیکن بعد میں ارما اکثر دیکھتی تھی کہ گریٹا اس میں سے پانچ سات ڈالر یہ کہہ کر نکال لیتی تھی۔ "ادھار لے رہی ہوں۔ تنخواہ ملتے ہی ڈال دوں

گی۔"

لیکن ارما نے کبھی گریٹا کو اس ڈبے میں رقم واپس ڈالتے نہیں دیکھا تھا۔ گریٹا کو مالی تنگی ہوتی نہیں چاہیے تھی۔ وہ کچھ ایسی تھی دست نہیں تھی اور سوشل سیکورٹی سے اسے پنشن بھی ملتی تھی لیکن وہ غیر ضروری چیزوں پر بہت خرچ کرتی تھی۔ میک اپ کا نت نیا اور مہنگا سامان بہت خریدتی تھی اور اسے جیولری کا بھی بہت شوق تھا۔ خصوصاً" نت نئی انگوٹھیاں خریدنا تو اس کا مشغلہ تھا۔ دونوں ہی شوق مہنگے تھے۔ اسی لیے اسے پاپا ہی کے زمانے سے کچن کے ڈبے سے چھوٹی موٹی رقمیں "ادھار" کہہ کر نکالنے کی عادت تھی۔ ارما نے کبھی حساب رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کب کتنی رقم نکالتی تھی۔

ارما نے دوبارہ اسٹیٹ منٹ چیک کی تو معلوم ہوا کہ زیور گزشتہ منگل کو ہی خریدا گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ گریٹا گزشتہ منگل کو برج کھیلنے جاتے وقت جیولری کی دکان کے سامنے سے گزری ہوگی اور شوکیس میں کوئی نئی چیز دیکھ کر رہ نہیں سکی ہوگی۔ خصوصاً" نئی انگوٹھی پہن کر برج کھیلنے جانا تو اس کی کمزوری تھی۔ اس بار وہ خریدنے کے قابل نہیں ہوگی تو اس نے بہن کے کارڈ سے کام چلا لیا ہوگا۔

ارما کے دانت بھنچ گئے اور پرس پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس بار گریٹا کی چالاکی نہیں چلنے دے گی۔

☆ ☆ ☆

اس رات کھانے کی میز پر بار بار دونوں بہنیں شک بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ گریٹا نے ارما کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا ڈریس نیا ہے نا؟"

جس انگلی سے اس نے اشارہ کیا تھا' ارما نے دیکھا اس میں نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ارما نے اس سے پہلے وہ انگوٹھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنا کالر درست کرتے ہوئے ذرا محجوب سے انداز میں بولی۔ "ہاں۔۔۔ یہ ڈریس ہے تو نیا۔ کلیئرنس سیل میں بہت سستا مل رہا تھا اس لیے لے لیا۔" پھر ایک توقف سے اس نے پوچھا۔ "یہ تمہاری انگوٹھی نئی ہے نا؟"

"ہاں۔ کسی مداح نے تحفتاً" دی ہے؟" گریٹا انگلی لہراتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

بدھ کے روز گھر میں ہلکی پھلکی صفائی کرنے کی باری ارما کی ہوا کرتی تھی۔ اس بدھ کو اس نے صفائی اور جھاڑ پونچھ شروع کی تو گریٹا کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر اس نے کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں دیکھیں اور ناک بھوں چڑھا کر رہ گئی۔ گریٹا کو گویا دوائیں کھانے کا شوق تھا۔ بات بات پر وہ کسی نہ کسی دوا کی گولی کھاتی تھی۔ بے خوابی' دست' الٹی' قبض' سینے کی جلن' دل کی تکلیف' زکام' نزلہ' جوڑوں کا درد' گھبراہٹ و بے چینی' غرض یہ کہ اس کے ذخیرے میں ہر تکلیف' ہر شکایت کے لیے گولی موجود تھی۔ جب کہ ارما کا یہ حال تھا کہ وہ سر درد کے لیے اسپرین بھی شاذ و نادر ہی لیتی تھی۔

ارما نے قریب سے ان شیشوں کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ کئی امراض کی گولیاں بالکل ایک جیسی تھیں۔ ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخے بھی قریب ہی رکھے تھے۔ اچانک ایک عجیب سا خیال ارما کے ذہن میں آیا۔ اگر وہ چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں جو گریٹا کو تینوں وقت کھانے سے پہلے لینی ہوتی تھیں' اس شیشی میں ڈال دی جائیں جس میں سے صرف گھبراہٹ اور بے چینی کے وقت ایک گولی لینی ہوتی تھی تو کیا ہو؟ یہ جاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس نے ایک جیسی گولیوں والی شیشوں کے ڈھکن کھولے اور ایک کی گولیاں دوسری میں منتقل کرنا شروع کر دیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سازشی سی مسکراہٹ تھی۔

بدھ کو ارما اپنے بال ٹھیک کرانے ہیئر ڈریسر کے ہاں جاتی تھی اور آج اسے بہ مشکل دس بجے کا وقت ملا تھا جو نکلا جا رہا تھا۔ گریٹا اس وقت باتھ روم میں تھی۔ ارما اپنی شرارت سے فارغ ہو کر جلدی جلدی تیار ہوئی اور بہ آواز بلند گریٹا کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل لی۔

گریٹا اس وقت تہ خانے میں تھی اور میلے کپڑے

دھونے کے لیے مشین میں ڈال رہی تھی۔ جب سے وہ سیونگ بینک کی ملازمت سے ریٹائر ہوئی تھی' دونوں بہنوں نے کام بانٹ لیے تھے۔ ارما صفائی اور کھانا پکانے کی ذمے دار تھی' جب کہ گریٹا نے دھلائی اور باغیچے وغیرہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لی ہوئی تھی۔

دھلائی کے لیے کپڑے چھانٹتے وقت ارما کا نیا ڈریس اس کے ساتھ میں آیا تو اس نے لیبل پر دھلائی کے لیے ہدایات پڑھیں۔ ان میں لکھا تھا کہ اسے صرف ٹھنڈے پانی میں ہاتھ سے دھوئیں۔ استری بھی نہایت ہلکی گرم کریں۔ گریٹا نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے نہایت اطمینان سے ڈریس کھولتے ہوئے پانی میں مشین میں ڈال دیا۔

اسے یقین تھا کہ ارما نے وہ لباس اس کے چرائے ہوئے سوشل سیکورٹی کے چیک سے خریدا تھا اس لیے درحقیقت وہ لباس اس کی ملکیت تھا چنانچہ اسے حق تھا کہ وہ اس کا جو چاہتی' حشر کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ارما اگر اپنے لباس کے بارے میں شکایت کرے گی تو وہ کہہ دے گی کہ اس نے غلطی سے مشین میں اور گرم پانی میں ڈال دیا تھا۔ غلطی آخر کس سے نہیں ہوتی؟ انسان خطا کا پتلا ہے!

سیڑھیاں چڑھ کر واپس گھر میں آتے وقت گریٹا نے دروازے کے عقب میں لگے ہوئے جالی دار لیٹر باکس کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی خط نہیں تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ روزانہ کچھ نہ کچھ ڈاک تو آتی تھی اور کچھ نہیں تو اشتہارات یا چندے کی اپیلیں ہی آجاتی تھیں۔

اس کا مطلب تھا کہ کوئی نہ کوئی ڈاک میں گڑبڑ کررہا تھا۔ ڈاک کے نظام پر اعتماد تو اسے ورثے میں ملا تھا۔ اپنے آنجہانی باپ کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ ڈاک میں تو گڑبڑ ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی گڑبڑ کر بھی رہا تھا تو وہ اس کے اپنے گھر کا فرد تھا لیکن ارما کس طرح یہ کام کررہی تھی' یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے اعصاب کچھ مرتعش سے تھے۔ اس نے اعصابی سکون کے لیے جلدی سے ایک سفید گولی کھائی اور اس کے اثر کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار کے لمحات گزارنے کے لیے وہ تاش نکال کر بیٹھ گئی اور تنہا کھیلے جانے والا ایک کھیل کھیلنے لگی۔ آج اس نے ارما کے نئے ڈریس کا جو حشر کیا تھا اس کے بارے میں سوچ کر اس کے دل میں گدگدی سی ہورہی تھی۔ وہ اب بے چینی سے اپنی بہن کا ردعمل دیکھنے کی منتظر تھی۔

ارما لوٹ آئی۔ اس نے ہال میں لگے ہوئے آئینے میں اپنے بالوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا پھر ڈاک دیکھنے میز تک گئی۔ میز بالکل خالی تھی۔

"کیا آج کوئی ڈاک نہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" گریٹا نے مضطربانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے!" ارما نے گریٹا کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اگر مجھے ڈاک کے نظام پر اعتماد نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتی کہ کوئی ہمارے خط چرا رہا ہے۔"

اس رات کھانے کی میز پر بھی خاصی بدمزگی رہی۔ ارما اپنا نیا تباہ شدہ ڈریس دیکھ چکی تھی اور گریٹا پر خوب برہم ہوئی تھی۔ اس نے غصے میں کھانا تیار کیا اور سویٹ ڈش کے طور پر گریٹا کے لیے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا نکالنے لگی تو انتقام لینے کا ایک طریقہ اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے دست آور دوا کی ایک بڑی ٹکیا نکالی اور اسے پیس کر کیک پر چھڑک دیا۔ وہ کچھ ایسے رنگ کی دوا تھی کہ چاکلیٹ کیک میں مدغم ہو کر رہ گئی۔

"اس عورت کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ کچن میں کام کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔ دوائی کی ٹکیا کا ریپر اس نے اپنی جیب میں چھپا لیا۔

ادھر گریٹا اپنے آپ کو نہایت مضطرب و بے چین محسوس کررہی تھی۔ وہ بے چینی اور اضطراب دور کرنے کی غرض سے سکون آور دوا کی ایک کے بجائے تین گولیاں کھا چکی تھی لیکن انہوں نے گویا کوئی اثر ہی

نہیں کیا تھا۔ اس کا اضطراب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ارما کے سامنے میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا کھانا ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے جا کر کھایا۔

چاکلیٹ کیک اس کی پسندیدہ ترین سویٹ ڈش تھی لیکن سویٹ ڈش ختم کرتے ہی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ چند لمحے بعد وہ اٹھی اور باتھ کی طرف بھاگی۔

تھوڑی ہی دیر میں تین بار باتھ روم جانے کے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کچن میں پہنچی اور اپنے لیے ہاضمے کا مکسچر تیار کرنے لگی۔ ارما نہایت اطمینان سے کچن میں ٹیبل پر بیٹھی معما" حل کر رہی تھی۔ اسے ہاضمے کا مکسچر تیار کرتے دیکھ کر گویا مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "ہاضمہ خراب ہو گیا ہے یا کپڑے دھونے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہو گیا ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" گریٹا نے مکسچر کا ایک گھونٹ لے کر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" ارما نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی اور جیب سے ٹشو پیپر نکالنے لگی۔ ٹشو پیپر نکالتے ہوئے دست آور ٹکیا کا ریپر بھی اس کی جیب سے نکل کر فرش پر گر پڑا جس کا اسے پتا ہی نہ چلا لیکن گریٹا نے وہ ریپر دیکھ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

ارما اسی روز بیوٹی پارلر سے بال سیٹ کروا کر آئی تھی۔ گریٹا نے آگے بڑھ کر ہاضمے کے مکسچر کا گلاس اس کے سر پر خالی کر دیا پھر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی کمرے میں پہنچی اور خواب آور گولیوں کی دگنی خوراک لے کر سونے لیے لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

دوسری صبح گریٹا بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا' ارما چاروں ہاتھ پیروں کے بل فرش پر جھکی کچھ کر رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تب اسے معلوم ہوا کہ ارما ایک نقرئی سی' چمکیلی ٹیپ لیے نشست کے کمرے میں فرش پر چکر رہی تھی۔ اس طرح وہ کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔

"اس تقسیم سے ہم دونوں کو آرام رہے گا۔" اس نے گریٹا کو مطلع کیا۔ "ڈائننگ روم اور نشست کا کمرا ہم دونوں کے پاس آدھا آدھا رہے گا۔ کچن پورا میرے پاس اور غسل خانہ پورا تمہارے پاس رہے گا۔ اس طرح ہمیں اپنی اپنی سائڈ پر رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" گریٹا بے نیازی سے بولی۔

"لیکن مجھے اس وقت ایک کپ چائے چاہیے۔"

"بولنے کی ضرورت نہیں' لکھ کر دو۔" ارما نے اسے کاغذ کا ایک پیڈ اور پنسل تھماتے ہوئے کہا۔

"چائے۔" گریٹا نے ایک کاغذ پر صرف اتنا لکھا اور ارما کی طرف بڑھا دیا۔ ارما چپل گھسیٹتی کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کے بال بری طرح الجھے اور چپکے ہوئے تھے۔ گریٹا نے یہ دیکھ کر طمانیت کی سانس لی۔ اس کا انڈیلا ہوا مکسچر خاصا کارآمد رہا تھا۔

اس روز ستارہ تاریخ تھی۔ ارما نے ایک جگہ تھوڑی سی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی اور آج اسے وہاں سے منافع کے چیک کا انتظار تھا۔ اس لیے وہ ڈاک آنے سے پہلے گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ گریٹا کو ذرا بھی موقع ملا تو وہ فوراً" اس کا چیک چرا لے گی۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے لازماً" اپنے بالوں کا بھی کچھ کرنا تھا۔ اس نے بیوٹی پارلر فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ صرف ساڑھے دس بجے کا وقت دے سکتے تھے۔ ارما نے بادل ناخواستہ یہ وقت لے لیا۔

اس کا گھر سے نکلنے کا وقت ہو گیا لیکن ڈاک نہیں آئی۔ مجبوراً" رخصت ہوتے وقت اس نے بہتر سمجھا' گریٹا پر واضح کر دیا جائے کہ وہ آج چیک کی منتظر ہے۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ "آج میرا چیک آنا ہے۔ مجھے مل

جانا چاہیے۔"

اس نے کاغذ گریٹا کی طرف بڑھایا تو اس نے محض بھویں اچکانے پر اکتفا کیا۔ ارما دل میں تہیہ کر کے رخصت ہو رہی تھی کہ اگر واپسی پر اسے ڈاک میں اپنا چیک نہ ملا تو وہ گریٹا کو اچھی طرح سبق سکھائے گی۔

ادھر گریٹا نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی بہن کو فٹ پاتھ پر جاتے دیکھا تو اچانک ہی اس کی سمجھ میں آیا کہ ارما کس طرح ڈاک غائب کرتی تھی۔ خاص موقعوں پر وہ عین اس وقت گھر سے نکلتی تھی جب پوسٹ مین آنے ہی والا ہوتا تھا۔ فٹ پاتھ پر ان کا سامنا ہوتا ہوگا اور ارما سرسری سے لہجے میں اس سے کہتی ہوگی کہ وہ ڈاک اسے ہی دے جائے' وہ خود ہی گھر لے جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ آنجہانی پاپا تو اپنی زندگی میں کبھی کسی خاتون کے اس قسم کے چکر میں نہیں آئے ہوں گے اور ڈاک ہر حال میں گھر ہی پہنچاتے ہوں گے لیکن اپنے موجودہ پوسٹ مین کے بارے میں اسے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا اور اس قسم کے ذمے دارانہ کام کے لیے خاصا ناموزوں اور ناتجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔

ارما دوپہر کو گھر واپس آئی تو اس نے بے تابی سے ہال کی میز اور لیٹر بکس کا جائزہ لیا۔ دونوں چیزیں خالی تھیں۔ آج پھر ڈاک موجود نہیں تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اب تو انتہا ہی ہو چکی تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔ آخر گریٹا اسے کس حد تک بے وقوف سمجھ رہی تھی؟ پہلے وہ اس کا چارج کارڈ استعمال کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے نئی انگوٹھی پہن کر اترا رہی تھی' سمجھ رہی تھی کہ اسے کچھ پتا نہیں چلے گا۔

اب وہ اس کے چیک پر ہاتھ صاف کر گئی تھی حالانکہ ارما اسے بتا کر گئی تھی کہ آج اسے چیک کا انتظار تھا۔ اس کے باوجود گریٹا نے چیک غائب کر دیا تھا۔ یہ تو ڈھٹائی کی انتہا تھی' دوسرے کو اشتعال دلانے کی کوشش تھی۔ جس طرح گریٹا نے اس کا نیا لباس تباہ کر کے اور اس کے بالوں پر مکسچر الٹ کر اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہال میں تنہا کھڑے کھڑے بچپن کی بہت سی یادیں ارما کے ذہن میں ہلچل مچا گئیں۔ گریٹا کا بچپن سے یہی رویہ تھا۔ وہ اس زمانے میں بھی اس پر زیادتیاں کرتی تھی پھر اس کے کان موڑ کر اسے حکم دیتی تھی کہ وہ گھر میں کسی کو ان باتوں کی ہوا بھی نہ لگنے دے۔

اور سے گریٹا اسے اپنے اور اپنی دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ چھوٹی ہے اس لیے بڑوں میں نہیں کھیل سکتی۔ ارما کو کچھ یوں لگتا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ساری بھول ہماری تھی	راحت جبیں	300/-
او بے پروا سجن	راحت جبیں	300/-
ایک میں اور ایک تم	تنزیلہ ریاض	350/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	350/-
دیمک زدہ محبت	صائمہ اکرم چوہدری	300/-
کسی راستے کی تلاش میں	میمونہ خورشید علی	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
دل موم کا دیا	سائرہ رضا	300/-
ساڈا چڑیا دا چنبا	نفیسہ سعید	300/-
ستارہ شام	آمنہ ریاض	500/-
مصحف	نمرہ احمد	300/-
دست کوزہ گر	فوزیہ یاسمین	750/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

تھا کہ اس کی پوری زندگی ہی گریٹا کی خدمت اور اس کے احکامات کی تعمیل میں گزر گئی تھی۔ نوجوانی سے لے کر اب تک گھر پر رہنا' صفائی کرنا' کھانا پکانا اس کی ذمے واری رہی تھی جب کہ گریٹا آزاد پرندے کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ تو ایک بار کیلیفورنیا میں تعطیلات بھی گزار چکی تھی۔ اس تمام عرصے میں ارما ماں باپ کی خدمت کرتی رہی تھی' گھر کے کام کرتی رہی تھی۔

لیکن اب بہت ہو چکی تھی۔ تاخیر سے ہی سہی لیکن اب اسے ہوش آچکا تھا۔ وہ اب گریٹا کی غلامی کے پھندے سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ یہ بات جتنی جلدی گریٹا کو معلوم ہو جاتی اتنا ہی بہتر تھا۔ ارما نے ہال کے اسٹینڈ سے چھتری اتاری گہری سانس لے کر ایک لمحے کے لیے تن کر کھڑی ہوئی۔ اب وہ گریٹا کو تلاش کر کے اس سے صاف صاف بات کرنے... بلکہ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔

گریٹا اس وقت سیڑھیوں کی بلندی پر' دیوار کی آڑ میں کھڑی ارما کی حرکات و سکنات بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ارما اس وقت کیا سوچ رہی تھی؟ ارما بچپن ہی سے چالاک رہی تھی۔ گریٹا کو یاد تھا کہ وہ بات بات پر ممی پاپا کے پاس شکایت لگانے بھاگی جاتی تھی۔ ممی پاپا کی بھی وہ چہیتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تو کبھی کوئی غلط کام' کبھی کوئی شرارت کر ہی نہیں سکتی۔ وہ چھوٹی تھی' صاف ستھری اور اسمارٹ بھی نظر آتی تھی۔ بیمار بھی کم ہوتی تھی۔ اس لیے ماں باپ کو زیادہ پیاری لگتی تھی۔ ماں باپ اسے تو گھر پر اپنی شفقت کے سائے میں رکھتے تھے جب کہ گریٹا کو ملازمت کے لیے اور گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔

گریٹا کو یہ سب زیادتیاں یاد آرہی تھیں اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آرہا تھا کہ ان سب باتوں کا ارما نے کیا صلہ دیا تھا؟ یہی کہ اب وہ اس کا سوشل سیکورٹی کا چیک بھی چرانے لگی تھی اور اسے دست آور دوا کی زیادہ مقدار دے کر موت کے منہ میں پہنچانے کی کوشش کر چکی تھی۔

اس کے علاوہ گریٹا کو یہ بھی شک تھا کہ ارما نے اس کی دواؤں میں بھی کوئی گڑبڑ کی تھی۔ وہ گولیاں کھاتی کسی مقصد سے تھی اور ان کا اثر کچھ اور ہوتا تھا۔

گریٹا نے دیکھا کہ ارما چھتری ہاتھ میں لیے کسی خاص ارادے سے چپکے چپکے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہی تھی۔ چھتری یقیناً اس کا ہتھیار تھی۔ گریٹا سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ بھی غیر مسلح نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی آنجہانی پاپا کی ایک بیلٹ موجود تھی۔ اس نے بیلٹ والا ہاتھ بلند کیا اور دیوار کی آڑ میں سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سازشی حملہ آور کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

ارما چھتری مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے گریٹا کی تلاش میں دبے پاؤں سیڑھیوں پر چڑھی آرہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچپن میں بھی گریٹا اس پر اچانک حملہ کرنے کے لیے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر دیوار کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہوتی تھی۔ اسے قوی امکان نظر آرہا تھا کہ وہ آج بھی وہیں چھپی کھڑی ہوگی لیکن آج ارما اس کے اچانک حملے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

آخری سیڑھی سے ایک سیڑھی پہلے ارما نے رک کر گہری سانس لی۔ وہ اچانک ہی اپنی چھتری کی نوک دیوار کے عقب میں گھیرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔ گریٹا کو اس حملے کی توقع تھی اور وہ اس سے پہلے ہی بھاری بیلٹ گھما کر ارما کے رسید کرنے کے لیے تیار تھی۔

ارما کی چھتری جونہی نیزے کی طرح دیوار کے عقب میں آئی گریٹا نے اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہوئے گھما کر بیلٹ رسید کی۔ حملہ ناکام ہونے پر ارما توازن کھو بیٹھی۔ اس نے اپنے آپ کو گرتے محسوس کیا تو گریٹا کے استخوانی بازو مضبوطی سے پکڑ لیے جس

کے نتیجے میں دونوں ہی بہنیں سیڑھیوں پر لڑھکتی نیچے آنے لگیں چند لمحے بعد وہ دونوں نیچے ہال میں مڑی تڑی سی حالت میں ساکت پڑی تھیں۔

☆ ☆ ☆

چند گھنٹے بعد برائن نے کال بیل بجائی۔ برائن گھروں میں اخبار ڈالنے والا لڑکا تھا۔ آج اس کا بل وصول کرنے کا دن تھا اس لیے وہ اخبار ڈالنے سے پہلے گھنٹی بجا رہا تھا۔ کئی بار گھنٹی بجانے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے مخصوص درز سے اخبار اندر پھینک دیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

اخبار دونوں بہنوں سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑا تھا اور اس کی صفحہ اول کے خبر تھی۔

ڈاک کی چوری کا معما حل ہو گیا۔

مڈل ٹاؤن پولیس نے ایک ماہ کی تفتیش اور سراغرسانی کے بعد گزشتہ روز باون سالہ ارل اسمتھ کو گرفتار کر لیا جو محکمہ ڈاک کا ملازم نہیں ہے لیکن پولیس اور محکمہ ڈاک کے حکام اس امر پر متفق ہیں کہ گزشتہ تین ماہ میں ارل اسمتھ کم از کم دو لاکھ خطوط چوری کر چکا ہے۔

دراصل اس کے اپارٹمنٹ کی ایک کھڑکی جنرل پوسٹ آفس کے ڈلیوری روم کے عین سامنے کھلتی تھی اور دونوں کے درمیان فاصلہ بھی بہت کم تھا۔ ارل نے لکڑی کا ایک لمبا سا چمٹا تیار کر رکھا تھا۔ وہ جب بھی مناسب موقع دیکھتا تھا اس چمٹے کے ذریعے ڈلیوری روم میں پڑے ڈاک کے انبار سے بہت سے خطوط اٹھا لیتا تھا۔

پولیس چیف چارلس نے بتایا کہ اس کے اپارٹمنٹ سے ہزاروں بغیر کھلے خطوط برآمد ہوئے ہیں۔ وہ لفافوں سے نقدی، چیک، ڈرافٹ، ڈرافٹ اور بذریعہ ڈاک ارسال کیے جانے والے چارج کارڈ چوری کرتا تھا لیکن اس چکر میں بہت سے ایسے خطوط بھی اس کے ہاتھ لگ کر ضائع ہو جاتے تھے جن میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتی تھی لیکن وہ مکتوب الیہ کے لیے نہایت ضروری ہوتے تھے۔ بہت سی دستاویزات اور اہم کاغذات اس طرح ضائع ہوئے۔ مختلف اسٹورز اور کمپنیوں سے بھیجے جانے والے پارسل بھی ارل اسمتھ اڑا لیتا تھا۔ ان سے برآمد ہونے والی سیکڑوں مصنوعات اس کے اپارٹمنٹ میں پائی گئی ہیں۔

پولیس چیف نے بتایا کہ یہ کامیابی پوسٹ ماسٹر مسٹر گرینڈ کے تعاون سے ممکن ہوئی۔ مسٹر گرینڈ کے پاس کافی دنوں سے مقامی شہری شکایات لے کر آ رہے تھے کہ انہیں ڈاک سے بہت سی ایسی چیزیں موصول نہیں ہو رہی ہیں جو موصول ہونی چاہیے تھیں۔

پوسٹ ماسٹر نے جنرل پوسٹ آفس میں ہر طرح سے تفتیش اور خفیہ تحقیقات کر کے دیکھیں لیکن کسی ملازم کے ڈاک چوری کرنے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ پوسٹ ماسٹر کا کہنا ہے کہ عام تاثر کے برعکس بہت کم ڈاک گم ہوتی ہے۔ انہوں نے شہریوں کا شکریہ ادا کیا کہ اس معاملے میں انہوں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ارل اسمتھ کی دست برد سے بچے ہوئے خطوط متعلقہ افراد کو ارسال کر دیے جائیں گے۔

خبر کے ساتھ اخبار میں کچھ تصاویر بھی چھپی ہوئی تھیں۔ کریٹا اور ارما اگر چاہتیں تو ہاتھ بڑھا کر اخبار اٹھا سکتی تھیں اور یہ خبر پڑھ سکتی تھیں لیکن اب ایسا ممکن نہیں تھا۔

اگر کوئی ان کے قریب موجود ہوتا تو دیکھ سکتا تھا کہ اب وہ کبھی اخبار کی طرف..... بلکہ کسی بھی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائیں گی۔

کیوں کہ دونوں کے سر بار بار سیڑھیوں سے ٹکرائے تھے۔ دونوں مر چکی تھیں!

☆ ☆

ذہن نارسا

مبین طاہر

تنہائی کبھی انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور کبھی اس کو نفسیاتی مریض بنادیتی ہے۔ایک ایسی ہی نفسیاتی مریضہ کی کہانی جس نے اپنی تنہائی کا ساتھی ایک ٹی وی پروگرام کو بنالیا تھا۔

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد آپ بھی ہمدردی کرنے سے پہلے ایک دفعہ سوچیں گے ضرور

مسز مارٹن اپنے مختصر سے اپارٹمنٹ میں چھوٹے سے بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر پروگرام ”لاکھوں میں ایک“ بڑے شوق سے دیکھتی تھیں۔ یوں تو انہیں ٹی وی کے بیشتر پروگرام ہی بہت پسند تھے لیکن سوال و جواب پر مبنی انعامی پروگرام ”لاکھوں میں ایک“ کا تو ہر صبح انہیں بہت ہی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔

بہت سے بوڑھے اور تنہا لوگوں کی طرح ٹی وی ہی ان کے لیے وقت گزاری کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لیکن وہ تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آگے چلی گئی تھیں۔ پروگرام دیکھتے وقت ان کا تخیل انہیں کہیں سے کہیں لے جاتا۔ پروگرام ”لاکھوں میں ایک“ کا میزبان کیمرے کی طرف دیکھ مسکراتا تو انہیں لگتا کہ وہ بطور خاص ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ پروگرام کے شرکاء میں سے کسی کے ساتھ کوئی خاص بات کرتا تو انہیں یوں لگتا کہ اس نے وہ بات ان سے کی تھی۔

کسی فلم یا ٹیلی پلے کا کوئی کردار بہت اچھا، پردرد یا پرسوز مکالمہ بولتا تو انہیں گمان گزرتا کہ وہ ان ہی کے ساتھ بولا گیا تھا اور ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ کبھی کبھی ان کا تخیل ان کے ساتھ اور ہی شرارت کرتا۔ وہ حقیقی زندگی کی کسی بات، کسی واقعے کے بارے میں سوچ رہی ہوتیں اور اسی دوران ٹی وی کا کوئی کمپیئر یا ٹی وی ڈرامے کا کوئی کردار مکالمہ بول دیتا اور انہیں یہ محسوس ہوتا کہ اس نے ان سے ان کی حقیقی زندگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے، انہیں کوئی اشارہ دیا ہے، ان کی زندگی کا کوئی بھید کھولا ہے۔

غرضیکہ ٹی وی ان کا شریک مسرت، رفیق غم، ان کا دوست، ان کا ساتھی، ان کا مشیر اور دنیا کی بہت سی پوشیدہ باتیں جاننے والا نہایت قابل اعتماد عزیز یا رشتے دار تھا جو گھر میں ان کے ساتھ رہ رہا تھا، انہیں مشورہ دیتا تھا۔ ان کی زندگی میں دو ہی چیزوں کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ وہ صرف دو چیزوں کے سہارے زندگی کے باقی دن گزار رہی تھیں۔ ایک ٹی وی اور دوسرا ان کا خواب پلا ہوا، موٹا تازہ نارنجی رنگ کا بلا۔۔۔ جس کا نام ونکی تھا۔

اس روز بھی وہ صبح ہی صبح اپنا ناشتا جو صرف چائے اور توس پر مشتمل تھا، لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ پروگرام ”لاکھوں میں ایک“ شروع ہو چکا تھا۔ میزبان راؤنڈ ونی مقابلے کے شرکاء کا تعارف حاضرین سے کرا رہا تھا اور مسز مارٹن قدرے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھیں۔ ”آج وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے گا یا نہیں؟“

انہیں جلد ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔ راڈرونی کا کلوز اپ آیا۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ مسز مارٹن کے خزاں رسیدہ وجود میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ رگ و پے میں حرارت سی پھیل گئی۔

"تم نے دیکھا ونکی۔۔۔؟" انہوں نے مرتعش لہجے میں اپنے بلے کو مخاطب کیا۔ "وہ صرف میرے لیے مسکرایا تھا۔ آج کا دن اچھا گزرے گا۔"

صوفے پر لیٹے ہوئے جسیم بلے نے اپنا نام سن کر ایک کان ہلایا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ مسز مارٹن پیار سے اس کا سر سہلانے لگیں۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کے دن کا آغاز خوش گوار انداز میں ہو رہا تھا۔

مسز مارٹن ایک مدت سے تنہا رہ رہی تھیں۔ اب تو انہیں ماہ و سال کا حساب بھی یاد نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب کی بات تھی کہ وہ اپنے شوہر لیونارڈ مارٹن کے ساتھ رہتی تھیں لیکن اتنا انہیں یاد تھا کہ زندگی اس وقت بھی کچھ ایسی خوش گوار نہ تھی۔ شادی کے ابتدائی برسوں سے بھی کوئی حسین یاد وابستہ نہ تھی۔

اس کی بڑی وجہ غربت تھی۔ انہوں نے تو یہی دیکھا تھا کہ زندگی کا ہر نیا دن نئے مالی مسائل لے کر آیا تھا۔ ان دنوں انہوں نے جلدی جلدی نہ جانے کتنے اپارٹمنٹ تبدیل کیے۔ ہر اپارٹمنٹ ڈربے سے مشابہ تھا اور اس میں پھیلی ہوئی بو مسز مارٹن کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ وہ بو گھٹیا بیئر کی ہوتی تھی۔ مارٹن کی زندگی کی واحد دلچسپی بیئر تھی۔ دن رات وہ کچھ اس طرح بیئر پیتا تھا جیسے اس کا دنیا میں آنے کا مقصد ہی بیئر

پینا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک مسز مارٹن اپارٹمنٹ کو بیئر کی بو سے پاک نہیں کر سکی تھیں۔

جتنا عرصہ شوہر زندہ رہا' مسز مارٹن اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی رہیں۔ ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے کیرول رکھا تھا۔ اس کے جوان ہونے تک وہ اسے اس رسوائی اور بری شہرت سے بچانے کی کوشش کرتی رہیں جو ان کے شوہر کی وجہ سے اس کنبے کے حصے میں آئی تھی۔ انہوں نے کیرول کو غربت کے اثرات سے بچانے کی بھی اپنی سی کوشش کی۔

لیکن اس ساری جدوجہد کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سترہ سال کی ہوتے ہی وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنے کے لیے گھر سے بھاگ گئی۔ اب وہ کیلیفورنیا میں رہ رہی تھی اور بیس سال سے اس نے پلٹ کر ماں کی خبر نہیں لی تھی' اسے کبھی اپنے ہاں مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ تو خط بھی شاذونادر ہی لکھتی تھی۔ اسے شاید یاد بھی نہیں تھا کہ ماں نے اس کے لیے کیا کیا قربانیاں دی تھیں۔ کبھی کبھی تو مسز مارٹن تعجب سے سوچا کرتیں کہ اگر اب کیرول ان کے سامنے آئے تو وہ اسے پہچان بھی سکیں گی یا نہیں؟

ان کی زندگی کو مارٹن ہی نے قابل رحم بنائے رکھا اور پچاس برس کی عمر کو پہنچ کر وہ بستر پر گر گیا۔ تین سال وہ بستر پر رہا۔ مسز مارٹن نے دن رات اس کی خدمت کی۔ ان کے پاس جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی' وہ جلد ہی اس کی دواؤں' آپریشن اور علاج معالجے کے دیگر سلسلوں میں خرچ ہو گئی۔

تاہم اس مرد کے باحوصلہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ بستر علالت پر بھی وہ یہ فرمائش کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس کی بیوی صرف ایک بار کہہ دے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہی بیوی جسے اس نے غربت' فاقہ کشی' رسوائی اور دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ اس کی فرمائش پر مسز مارٹن اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے' منہ پھیر کر کچن میں چلی گئیں۔

اب بڑھاپا وہ شکاگو کے اس عسرت زدہ علاقے میں چھوٹے چھوٹے دو کمروں کے اس غریبانہ سے اپارٹمنٹ میں گزار رہی تھیں جو ایک پرانی عمارت میں واقع تھا۔ وہ صرف سودا سلف لینے کے لیے گھر سے نکلتی تھیں۔ پڑوسیوں سے ملنا جلنا وہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ نئے زمانے کے ان لوگوں کو دوسروں کے آرام اور خوشی کا ذرا بھی خیال نہیں تھا اور وہ ہمیشہ دوسروں کو ستانے کی فکر میں رہتے تھے۔ انہوں نے تو کئی بار عمارت کے نگراں سے شکایت بھی کی تھی کہ ان کے فلاں فلاں پڑوسی یا پڑوسن نے انہیں ستانے کے لیے کیا کیا حرکتیں کیں لیکن نگراں نے ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ان کا وہم تھا۔ وہ سوچتی بہت زیادہ تھیں اس لیے بہت سی باتیں فرض کر لیتی تھیں۔ نگراں کی اس رائے پر مسز مارٹن تلملا کر چپ ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کی بھی شکایت کرنا چھوڑ دی تھی۔

اب ان کا ٹی وی' اس پر نظر آنے والے لوگ اور ان کا ونگی۔ یہی ان کا کنبہ تھا جس کے ساتھ وہ زندگی کے یکسانیت زدہ روز و شب گزار رہی تھیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ محبت انہیں اپنے ونگی سے تھی۔ چھ سال قبل وہ چوہے جتنا تھا اور ایک عقبی گلی میں بھوک پیاس سے بدحال میاؤں میاؤں کرتا انہیں ملا تھا۔ اب وہ خوب فربہ اندام تھا اور مسز مارٹن کو جتنا عزیز تھا اتنا شاید بعض لوگوں کو اپنی اولاد بھی عزیز نہیں تھی۔

ٹی وی پر اس وقت پروگرام "ہمیں جینے دو" چل رہا تھا۔ اس موضوع پر ہر بار ایک مختلف فلم دکھائی جاتی تھی۔ اس وقت وہ فلم میں کھوئی ہوئی تھیں جب دروازے پر دستک ہوئی۔ مسز مارٹن نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی کوشش تھی کہ دستک دینے والا واپس چلا جائے۔

لیکن وہ بھی واپس جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ کئی بار دستک دینے کے بعد بہ آواز بلند بولا۔ "مسز مارٹن! میں بوب ہوں۔ دروازہ کھولیے۔"

بوب عمارت کے نگراں کا نام تھا۔ مسز مارٹن ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائے بغیر بادل ناخواستہ الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھیں اور زنجیر ہٹائے بغیر دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ بوب بولا۔ "دروازہ کھولیے۔ آپ شکایت کررہی تھیں کہ باتھ روم کی کسی ٹونٹی سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ میں اسے ٹھیک کرنے آیا ہوں۔"

مسز مارٹن نے دروازہ کھولا۔ بوب ابھی اندر آہی رہا تھا کہ نارنجی رنگ کی کوئی چیز بلّی کی سی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایک لمحے کی تاخیر سے دونوں کو احساس ہوا کہ وہ تو ونگی تھا جو کچھ دیر سے باہر جانے کو بے قرار تھا اور موقع پاتے ہی تیزی سے نکل گیا تھا۔ مسز مارٹن ہمیشہ اسے اپنے ساتھ لے کر نکلتی تھیں، تنہا کبھی باہر جانے نہیں دیتی تھیں اور اس وقت چونکہ وہ ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھیں اس لیے انہوں نے ونگی کی بے تابی پر دھیان نہیں دیا تھا۔

ونگی پلک جھپکتے میں راہداری سے گزر کر سیڑھیوں پر پہنچ چکا تھا۔ مسز مارٹن بے تابی سے چلائیں۔ "ونگی۔ ونگی... واپس آؤ۔" پھر وہ برہمی سے بوب سے مخاطب ہوئیں۔ "دیکھا... تمہاری وجہ سے ونگی نکل گیا۔ جاؤ جلدی سے اسے واپس لاؤ... ہائے میرا ونگی!"

بوب نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنی بے زاری چھپاتے ہوئے بولا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔"

لیکن ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی عمارت میں ونگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ مسز مارٹن اس دوران دروازے پر کھڑی ہاتھ ملتی رہیں اور ونگی کو پکارتی رہیں۔ بوب ناکام واپس آیا تو مسز مارٹن نے فرمائش کی کہ انہیں ہر فلیٹ کا دروازہ کھٹکا کر ونگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔

بوب نے بادل ناخواستہ ہامی بھرلی اور مسز مارٹن بیڈ روم سلیپروں میں ہی کھسر پھسر کرتی اس کے ساتھ ہولیں۔ ہر دروازے پر دستک دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ کرایہ دار گھر پر نہیں تھے، کچھ صحیح طرح انگلش نہیں سمجھتے تھے اور کچھ نے اچھی خاصی ناراضی کا اظہار کیا کیوں کہ ان کے آرام میں خلل پڑا تھا۔ اس وقت تقریباً دوپہر کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا جب وہ چھٹی منزل پر ایک دروازے پر پہنچے جس پر مسز ڈانس کے نام کی تختی لگی تھی۔

بوب اس دروازے پر رکتے ہوئے بولا "مجھے معلوم ہے یہ خاتون تنہا رہتی ہے اور رات کو کام کرتی ہے، دن میں سوتی ہے۔ اس وقت یہ بے چاری سو رہی ہوگی اس سے ہم شام میں معلوم کرلیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" مسز مارٹن چلا اٹھیں۔ "تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ ونگی کبھی اپارٹمنٹ سے اکیلا باہر نہیں نکلا۔ معلوم نہیں وہ کہاں نکل جائے اور اس کا کیا حال ہو۔ ہمیں اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

دروازے پر دستک دی گئی۔ کچھ دیر بعد بکھرے بالوں اور غنودگی زدہ چہرے والی ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ بے چاری گہری نیند سے اٹھ کر آرہی تھی۔ بوب نے جب اپنی آمد کی وجہ بیان کی تو نیند کے خمار سے بوجھل اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم نے ایک بلے کے بارے میں پوچھنے کے لیے مجھے جگادیا؟"

وہ شاید اسے گالیاں سنانے والی تھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مسز مارٹن کے چہرے پر پڑگئی جو بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ تب وہ گویا اپنا غصہ پیتے ہوئے بولی "خاتون! فی الحال تو میں نے تمہارے بلے کو نہیں دیکھا۔ نظر آیا تو ضرور بتاؤں گی۔" اس نے ٹھک سے دروازہ بند کرلیا۔

وہ آخری اپارٹمنٹ تھا۔ بوب نے اعلان کیا۔

"اس کا مطلب ہے وہ چلا گیا... میرا ونگی گم ہوگیا۔" مسز مارٹن ہاتھ ملتے ہوئے رونے لگیں۔

"وہ کہیں باہر نہیں جائے گا۔ واپس آجائے گا۔ جب اسے بھوک لگے گی تب تو ضرور آجائے گا۔ ہوسکتا ہے آپ نیچے پہنچیں تو وہ دروازے پر کھڑا آپ کا انتظار کررہا ہو۔ مجھے تو اب بہت سے کام کرنے ہیں، میں چلتا ہوں۔" بوب جلدی سے کھسک لیا۔

نیچے پہنچ کر مسز مارٹن کا دل ڈوبنے لگا۔ ونکی وہاں نہیں آیا تھا۔ مزید کچھ دیر سسکیاں لینے کے بعد مسز مارٹن نے پولیس کو فون کیا۔ فون ریسیو کرنے والے آفیسر کی آواز سے اندازہ ہوا کہ پہلے تو وہ مسز مارٹن کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا تاہم بعد میں اس نے ہمدردانہ انداز میں بات کرتے ہوئے ونکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرلی۔ مسز مارٹن نے اسے ونکی کی تمام نشانیاں تفصیل سے بتائیں پھر اصرار کیا کہ آفیسر ساری تفصیلات پڑھ کر انہیں سنائے تاکہ انہیں یقین ہوجائے کہ اس نے رپورٹ صحیح لکھی تھی۔ آفیسر نے ان کی یہ فرمائش بھی پوری کردی۔

فون بند کرکے مسز مارٹن نے ونکی کے چھوٹے سے برتن میں کلیجی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے جو انہیں گلی کا قصاب جس کا نام وہائٹ تھا' خاص طور پر کاٹ کر دیتا تھا۔ مسز مارٹن وہ برتن لیے پچھلی سیڑھیوں پر ونکی کے انتظار میں بیٹھی رہیں اور وقفے وقفے سے اسے آوازیں دیتی رہیں۔ حتیٰ کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا اور سردی اتنی بڑھ گئی کہ باہر بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ مجبوراً وہ اندر آگئیں۔

ونکی کے بغیر وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ گویا بہت بڑا اور خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ مسز مارٹن ایک ہاتھ سے ونکی کا چھوٹا سا گدا سینے سے لگائے دوسرے ہاتھ سے سوپ پیتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگیں۔ منگل کی رات کی خصوصی فلم چل رہی تھی۔ وہ ایک المیہ فلم تھی۔ مسز مارٹن کے آنسو سوپ میں مدغم ہونے لگے۔ فلم کے آخر میں مصیبت زدہ ہیروئن سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "اس دنیا میں کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو پروا نہیں۔۔۔" اس کا چہرہ دھندلا گیا۔

مسز مارٹن ٹشو پیپر سے ناک پونچھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ یہ دنیا والے کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

رات بھر وہ ونکی کا گدا سینے سے لگائے کھڑکی کے قریب راکنگ چیئر پر بیٹھی رہیں۔ کبھی ذرا غنودگی میں چلی جاتیں' کبھی چونک کر عقبی کھڑکی کے شیشے سے سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگتیں۔ ونکی کا برتن وہ سیڑھیوں پر ہی رکھ آئی تھیں لیکن وہ جوں کا توں رکھا تھا۔ اس میں موجود کلیجی کے ٹکڑے سیاہ ہوتے جارہے تھے۔

صبح ہوگئی اور ونکی واپس نہ آیا۔ سورج نے جونہی کمرے میں روشنی پھیلائی مسز مارٹن جھرجھری سی لے کر کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان کی بے خواب آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ افسردہ سے لہجے میں انہوں نے گویا خالی کمرے کو مخاطب کیا۔ "ونکی یقیناً" مرچکا ہے۔ میرا ونکی مرچکا ہے اور کسی کو کوئی پروا نہیں۔ میرے آس پاس کے لوگوں میں سے ہی کسی نے اسے پکڑ کر مار دیا ہوگا۔ یہ دنیا والے ہمیشہ کسی نہ کسی پر ظلم ڈھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میں ایک بوڑھی' کمزور اور تنہا عورت ہوں۔ میں بھلا کیا کرسکتی ہوں۔"

ناشتے اور اپارٹمنٹ کی صفائی کے بعد انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ ڈیوٹی پر موجود آفیسر نے انہیں بتایا کہ نارنجی رنگ کے کسی بلے کے بارے میں ابھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

"سراغ ملے نہ ملے' تمہیں کیا پروا۔ تم کون سا اسے تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہو۔" مسز مارٹن نے تلخ لہجے میں کہا اور کھٹ سے فون بند کردیا۔

وہ عمارت کے نگران بوب کے گھر بھی گئیں تاکہ ایک بار پھر اس سے ونکی کو تلاش کرنے کے لیے کہیں لیکن وہ گھر پر نہیں ملا اور اس کی بیوی نے صاف کہہ دیا۔ "وہ چوتھی منزل پر ایک دروازہ مرمت کررہا ہے اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ایک بلے کو تلاش کرتا پھرے۔"

دل میں غم و غصے کا طوفان لیے مسز مارٹن "لاکھوں میں ایک" دیکھنے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئیں۔ چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔ پروگرام کے شرکا آج اتنے احمق اور کوڑھ مغز تھے کہ ان کے ساتھ دماغ سوزی کرتے ہوئے بے چارہ راڈرونی ان کی طرف دیکھ کر مسکرانا بھی بھول گیا۔ ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔

س وقت چونکیں جب تیز موسیقی کے درمیان انہوں نے کمپیئر کو یہ کہتے سنا۔ "یہ کام... مسز ڈائس کا ہے۔"

مسز مارٹن سن سی ہو کر رہ گئیں اور کئی منٹ تک ساکت بیٹھی رہیں۔ انہوں نے نہ تو یہ سنا کہ راڈرونی نے اس سے پہلے کیا کہا تھا اور اس کے بعد تو وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی تھی۔ انہوں نے جو کچھ سنا تھا اس پر انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے راڈرونی نے براہ راست ان سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن آج کی تھی تو بڑے کام کی بات کی تھی۔ ظاہر ہے وہ ان کا دوست اور خیر خواہ تھا۔ اسے بھلا ان سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

"مسز ڈائس..." وہ آنکھیں سکیڑ کر ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "مسز ڈائس نے میرے ونکی کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن کیوں راڈ؟ مجھے بتاؤ تو سہی اس ظالم عورت نے ایسا کیوں کیا؟"

لیکن راڈرونی اب مقابلے کے دوسرے شرکا سے سوال و جواب میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ مڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ مسز مارٹن چند لمحے اپنے چائے کے کپ کو تکتی رہیں۔ ان کے ذہن میں طوفان برپا تھا۔ وہ اٹھیں اور پچھلی سیڑھیوں کے راستے تہ خانے کی طرف چل دیں جہاں ان کا لاکر موجود تھا جو چھوٹے سے اسٹور کا کام دیتا تھا۔

دوسری صبح مسز ڈائس منہ اندھیرے ڈیوٹی سے واپس آرہی تھی۔ وہ تمام رات کھلی رہنے والی ایک ریکیٹ میں کام کرتی رہتی تھی اور اس وقت سخت تھکی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے نرم گرم بستر کا تصور تھا اور وہ عمارت کی عقبی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔

پانچویں منزل پر اسے اندھیرا نظر آیا۔ شاید وہاں کی لائٹ خراب تھی۔ اس منزل کی سیڑھیاں وہ اندھیرے میں احتیاط سے چڑھ رہی تھی۔ وہ تنگ سی سیڑھیوں کے کونے پر پہنچی تو اچانک ہی اندھیرے سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ وہ غالباً کوئی پستہ قامت سا شخص تھا جو اپنے سائز سے کہیں بڑا، بے ہنگم سا اوور کوٹ اور پیشانی تک جھکا ہوا ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔

خوف سے مسز ڈائس کا منہ کھلا لیکن چیخ اس کے حلق سے برآمد نہ ہو سکی کیوں کہ اسی لمحے اس کا پاؤں کسی چکنی چیز پر پھسل گیا۔ وہ ایک سیڑھی نیچے کمر کے بل چوبی جنگلے پر جا ٹکی لیکن اس ہیولے نے جلدی سے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اسے دھکا دے دیا۔ وہ چوبی جنگلے کے اوپر سے الٹ کر پانچ منزل نیچے سیدھی پارکنگ لاٹ کے پختہ فرش پر سر کے بل جا گری۔ اس کے گرنے کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن آس پاس اگر کوئی اور سننے والا ہوتا تو یقیناً جھرجھری لے کر رہ جاتا۔ ہیولے پر شاید اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

دن چڑھے مسز مارٹن اپنے ناشتے کے برتن دھو رہی تھیں جب انہوں نے باہر راہداری میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ انہوں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تو بوب کو ایک دراز قد پولیس آفیسر کے ساتھ راہداری میں کھڑے دیکھا۔ آفیسر نوجوان ہی تھا اور اس کے چہرے پر کم عمری کی بشاشت اور معصومیت تھی۔

"تم میرے بلے ونکی کے بارے میں کوئی خبر لے کر آئے ہو؟" مسز مارٹن نے آفیسر سے پوچھا۔ "میرا خیال ہے وہ مر چکا ہے۔"

آفیسر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا شاید بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، بوب نے مسز مارٹن کو مخاطب کیا۔ "بلڈنگ میں ایک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"حادثہ...؟ کیسا حادثہ؟" مسز مارٹن نے آنکھیں سکیڑیں۔

"تمہیں یاد ہے چھٹی منزل پر مسز ڈائس رہتی تھی؟" بوب نے پوچھا۔

مسز مارٹن نے بے وقوفانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ تب نوجوان پولیس آفیسر بولا "وہ اوپر کی کسی منزل سے گر کر مر گئی ہے۔ آپ نے صبح منہ اندھیرے

کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں سنی؟"

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مزمارٹن آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولیں۔ "اوہ۔۔۔ خدا کی پناہ! یہ عمارت تو اب رہنے کے لیے بالکل محفوظ نہیں رہی۔" پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔ "وہ عورت شراب کے نشے میں تو نہیں تھی؟ آج کل مرد کیا، عورتیں کیا، سبھی بہت شراب پیتے ہیں۔"

آفیسر جلدی سے بولا۔ "معاف کیجئے ہم نے آپ کو زحمت دی۔ ہم اب چلتے ہیں۔"

وہ یوب کے ساتھ جانے کے لیے مڑا تو عقب سے مسز مارٹن نے پکارا۔ "سنو۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"مرفی۔۔۔ میڈم!" آفیسر نے ملائمت سے جواب دیا۔

"میرا خیال تھا تمہیں میرے بلے کے بارے میں کچھ علم ہو گا۔ اس کا نام ونکی ہے۔ وہ نارنجی رنگ کا ایک بہت پیارا بلا ہے۔ میں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ دنیا میں میرا اس کے سوا کوئی نہیں۔۔۔" وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں اس کی کچھ اور نشانیاں گنوانے لگیں۔ انہیں افسوس تھا کہ وہ مر چکا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسے کسی نے مارا تھا لیکن یہ باتیں پولیس آفیسر کو معلوم نہیں ہونی چاہیے تھیں۔

"میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا میڈم!" پولیس آفیسر کے لہجے میں خلوص تھا۔

"آؤ، اندر آجاؤ۔ چائے پینا پسند کرو گے؟" مسز مارٹن نے دعوت دی اور انہیں خود پر حیرت ہوئی۔ مدتوں سے عمارتوں کے نگرانوں کے سوا کسی نے ان کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

"بہت شکریہ لیکن معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔" مرفی نے نہایت شائستگی اور ملائمت سے کہا پھر وہ رخصت ہو گیا۔

اس روز پروگرام "لاکھوں میں ایک" کے دوران راڈرونی ان سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ لیکن مسز مارٹن کو احساس تھا کہ وہ کن انکھیوں سے ان کی طرف ضرور دیکھ رہا تھا۔ مسز مارٹن نے اثبات میں سر ہلا کر اسے تسلی دی کہ انہیں اس کا پیغام سمجھنے میں وقت نہیں ہوئی تھی اور اس کی روشنی میں جو قدم اٹھانا ضروری تھا وہ انہوں نے اٹھا لیا تھا۔

"لاکھوں میں ایک" کے بعد فلم سیریز "ہمیں چھ دو" شروع ہوئی۔ اس میں آج کی فلم بھی رنج و الم سے بھرپور تھی۔ ہیروئن پر صدموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ آخری سین میں جب کہ وہ غموں سے چور اسپتال کے بیڈ پر لیٹی تھی، ایک ڈاکٹر سفید کوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ تب ہیروئن یکدم بستر سے اٹھی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ "یہی اس المیے کا ذمے دار ہے، یہ قصائی۔۔۔"

اس کے بعد اشتہار چلنے لگے۔ مسز مارٹن کا سر گھوم رہا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دکھتے ہوئے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ تو یہ قصائی کا کام تھا!" وہ بڑبڑائیں۔ "راڈرونی سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ صحیح مجرم کی نشاندہی نہیں کر سکا تھا۔۔۔ کبھی تو میں کہوں، آج وہ مجھ سے نظر کیوں نہیں ملا رہا تھا۔ بے چاری مسز ڈانس!"

مسز مارٹن نے وہ رات بھی بے خوابی اور بے آرامی میں گزاری۔ دوسری صبح وہ بہت جلدی اٹھ کر تیار ہو گئیں۔ سردی بہت تھی۔ انہوں نے گرم کپڑے، اوور کوٹ اور دستانے پہنے اور پیدل قصاب وہائٹ کی دکان تک پہنچیں۔ ابھی دکان کھلی نہیں تھی لیکن شیشے کے دھند لائے ہوئے دروازے سے مسز مارٹن دیکھ سکتی تھیں کہ وہائٹ اندر گوشت کاٹنے کی مشین کے پاس کھڑا کام میں مصروف تھا۔ مسز مارٹن نے مستعدی سے دروازے پر دستک دی۔

وہائٹ نے پلٹ کر دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ دروازے پر آکر اس نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "مسز مارٹن! آپ سائن بورڈ نہیں دیکھ رہیں؟ دکان ابھی نہیں کھلی۔ آپ تھوڑی دیر میں آجائیے گا۔"

"میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا دوپہر کے کھانے کے لیے بھیڑ کی چانپیں لیتی چلوں۔ میرے لیے مشکل ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے' بوڑھی عورت ہوں' سیڑھیاں چڑھنا اترنا اور پیدل چلنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ وہائٹ کو دھکیلتی دکان میں داخل ہو چکی تھیں اور وہائٹ کو شاید اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ انہوں نے اپنے عقب میں بند کر دیا تھا۔ انہوں نے قصاب کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی ڈھٹائی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کی آنکھوں میں احساس جرم یا پچھتاوے کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ وہ یقیناً" ایک سنگدل اور بدفطرت انسان تھا۔ برسوں وہ بے چارے ونکی کے لیے کلیجی کاٹ کاٹ کر دیتا رہا تھا اور اب شاید اسی کو کاٹ کر اپنے سرد خانے میں لٹکا چکا تھا۔ اس تصور سے مسز مارٹن کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"بھیڑ کی چانپیں تو ابھی سرد خانے میں ہیں مسز مارٹن! میں بہت مصروف ہوں۔۔۔"

مسز مارٹن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تمہاری برسوں پرانی گاہک ہوں مسٹر وہائٹ! کیا تم میرے لیے اتنی سی زحمت بھی نہیں کر سکتے؟ میں نے اس سے پہلے کبھی تم سے کوئی خصوصی فرمائش کی ہے؟" ان کا لہجہ التجائیہ تھا اور چہرے پر بے پناہ بے چارگی تھی۔

وہائٹ نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ چھت کی طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں اور آخر بے بسی سے کندھے اچکا کر سرد خانے کی چھت کی طرف چل دیا جو دکان کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ مسز مارٹن اس کے پیچھے تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یخ بستہ سرد خانے سے سرد بھاپ کا جھونکا سا باہر آیا۔

مسز مارٹن نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا اور باہر کی طرف تالے میں لگی ہوئی چابی گھما کر اسے مقفل کر دیا گیا۔ اندر کی طرف سے دھات کے دروازے پر وہائٹ کے گھونسے برسانے کی آواز آئی مگر وہ باہر بہت مدھم سنائی دے رہی تھی۔ مسز مارٹن نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے وہائٹ کے کاؤنٹر کی دراز سے کاغذ اور مارکر تلاش کر کے جلی حروف میں لکھا۔

"بیماری کی وجہ سے دکان آج بند رہے گی۔"

مسز مارٹن نے یہ کاغذ بیرونی دروازے پر چپکا دیا اور اسے بھی مقفل کر کے گھر واپس روانہ ہو گئیں۔"

دوسری صبح دستک سن کر انہوں نے دروازہ کھولا تو پولیس آفیسر مرفی کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ سردی زدہ اور ٹھٹھرن سے چور دکھائی دے رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا مسز مارٹن! میں ایک بار پھر آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اس بات کی بھی معذرت کہ اس بار بھی میں آپ کے ونکی کے بارے

مچھی

ایک مکینک نے دور سے ایک کار آتی دیکھی جو ہر چند فٹ پر اچھلتی تھی۔ اس نے سوچا کہ نزدیک ترین سروس اسٹیشن بھی یہاں سے ایک میل دور ہے' اسے کار والے پر رحم آ گیا اور اس نے کار والے کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے اشارے سے کار کو روکا اور ہمدردی کے لہجے میں بولا۔ "اس قدر بگڑی ہوئی گاڑی لے کر نکلنا نہیں چاہیے۔ مکینک گھر بلوا لینا چاہیے یا پھر "ٹو" کر کے لے جائیں۔"

کار کے ڈرائیور نے مکینک کو گھورا' پھر بولا۔ "کار میں..... چ..... کوئی خرابی نہیں..... چ..... دراصل..... چ..... مجھے ہچکیاں آ..... چ..... رہی ہیں۔!"

☆.....☆

میں کوئی خبر نہیں لایا۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"تو کیا ابھی تک مسز ڈائس کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اس بار معاملہ قتل کا ہے اور ہم آس پاس کے تمام لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔" مرفی نے جواب دیا۔

"اب اس بلڈنگ میں قتل بھی ہونے لگے۔ خدا کی پناہ! ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا ایک دوسرے کو قتل کرنے پر لگی ہوئی ہے۔" مسز مارٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"نہیں... قتل اس عمارت میں نہیں ہوا مسز مارٹن! گلی کے قصاب مسٹر وہائٹ کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ یہ بتائیں' آپ نے حال ہی میں گلی میں کسی مشکوک قسم کے شخص کو گھومتے پھرتے تو نہیں دیکھا؟"

"مسٹر وہائٹ کو قتل کر دیا گیا ہے؟" مسز مارٹن نے سخت حیرت زدہ نظر آنے کی کوشش کی۔ "میں تو اسے برسوں سے جانتی تھی۔" پھر انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم مشکوک قسم کے شخص کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ مجھے تو اس معاشرے میں سبھی مشکوک نظر آتے ہیں۔ کیا مسٹر وہائٹ کے ہاں ڈاکا پڑا تھا جس میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے؟"

"نہیں۔ ہمارا خیال ہے کسی نے دشمنی کی بنا پر اسے قتل کیا ہے۔ اسے اس کے سرد خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔" مرفی نے بتایا۔

"اوہ خدایا...!" مسز مارٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آج کل تو کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔ مجھ جیسی بوڑھی عورت کے لیے تو یہ حالات سخت خوف زدہ کر دینے والے ہیں۔"

مرفی اپنی نوٹ بک بند کر چکا تو مسز مارٹن بولیں۔ "تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے آنجہانی بھائی کی یاد آجاتی ہے۔ آؤ... اندر آجاؤ۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لو۔ ونکی کے بغیر میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں۔"

مرفی کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ بھی بہت اچھی خاتون ہیں۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی دادی اماں یاد آجاتی ہیں۔ میں آپ کے بلے کی تلاش میں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ چائے میں اس وقت بھی نہیں پی سکتا' ڈیوٹی پر ہوں لیکن کبھی فرصت ہوئی تو ضرورت آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گا۔" وہ رخصت ہو گیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر مسز مارٹن اپنے میلے کپڑے دھونے کے لیے تہ خانے میں چلی گئیں۔ لانڈری روم میں انہوں نے اپنے کپڑے مشین میں ڈالے اور ان کے دھلنے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ ان کا ذہن ایک بار پھر ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ اچانک انہوں نے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ وہ باتیں کرتے ہوئے دروازے کے قریب سے گزر کر لانڈری روم میں چلے گئے۔ انہیں لانڈری روم میں مسز مارٹن کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ مسز مارٹن ان کی آوازیں صاف طور پر سن سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو عمارت کا نگراں بوب تھا۔ دوسرا کوئی نامعلوم شخص تھا۔

نامعلوم شخص بولا۔ "سنا ہے پرسوں تم اس خبطی بڑھیا کا بلا تلاش کر رہے تھے۔ تمہیں اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے آج کل؟"

بوب نے جواباً جو کہا مسز مارٹن... وہ نہیں سن سکیں پھر نامعلوم شخص نے بھی کچھ کہا جس پر دونوں نے قہقہہ لگایا پھر بوب کی آواز سنائی دی۔ "تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟" اس کے بعد وہ اداکاروں والے انداز میں بولا۔ "پولیس کے سامنے میں اسی طرح اعتراف جرم کروں گا۔ ہاں آفیسر! میں نے اسے کتوں کو مارنے والا زہر دے دیا تھا۔ مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس جرم میں مجھے بجلی کی کرسی نصیب ہوگی۔"

دونوں نے پہلے سے بلند قہقہہ لگایا پھر وہ نامعلوم شخص گتے کا ایک بڑا سا کارٹن اٹھائے لاکر روم سے نکلا اور لانڈری روم کے دروازے کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ کچھ دن سے وہ اکثر ہی عمارت میں نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ بلڈنگ کا انتظام بھی سنبھال رہا تھا۔ شاید وہ بوب کی جگہ لینے والا تھا۔

مسز مارٹن اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں۔ ان دونوں کی باتیں سن کر ان کی رگوں میں لہو سرد ہو گیا تھا اور انہیں سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اب ان پر انکشاف ہوا تھا کہ اصل قاتل تو بوب تھا جب وہ ونکی کو واپس لانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑا تھا تبھی اسے پکڑ کر نیچے کہیں بند کر آیا تھا اور محض مسز مارٹن کو دکھانے کے لیے ان کے ساتھ تلاش کی مہم پر نکلا تھا۔ مسز مارٹن کے دل میں درد کی لہر اٹھی۔ جب ونکی کو کہیں چھپا کر، بند کر کے رکھا گیا ہو گا تو وہ کتنا خوف زدہ ہوا ہو گا۔ شاید اس نے میاؤں میاؤں کر کے اپنی لگن کو پکارا بھی ہو گا۔ پھر بوب نے محض انہیں ستانے کے لیے نہ جانے کس سفاکی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اسے کتنا مار زہر دیا گیا ہو گا تو نہ جانے اس پر کیا گزری ہو گی! کس اذیت کے عالم میں اس نے جان دی ہو گی!

مسز مارٹن متاسفانہ انداز میں سر ہلا رہی تھیں۔ مسز ڈائس اور مسٹر وہائٹ تو خواہ مخواہ ہی مارے گئے تھے۔ غلطی سے قتل ہو گئے تھے۔ اصلی مجرم تو بوب تھا۔ بظاہر کس معصومیت سے وہ ان کا ہمدرد بنا ہوا تھا۔ ونکی کی تلاش میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مکار... شیطان کہیں کا!

مسز مارٹن دبے قدموں لاکر روم میں جا پہنچیں۔ بوب ایک لاکر میں سر گھسائے کھڑا تھا۔

"بوب!" مسز مارٹن نے پکارا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری ہتھوڑا تھا جو ٹھک سے اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اچھلا تو اس کا سر لاکر کے دروازے سے ٹکرا گیا۔

"مسز مارٹن! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" بوب سر سہلاتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ ونکی کا کچھ پتا چلا؟"

مسز مارٹن نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پچھتاوے یا احساس جرم کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ مسز مارٹن کو حیرت ہوتی تھی کہ دنیا کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ اتنے ڈھیٹ اور بے حس ہوتے جا رہے تھے کہ اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔

"نہیں۔ ونکی کا کچھ پتا نہیں چلا۔" بوب نے جواب دیا۔ "لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ مل جائے گا یا خود ہی لوٹ آئے گا۔"

"تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ۔ تم نے ونکی کی تلاش کے سلسلے میں میری بہت مدد کی ہے۔ تم اوپر آ کر میرے ساتھ چائے پینا پسند کرو گے؟"

"شکریہ مسز مارٹن! میں اس وقت بہت مصروف

.....اقوال.....

☆ کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ تلاش رزق کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے اللہ مجھے رزق دے۔ تمہیں معلوم ہے کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔

☆ لوگ بیماری کے خوف سے غذا چھوڑ دیتے ہیں مگر عذاب کے ڈر سے گناہ نہیں چھوڑتے۔

☆ چار ہزار اقوال میں سے میں نے چار کلے منتخب کیے ہیں۔ ان میں سے دو یاد رکھنے کے اور دو بھول جانے کے قابل ہیں۔

☆ "اللہ اور موت کو یاد رکھو۔"

☆ "اپنی نیکی اور دوسرے کی بدی کو بھول جاؤ۔"

ہوں۔ ویسے بھی میں چائے کا کچھ زیادہ شوقین نہیں ہوں۔"

"تو پھر میں کافی بنالوں گی۔" یہ کہتے ہوئے مسز مارٹن نے غمزدہ سے انداز میں نظریں جھکالیں۔ "لیکن مجھے معلوم ہے تم کافی پینے بھی نہیں آؤ گے۔ تم یہی سوچتے ہوگے کہ کون اس پاگل بڑھیا کے ہاں جاکر وقت ضائع کرے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں... نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بوب جلدی سے بولا۔ "اچھا... ایسا کرتا ہوں... میں کل دس بجے آپ کے ہاں چائے پینے آؤں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" مسز مارٹن نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس جاتے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اپنے کچن میں پہنچ کر انہوں نے الماری کے سامنے کرسی رکھی اور الماری کے اوپر رکھے ہوئے کاٹھ کباڑ میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ جلد ہی انہیں اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ چوہے مار زہر تھا۔ ڈبا تقریباً پورا ہی بھرا ہوا تھا۔

دوسری صبح ساڑھے نو بجے تک مسز مارٹن گھر میں ہی بنائے ہوئے تازہ تازہ بسکٹ اور گرم گرم کافی وغیرہ اپنی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر سجا چکی تھیں۔ چوہے مار زہر کا خالی ڈبا وہ بلڈنگ کی برقی بھٹی میں پھینک چکی تھیں۔ وہ خود کافی کے بجائے چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں اور زیر لب کچھ گنگنا بھی رہی تھیں۔ انہیں بوب کا انتظار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ دروازے پر بوب کے بجائے پولیس آفیسر مرفی کھڑا تھا۔

"ہیلو میڈم!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ذرا دیکھیں تو میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔"

مسز مارٹن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرفی کی گود میں ونکی تھا۔ وہ گندا، کمزور اور بدحال نظر آرہا تھا لیکن اس کے ونکی ہونے میں بہرحال کوئی شبہ نہیں تھا۔

"تمہیں... تمہیں... ونکی مل گیا!" انہوں نے دیوانہ وار ہاتھ پھیلائے۔ مرفی نے نہایت طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بلا ان کی گود میں دے دیا۔ مسز مارٹن نے اسے سینے سے چمٹالیا۔

مرفی بولا۔ "یہ مجھے یہاں سے چند بلاک دور ایک عقبی گلی میں بھٹکتا ہوا نظر آیا۔ آپ نے تمام نشانیاں مجھے بتا رکھی تھیں۔ میں نے اسے آسانی سے پہچان لیا۔ ویسے یہ کافی شرمندہ نظر آرہا ہے۔"

"میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں تو سمجھی تھی..." انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "مجھے... مجھے یقین نہیں آرہا میرا ونکی گھر آگیا ہے۔ بھوکا لگ رہا ہے۔ میں اس کے لیے دودھ گرم کرکے لاتی ہوں..."

ان پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کچن کی طرف چل دیں۔ دراز قد مرفی کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور انہیں دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی محسوس کررہا تھا۔ وہ خوشی جو کسی کے لیے کچھ کرنے کسی کو کوئی خوشی دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

پھر اس نے میز پر سجے ہوئے کافی کے برتن اور لوازمات دیکھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا کتنی مرتبہ اسے چائے کے لیے مدعو کرچکی تھی۔ آج تو اسے چند منٹ کی گنجائش نکال ہی لینی چاہیے تھی۔ چند منٹ سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بڑھیا یقیناً احساس تنہائی کا شکار تھی۔ اگر چند منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھنے سے اسے خوشی حاصل ہوسکتی تھی تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

تازہ تازہ بسکٹ دیکھ کر اس کا جی للچا گیا۔ اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ ذائقہ بہت اچھا نہیں تھا لیکن تازہ ہونے کی وجہ سے معقول ہی لگ رہا تھا۔ اس نے دوسرا بسکٹ بھی اٹھا کر چبانا شروع کردیا اور پھر...!

☆ ☆

تائی

بشمبر داس کوشک مترجم پروفیسر رام سروپ

ہر عورت کے ضمیر میں اللہ تعالیٰ نے ممتا کا جذبہ شامل کیا ہے۔ ایک ایسی عورت کی کہانی جو نفرت و حسد کی آگ میں اپنے دل میں دبے ممتا کے جذبے سے ناواقف تھی۔

محبتوں کی چاشنی میں ڈوبے زہریلے رویوں کی عکاسی

"تاؤ جی! ہمیں لیل گاڑی (ریل گاڑی) لادو گے؟"

یہ کہتا ہوا ایک پانچ سالہ لڑکا بابو رام جی داس کی طرف دوڑا۔

بابو صاحب نے دونو بازو پھیلا کر کہا۔ "ہاں بیٹا! لادیں گے۔"

ان کے یہ کہتے کہتے لڑکا ان کے پاس آگیا۔ انہوں نے اس کو گود میں اٹھالیا۔ اور اس کا منہ چوم کر بولے۔

"کیا کرے گا ریل گاڑی کا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "اس میں بیٹھ کے بلی دلی جائیں گے چنی کو بھی لے جائیں گے۔ بابو جی کو نہیں لے جائیں گے۔ ہمیں لیل گالی نہیں لا کر دیتے۔ تاؤ جی تم لاؤ گے تو تمہیں لے جائیں گے۔"

بابو۔ "اور کسے لے جائے گا؟"

لڑکا۔ پل بھر سوچ کر بولا۔ "بچھ اول کسی کو نہیں نے جائیں گے۔"

پاس ہی بابو رام جی داس کی بیوی بیٹھی تھی۔ بابو صاحب نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور اپنی تائی کو نہیں لے جائے گا۔؟"

لڑکا کچھ دیر اپنی تائی کی طرف دیکھتا رہا۔ تائی بھی اس وقت ذرا چڑھی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ لڑکے کو ان کے چہرے کا وہ انداز اچھا نہ لگا۔ چنانچہ وہ بولا "تائی کو نہیں لے جائیں گے۔"

تائی جی سپاری کترتی ہوئی بولیں "اپنے تاؤ جی ہی کو لے جا۔ مجھ پر تو مہربانی رکھ۔"

تائی جی نے یہ بات بڑے روکھے پن کے ساتھ کہی۔ لڑکا کے اس خشک سلوک کو فوراً تاڑ گیا۔ بابو صاحب نے پھر پوچھا۔ "تائی کو کیوں نہیں لے جائے گا؟"

لڑکا۔ "تائی ہمیں پیال نہیں کلتیں۔"

بابو۔ "اگر پیار کریں تو لے جائے گا؟"

لڑکے کو اس میں کچھ شک تھا۔ تائی کا یہ انداز دیکھ کر اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ پیار کریں گی۔ اس لیے لڑکا خاموش رہا۔

بابو صاحب اسے اپنی بیوی صاحبہ کے پاس لے جا کر ان سے بولے۔ "لو اسے پیار کر لو۔ یہ تمہیں بھی لے جائے گا۔"

مگر بچے کی تائی شریمتی رامیشوری دیوی کو شوہر کی یہ بے چل بازی اچھی نہ لگی وہ تنک کر بولی۔ "تم ہی ریل پر بیٹھ کر جاؤ۔ مجھے نہیں جانا ہے۔"

بابو صاحب نے رامیشوری کی بات پر دھیان نہ دیا بچے کو ان کی گود میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ "پیار نہیں کرو گی تو پھر ریل میں نہیں بٹھائے گا۔ کیوں بھئی منوہر؟"

منوہر نے تاؤ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ادھر تائی نے منور کو اپنی گود سے دھکیل دیا۔ منوہر نیچے گر پڑا جسم کو تو چوٹ نہیں لگی۔ مگر دل پر چوٹ لگی۔ لڑکا رو پڑا۔ بابو صاحب نے لڑکے کو گود میں اٹھا لیا۔ چمکار پچکار کر چپ کرایا اور اس کے بعد اسے کچھ پیسے اور ریل گاڑی لا دینے کا وعدہ کر کے چھوڑ دیا۔ لڑکا منوہر ڈری ہوئی نگاہوں سے اپنی تائی کی طرف تاکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ منوہر کے جانے کے بعد بابو رام جی داس رامیشوری سے بولے۔ "تمہارا یہ کیسا سلوک ہے؟ بچے کو دھکیل دیا جو اس کے چوٹ لگ جاتی تو؟"

رامیشوری جی منہ بنا کر بولیں۔ "لگ جاتی تو اچھا ہوتا کیوں میری کھوپڑی پر لادے دیتے تھے۔ اور آپ ہی اب ایسی باتیں کرتے ہیں!"

بابو صاحب کڑھ کر بولے۔ "اس کو کھوپڑی پر لادنا کہتے ہیں۔"

رامیشوری۔ "اور نہیں تو کسے کہتے ہیں؟ تمہیں تو اپنے آگے اور کسی کا سکھ دکھ سوجھتا ہی نہیں۔ نہ جانے کب کس کا جی کیسا ہوتا ہے۔ تمہیں ان باتوں کی کوئی پروا نہیں اپنی چہل سے کام ہے؟"

بابو۔ "بچوں کی پیاری پیاری باتیں سن کر تو جی چاہے کیسا ہی ہو خوش ہو جاتا ہے۔ مگر تمہارا دل معلوم نہیں کس دھات کا بنا ہوا ہے؟"

رامیشوری۔ "تمہارا ہو جاتا ہو گا اور ہونے کو ہوتا بھی ہے۔ مگر ویسا بچہ بھی تو ہو! پرائے دھن سے بھی کہیں گھر بھرتا ہے؟"

بابو صاحب تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔ "اگر سگا بھتیجا بھی پرایا دھن کہا جا سکتا ہے۔ تو پھر میں سمجھتا کہ اپنا دھن کسے کہیں گے۔"

رامیشوری ذرا فاجوش میں آ کر بولیں۔ "باتیں بنانا بہت آتا ہے۔ تمہارا بھتیجا ہے تم چاہو جو سمجھو۔ مگر

مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ ہمارے بھاگ ہی پھوٹے ہیں۔ نہیں تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ تمہارا چلن تو دنیا سے نرالا ہے۔ آدمی اولاد کے لیے معلوم نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ پوجا پاٹ کراتے ہیں۔ برت رکھتے ہیں۔ مگر تمہیں ان باتوں سے کیا کام؟ رات دن بھائی بھتیجوں میں مگن رہتے ہو۔"

بابو صاحب کے چہرہ پر نفرت کے جذبات جھلکنے لگے انہوں نے کہا۔ "پوجا پاٹ۔ برت سب ڈھکوسلا ہے جو چیز تقدیر میں نہیں وہ پوجا پاٹ سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی میرا تو یہ اٹل عقیدہ ہے۔"

شریمتی جی کچھ کچھ رونے کے لہجہ میں بولیں۔ "اسی عقیدے نے تو چوپٹ کر رکھا ہے! ایسے ہی عقیدے پر سب بیٹھ جائیں تو کام کیسے چلے۔ سب وشواش پر ہی بیٹھے رہیں۔ تو آدمی کاہے کو کسی بات کے لیے کوشش کرے۔"

بابو صاحب نے سوچا کہ بیوقوف عورت کے منہ لگنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے بیوی کی بات کا جواب نہ دیا اور وہاں سے ٹل گئے۔

☆ ☆ ☆

بابو رام جی داس دولت مند آدمی ہیں۔ کپڑے کی آڑھت کا کاروبار کرتے ہیں۔ لین دین بھی ہے۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ اس کا نام ہے کرشن داس۔ دونوں بھائیوں کا کنبہ اکٹھا ہی ہے۔ بابو رام جی اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اور چھوٹے بھائی کرشن داس کی تقریباً" اکتیس سال کی۔ رامجید اس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ کرشن داس کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا وہی جس سے قارئین واقف ہو چکے ہیں اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی کی عمر تقریباً" دو سال کی ہے۔"

رام جی داس اپنے چھوٹے بھائی اور ان کے بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ ایسا پیار کہ اس کے اثر سے انہیں اپنا بے اولاد ہونا کھٹکتا ہی نہیں۔ چھوٹے بھائی کی اولاد کو وہ اپنی ہی اولاد سمجھتے ہیں۔ دونوں بچے بھی بابو رام داس سے اس قدر ہلے ہوئے ہیں کہ انہیں اپنے باپ سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ مگر رام جی داس کی یہ رامیشوری کو اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ دن رات اولاد ہی کی فکر میں گھلا کرتی ہے۔ چھوٹے بھائی کے بچوں سے شوہر کی محبت اس کی آنکھوں میں خار کے مانند کھٹکتی ہے۔"

رات کو کھانے پینے سے فارغ ہو کر رام جی داس پلنگ پر لیٹے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے ہلکے لکے جھونکوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ پاس ہی دوسری چارپائی پر رامیشوری ہتھیلی پر سر رکھے کسی فکر میں مستغرق تھی۔ دونوں بچے ابھی بابو صاحب کے پاس سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس گئے تھے۔

بابو صاحب نے اپنی بیوی کی طرف کروٹ لے کر کہا۔ "آج تم نے منور کو ایسی بری طرح سے دھکیلا تھا کہ مجھے اب تک اس کا افسوس ہے۔ کبھی کبھی تمہارا سلوک بالکل حیوانوں کا سا ہو جاتا ہے۔"

رامیشوری بولی۔ "تمہیں نے تو مجھے ایسا بنا کر رکھا ہے اس روز اس پنڈت نے کہا تھا کہ ہم دونوں کے جسم پتر میں اولاد کا جوگ ہے اور اپائے کرنے سے اولاد ہو بھی سکتی ہے۔ اس نے اپائے بھی بتائے تھے۔ مگر تم نے ان میں سے ایک بھی اپائے کر کے نہ دیکھا۔ بس تم تو انہیں دونوں میں مگن ہو۔ تمہاری اس بات سے رات دن میرا کلیجہ سلگتا رہتا ہے۔ آدمی اپائے تو کر کے دیکھتا ہے۔ پھر ہونا نہ ہونا تو بھگوان کے ادھین ہے۔"

بابو جی ہنس کر بولے۔ "تمہاری جیسی سیدھی عورت بھی۔۔۔ کیا کہوں تم ان جوتشیوں کی باتوں پر اعتبار کرتی ہو جو دنیا بھر کے جھوٹے اور ٹھگ ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے ہی کی روٹیاں کھاتے ہیں۔"

رامیشوری تنک کر بولی۔ "تمہیں تو سارا جہان جھوٹا ہی نظر آتا ہے۔ یہ پوتھی پران بھی سب جھوٹے ہیں پنڈت وغیرہ کچھ اپنے طرف سے بنا کر تو کہتے ہیں نہیں۔ شاستر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہی وہ بھی کہے ہیں۔ شاستر جھوٹا ہے تو وہ بھی جھوٹے ہیں۔ انگریزی کیا پڑھی۔ اپنے آگے کسی کو گنتے ہی نہیں۔ جو باتیں باپ دادا کے زمانے سے چلی آتی ہیں انہیں بھی جھوٹا بتاتے

ہیں۔"

بابو صاحب:۔ "تم بات تو سمجھتی نہیں اپنی ہی رٹی جاتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ جوتش شاستر جھوٹا ہے۔ ممکن ہے وہ سچا ہو۔ مگر جو تشیوں میں زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں انہیں جوتش سے پوری واقفیت تو ہوتی نہیں وہ ایک چھوٹی موٹی کتابیں پڑھ کر جوتشی بن بیٹھتے اور لوگوں کو ٹھگتے پھرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی باتوں پر کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے۔؟"

رامیشوری:۔ "ہوں۔ سب جھوٹے ہی ہیں۔ تمہیں ایک بڑے سچے ہو۔ اچھا! ایک بات پوچھتی ہوں بھلا تمہارے دل میں اولاد کی خواہش کیا کبھی نہیں ہوتی؟"

اب کے رامیشوری نے بابو صاحب کے دل کا نازک حصہ پکڑا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ اس کے بعد ایک لمبی سانس لے کر بولے "بھلا ایسا کون شخص ہوگا۔ جس کے دل میں اولاد کا منہ دیکھنے کی خواہش نہ ہوا؟ مگر کیا کیا جائے۔ جب تک نہیں ہے اور نہ ہونے کی امید ہے۔ تو پھر فضول فکر کرنے سے کیا حاصل؟ علاوہ اس کے جو بات اپنی اولاد سے ہوتی وہ ہی بھائی کی اولاد سے بھی ہو رہی ہے۔ جس قدر محبت اپنے بچوں سے ہوتی۔ اتنی ہی ان سے بھی ہے۔ جو خوشی ان کی کلولوں سے حاصل ہوتی ہے وہی ان کی کھیلوں سے بھی ہو رہی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ فکر کیوں کی جائے۔"

رامیشوری کڑھ کر بولی۔ "تمہاری سمجھ کو میں کیا کہوں اسی سے تو رات دن جلا کرتی ہوں۔ بھلا یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہارے پیچھے کیا ان ہی سے تمہارا نام چلے گا۔"

بابو صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔ "واجی تم بھی کہاں کی پوچ باتیں لائیں۔ نام اولاد سے نہیں چلتا۔ نام چلتا ہے اپنے نیک عملوں سے۔ تلسی داس کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ سورداس کو مرے کتنی مدت ہو چکی؟ اسی طرح جتنے مہاتما ہو گزرے ہیں۔ ان سب کا نام کیا ان کی اولاد ہی کی بدولت چل رہا ہے؟ سچ پوچھو تو اولاد سے جتنی نام چلنے کی امید رہتی ہے اتنا ہی نام ڈوب جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ مگر نیک عمل ایک ایسی چیز ہے جس سے نام روشن ہونے کے سوائے ڈوبنے کا کبھی کھٹکا ہی نہیں رہتا۔ ہمارے شہر میں رائے گردھاری لال کتنے مشہور آدمی تھے؟ ان کی اولاد کہاں ہے؟ مگر ان کی دھرم شالا اور یتیم خانے سے ان کا نام اب تک چلا جارہا ہے اور ابھی معلوم نہیں کتنی مدت چلے گا۔

رامیشوری:۔ "شاستر میں لکھا ہے۔ جس کے بیٹا نہیں ہوتا اس کی مکتی نہیں ہوتی۔"

بابو:۔ "مکتی پر مجھے اعتقاد ہی نہیں۔ مکتی ہے کس چڑیا کا نام۔ اگر مکتی کا ہونا مان بھی لیا جائے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ بیٹے والے کی مکتی ضرور ہو جاتی ہے؟ مکتی کا بھی کیسا آسان طریقہ ہے یہ جتنے بیٹے والے ہیں۔ سب ہی کی تو مکتی ہوگی؟"

رامیشوری کی کوئی جواب نہ سوجھا۔ بولی۔ "اب تم سے کون بکواد (بکواس) کرے؟ تم تو اپنے سامنے کسی کو مانتے ہی نہیں۔"

☆ ☆ ☆

انسان کا دل مامتا کی آماجگاہ ہے۔ کیسی ہی مفید اور کیسی ہی خوب صورت چیز کیوں نہ ہو۔ جب تک انسان اس کو پرائی سمجھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے پیار نہیں کرتا۔ لیکن بھدی سے بھدی اور بالکل ناکارہ چیز کو بھی اگر آدمی اپنی سمجھتا ہے۔ تو اس سے پیار کرتا ہے۔ پرائی چیز کیسی ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ اس کے ضائع ہو جانے پر آدمی ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں کرتا اپنی چیز خواہ کیسی ہی بھدی ہو۔ کسی مصرف کی نہ ہو۔ اگر وہ جاتی رہے تو آدمی کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی چیز ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی پرائی چیز سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں جب تک آدمی اس چیز کو اپنی نہیں بنالیتا یا کم از کم اس خیال کو اپنے دل میں مضبوط و مستحکم نہیں کرلیتا کہ یہ چیز میری ہے اس وقت تک اسے صبر نہیں آتا۔ اپنایت

سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور محبت سے اپنائیت۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاتے۔"

اگرچہ رامیشوری کو ماں بننے کی خوش قسمتی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس کا دل ماں بننے کا کامل طور پر اہل تھا۔ اس کے دل میں وہ اوصاف اندر چھپے ہوئے تھے۔ جو ایک ماں کے دل میں ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے ابھی نشوونما نہیں پائی تھی۔ اس کا دل اس زمین کے مانند تھا۔ جس میں بیج تو پڑا ہوا ہے۔ مگر اس کو سینچ کر اور اس طرح بیج کو پھوڑ کر اس کو نکال کر زمین کے اوپر لانے والا کوئی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دل ان بچوں کی طرف مائل تو تھا مگر جب اسے دھیان آتا تھا کہ یہ بچے میرے نہیں دوسرے کے ہیں۔ اس وقت اس کے دل میں ان کی طرف سے عناد پیدا ہوتا تھا۔ نفرت پیدا ہوتی تھی بالخصوص اس وقت اس کا اعناد اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ جب وہ یہ دیکھتی تھی کہ اس کا شوہر ان بچوں پر جان چھڑکتا ہے۔ جو اس کے (رامیشوری) کے نہیں ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ رامیشوری کھلی چھت پر بیٹھی ہوا کھا رہی تھی۔ پاس ہی اس کی دیورانی بھی بیٹھی تھی۔ دونوں بچے دوڑ دوڑ کر کھیل رہے تھے۔ رامیشوری ان کے کھیل کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا میں اڑتے ہوئے ان کے بال کنول کے مانند شگفتہ۔ ان کے ننھے ننھے چہرے' ان کی پیاری پیاری توتلی باتیں۔ ان کا چلانا' لوٹ جانا' بھاگنا وغیرہ وغیرہ حرکتیں اس کے دل کو ٹھنڈا کر رہی تھیں کہ یکایک منوہر اپنی بہن کو مارنے دوڑا۔ وہ کھلکھلاتی ہوئی رامیشوری کی گود میں جا گری۔ اس کے پیچھے پیچھے منوہر بھی دوڑتا ہوا آیا اور وہ بھی اس کی گود میں جا گرا۔ رامیشوری اس وقت سارا بغض عناد بھول گئی۔ اس نے دونوں بچوں کو اسی طرح دل سے لگا لیا جس طرح وہ آدمی لگاتا ہے۔ جو بچوں کے لیے ترس رہا ہو۔ اس نے بڑی تشنہ کامی سے دونوں کو پیار کیا۔ اس وقت اگر کوئی ناواقف شخص اسے دیکھتا تو اسے یہی یقین ہوتا کہ رامیشوری ہی ان بچوں کی ماں ہے۔

دونوں بچے بہت دیر تک اس کی گود میں کھیلتے رہے۔ یکایک اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ پا کر بچوں کی ماں وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

منوہر سے "ریل گاڑی" کہتے ہوئے بابو رام جی داس چھت پر آئے۔ ان کی آواز سنتے ہی دونوں بچے رامیشوری کی گود سے تڑپ کر نکل بھاگے۔ رام جی داس نے پہلے دونوں کو خوب پیار کیا پھر بیٹھ کر ریل گاڑی دکھانے لگے۔

ادھر رامیشوری کی نیند سی ٹوٹی۔ شوہر کو بچوں میں مگن دیکھ کر ابرو تن گئے۔ بچوں کی طرف سے دل میں پھر وہی بغض و عناد اور نفرت کے جذبات بیدار ہو اٹھے۔

بچوں کو ریل گاڑی دے کر بابو صاحب رامیشوری کے پاس آئے اور مسکرا کر بولے۔ "آج تو تم بچوں کو بڑا پیار کر رہی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں بھی ان کے لیے محبت ضرور ہے۔"

رامیشوری کو شوہر کی یہ بات بہت بری لگی۔ اسے اپنی کمزوری پر بہت افسوس ہوا۔ صرف افسوس ہی نہیں اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ وہ افسوس اور غصہ شوہر کی مندرجہ باتوں سے اور بھی دوبالا ہو گیا۔ اس کی کمزوری شوہر پر ظاہر ہو گئی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔

رام جی داس بولے۔ "اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کے لیے سوچ کرنا فضول ہے۔ اگر تم ان سے محبت کرنے لگو تو تمہیں یہ ہی اپنی اولاد معلوم ہونے لگیں گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم ان سے محبت کرنا سیکھ رہی ہو۔"

یہ بات بابو صاحب نے بہت صاف دل سے کہی تھی مگر رامیشوری کو اس میں طنز کی تیزبو معلوم ہوئی۔ اس نے کڑھ کر اپنے دل میں کہا "انہیں موت بھی نہیں آتی۔ مرجائیں پاپ کٹے۔ آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہنے سے پیار کرنے کو جی للچا ہی اٹھتا ہے ان کے مارے کلیجہ اور بھی جلا کرتا ہے۔"

بابو صاحب نے بیوی کو خاموش دیکھ کر کہا "اب جھینپنے سے کیا فائدہ؟ اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں۔"

رامیشوری جل بھن کر بولی "مجھے کیا پڑی ہے جو میں محبت کروں گی۔ تم ہی کو ان کی محبت مبارک رہے۔ نگوڑے آپ ہی آ آ کے گھستے ہیں۔ ایک گھر میں رہنے سے کبھی کبھی ہنسنا بولنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی پرسوں ذرا یونہی دھکیل دیا۔ اس پر تم نے ہینگڑوں باتیں سنائیں۔ سنکٹ میں جان ہے نہ یوں چین نہ دوں چین!"

بابو صاحب کو بیوی کی باتیں سن کر بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے کرخت لہجے میں کہا "معلوم نہیں کیسے دل کی عورت ہے ابھی اچھی خاصی بیٹھی بچوں کو پیار کر رہی تھی۔ میرے آتے ہی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگی۔ اپنی مرضی سے تو خواہ کچھ ہی کرے مگر میرے کہنے سے بلیوں اچھلتی ہے معلوم نہیں میری باتوں میں کون سا زہر گھلا رہتا ہے اگر میرا کہنا ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ تو نہ کہوں گا مگر اتنا یاد رکھو کہ اب جو کبھی ان کے بارے میں نگوڑے سگوڑے وغیرہ برے الفاظ استعمال کیے تو اچھا نہ ہوگا۔ تم سے یہ بچے مجھے کہیں زیادہ پیارے ہیں۔"

رامیشوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے دل کی جلن اور غصہ کو وہ آنکھوں کے ذریعے نکالنے لگی۔

جوں جوں بابو رام جی داس کی محبت بچوں سے بڑھی جاتی تھی۔ رامیشوری کا بغض و عناد اور نفرت زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اکثر بچوں کے لیے میاں بیوی میں کہا سنی ہو جاتی تھی اور رامیشوری کو شوہر کی سخت سست سننی پڑتی تھی۔ جب رامیشوری نے یہ دیکھا کہ بچوں کی وجہ سے ہی وہ اپنے شوہر کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے اس وقت اس کے دل میں ایک سخت طوفان برپا ہوا۔ اس نے سوچا پرائے بچوں کے پیچھے یہ مجھ سے محبت کم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے ہر وقت برا بھلا کہا کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بچے ہی سب کچھ ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں۔ دنیا مرتی جاتی ہے مگر ان دونوں کو موت نہیں۔ یہ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئے۔ نہ یہ ہوتے نہ مجھے یہ دن دیکھنے پڑتے جس دن یہ مریں گے۔ گھی کے چراغ جلاؤں گی۔ انہوں نے ہی میرے گھر کا ستیاناس کر رکھا ہے۔"

یوں ہی کچھ دن گزرے۔ ایک دن حسب معمول رامیشوری چھت پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ جا رہے تھے۔ خیالات اور کچھ نہیں۔ وہ اپنی اولاد کا نہ ہونا۔ شوہر کا بھائی کی اولاد سے محبت کرنا وغیرہ وغیرہ کچھ دیر بعد جب اس کے خیالات اسے تکلیف دہ معلوم ہونے لگے تو وہ اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لیے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

وہ ٹہل رہی تھی کہ منوہر دوڑتا ہوا آیا۔ منوہر کو دیکھ کر اس کی بھنویں چڑھ گئیں اور وہ چھت کی چہار دیواری پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر رنگ برنگ کے پتنگ اڑ رہے تھے۔ منوہر کچھ دیر پتنگوں کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کوئی پتنگ کٹ کر اس کی چھت پر گرے۔ تو کیسا مزا آئے۔ دیر تک پتنگ گرنے کی امید کرنے کے بعد وہ دوڑ کر رامیشوری کے پاس آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بولا "تائی! ہمیں پتنگ منگوا دو۔"

رامیشوری نے جھٹک کر کہا "چل ہٹ۔ اپنے تاؤ سے مانگ جا کر۔"

منوہر ذرا کھسیانا سا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس سے نہ رہا گیا۔ اب کے اس نے بڑے لاڈ میں آ کر بے حد لجاجت آمیز لہجہ میں کہا "تائی! پتنگ منگا دو۔ ہم بھی اڑائیں گے۔"

اس دفعہ اس کی بھولی بھالی درخواست سے رامیشوری کا کلیجہ کچھ پسیجا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف ٹکی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لے کر دل میں کہا "اگر یہ میرا بیٹا ہوتا تو آج مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب عورت دنیا میں نہ ہوتی۔ نگوڑا مارا کتنا خوب صورت ہے اور کیسی پیاری پیاری باتیں کرتا ہے۔ یہی جی چاہتا ہے کہ اٹھا کر چھاتی

سے لگالیں۔"

یہ سوچ کر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے والی تھی کہ اتنے میں منوہر اسے خاموش دیکھ کر بولا "تم ہمیں پتنگ نہیں منگوا دو گی۔ تو تاؤ جی سے کہہ کر تمہیں پٹوا دیں گے۔"

اگرچہ بچہ کی اس بھولی بات میں بھی بڑی حلاوت تھی مگر رامیشوری کا چہرہ مارے غصہ کے تمتما اٹھا۔ وہ اسے جھڑک کر بولی "جا کہہ دے اپنے تاؤ جی سے۔ دیکھوں وہ میرا کیا کرلیں گے؟"

منوہر ڈر کر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اور پھر تشنہ کام نگاہوں سے آسمان میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگا۔ ادھر رامیشوری نے سوچا "یہ سب تاؤ جی کے لاڈ دلار کا نتیجہ ہے کہ بالشت بھر کا لڑکا مجھے دھمکاتا ہے۔ ایشور کرے۔ اس دلار پر بجلی ٹوٹے۔"

اسی لمحہ ایک پتنگ آسمان سے ٹوٹ کر اسی چھت کی طرف آیا اور رامیشوری کے اوپر سے ہوتا ہوا منڈیر کی طرف گیا چھت کے چاروں طرف دیوار بنی ہوئی تھی جہاں رامیشوری کھڑی تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا جس کی راہ منڈیر پر آجاسکتے تھے رامیشوری اس دروازے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ منوہر نے پتنگ کو منڈیر پر جاتے دیکھا۔ پتنگ پکڑنے کے لیے وہ دوڑ کر منڈیر کی طرف چلا۔ رامیشوری کھڑی دیکھتی رہی۔ منوہر اس کے پاس سے ہو کر منڈیر پر چلا گیا۔ اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر پتنگ کو دیکھنے لگا۔ چھجے پر سے ہوتا ہوا نیچے مکان کے صحن میں جا گرا۔ ایک پاؤں چھجے کے منڈیر پر رکھ کر منوہر نے نیچے صحن میں جھانکا اور پتنگ کو صحن میں گرتے دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ وہ نیچے جانے کے لیے جلدی سے مڑا مگر پلٹتے وقت منڈیر پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ نیچے کی طرف چلا۔ نیچے جاتے جاتے اس کے دونوں ہاتھوں میں منڈیر آگئی۔ وہ اسے پکڑ کر لٹک گیا اور رامیشوری کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "تائی!"

رامیشوری نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس سانحہ کو دیکھا۔ اس کے دل میں آیا "اچھا ہے مرنے دو۔ سدا کے لیے پاپ کٹ جائے گا۔" یہی سوچ کر وہ ایک منٹ کے لیے رکی ادھر منوہر کے ہاتھ منڈیر پر سے پھسلنے لگے۔ وہ بے حد خوف زدہ اور التجا آمیز نگاہوں سے رامیشوری کی طرف دیکھ کر چلایا "ارے تائی"

رامیشوری کی آنکھیں منوہر کی آنکھوں سے جا ملیں۔ منوہر کی وہ دردناک نگاہ دیکھ کر رامیشوری کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس نے بیتاب ہو کر منوہر کو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اس کے ہاتھ منوہر کے ہاتھ تک پہنچے ہی تھے کہ منوہر کے ہاتھ سے منڈیر چھوٹ گئی۔ وہ نیچے آگرا۔ رامیشوری چیخ مار کر چھجے پر گر پڑی۔

رامیشوری ایک ہفتہ تک بخار میں بے ہوش پڑی رہی۔ کبھی کبھی وہ زور سے چلا اٹھتی اور کہنے لگتی "دیکھو دیکھو۔ گرا جارہا ہے۔ اسے بچاؤ۔ دوڑو۔ میرے منوہر کو بچالو" کبھی وہ کہتی "بیٹا منوہر! میں نے تجھے نہیں بچایا۔ ہاں ہاں! میں چاہتی تو بچا سکتی تھی۔ میں نے دیر کردی تھی۔"

منوہر کی ٹانگ اکھڑ گئی تھی۔ ٹانگ بٹھادی گئی۔ وہ رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔

ایک ہفتہ بعد رامیشوری کا بخار ہلکا ہوا۔ جب اچھی طرح سے ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔ "منوہر کیسا ہے؟"

رام جی داس نے جواب دیا۔ "اچھا ہے۔"

رامیشوری۔ "اسے میرے پاس لاؤ۔"

منوہر رامیشوری کے پاس لایا گیا۔ رامیشوری نے اسے بڑے پیار سے سینے سے لگایا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہچکیوں سے گلا رندھ گیا۔

رامیشوری کچھ دنوں بعد بالکل تندرست ہوگئی۔ اب منوہر کی بہن چنی کی طرف سے بھی اس کے دل میں بغض یا نفرت نہیں ہے اور منوہر تو اس کی جان ہوگیا ہے۔ اب اس کے بغیر اسے ایک لمحہ چین نہیں پڑتا۔

☆ ☆

نمک حلال

بشمبر داس کوشک مترجم پروفیسر رام سروپ

بشمبر داس کوشک مترجم پروفیسر رام سروپ ایک ایسے شخص کی کشمش جو ایک دوراہے پر کھڑا تھا ایک طرف اس کی خود داری تھی اور دوسری طرف اس کی نمک حلالی کا امتحان تھا ایک وفادار شخص کی ذہانت کا ماجرا۔

بہت دوڑ دھوپ اور علاج معالجہ ہوا مگر پھر بھی سیٹھ چھنگم لال کی حالت روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ وہ ہر روز چتا کے نزدیک پہنچتے جارہے تھے۔ بوڑھے چھنگم لال کو بھی یہ بخوبی معلوم ہوگیا تھا کہ ان کا بستر علالت بہت جلد بستر مرگ میں تبدیل ہونے والا ہے۔ اسی لیے انہوں نے ایک روز اپنے منیب منڑول کو اپنے پاس بلایا۔ اس وقت منڑول کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ جب منڑول آگئے تو سیٹھ چھنگم لال نے انہیں اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"منیب جی! میرا تو اب چل چلاؤ لگ رہا ہے معلوم نہیں کس وقت دم نکل جائے اچھا ہے مجھے اطمینان ہے ہاتھ پاؤں چلتے چلا جاؤں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ مجھے کوئی تمنا باقی نہیں رہی۔ دنیا کے سبھی دکھ سکھ دیکھ چکا۔ کمایا بھی خوب خرچ بھی خوب کیا۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ نانی پوتوں کا منہ بھی دیکھ لیا۔ پس اب تو ایشور جتنا جلد اس تکلیف سے چھڑائے اچھا ہے۔"

بڈھے منیب کے چہرے پر غم آمیز سنجیدگی دوڑ گئی۔ ذرا بھرائی ہوئی آواز سے انہوں نے کہا "پرماتما آپ کو اچھا کردے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟ مجھ سے دو چار برس آپ چھوٹے ہی ہیں۔ جب میں ہٹا کٹا بیٹھا ہوں۔ تو آپ کا تندرست ہوجانا کون عجب کی بات ہے۔"

سیٹھ چھنگم لال ہلکے سے ہنسے لیکن اس ہنسی میں رنج جھلکتا تھا۔ اس کے بعد بولے۔ "میرا تندرست ہونا قطعی ناممکن ہے۔ موت آٹھوں پہر میری آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے مگر معلوم نہیں وہ دیر کیوں کررہی ہے۔"

منڑول: "آپ ایسی باتیں مت سوچیے۔ ان کے سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی طبیعت کو خوش رکھیے اور یہ یقین کیجئے کہ آپ ضرور اچھے ہوجائیں گے۔"

سیٹھ چھنگم لال قدرے ناخوش ہوکر بولے "میری حالت ان امیدوں سے کبھی نہیں سدھر سکتی۔ یہ امیدیں اور یقین مجھے موت کے پنجے سے نہیں بچا سکتے۔"

منیب جی کچھ کہنے ہی کو تھے مگر سیٹھ جی نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے روک کر کہا۔ "منیب جی! آپ مجھے بہلانے کی کوشش مت کیجئے۔ اب دنیا داری کا وقت نہیں رہا۔ میں نے آپ کو جس کام کے لیے بلایا ہے اسے سنئے اور سمجھئے۔"

منیب جی: "مجھے جو ارشاد ہو اس کی تعمیل کے لیے

میں ہمیشہ۔۔۔"

سیٹھ جی: "اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو میرے ہاں رہتے ہوئے تیں برس ہو چکے ہیں۔ اتنے دنوں میں مجھے آپ کے متعلق پوری واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔ مجھے جس قدر اعتبار آپ پر ہے اتنا چنو پر بھی نہیں۔"

منیب جی: "یہ سب آپ کی عنایت۔"

سیٹھ جی "عنایت نہیں۔ سچی بات ہے۔ اچھا ذرا چنو کو بلوایئے۔"

منیب جی اٹھ کر باہر چلے گئے اور دس منٹ بعد لوٹے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا جس کی عمر تقریباً" پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ منیب جی اور نوجوان دونو آکر سیٹھ جی کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے۔

سیٹھ جی کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر بولے۔ "بیٹا چنو!"

نوجوان "ہاں پتا جی!"

سیٹھ جی "میں تو اب دو چار ہی دن کا مہمان ہوں۔"

چنو: "آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔ آپ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔ کل ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ابھی کوئی بات نہیں بگڑی۔ آپ ناحق ایسی باتیں سوچ سوچ کر طبیعت پریشان کرتے ہیں۔"

سیٹھ جی نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "خیر جو میں اچھا ہو گیا۔ تب تو کوئی بات ہی نہیں اور اگر میں چل ہی بسا۔۔۔"

چنو "یہ آپ کیا۔۔۔"

سیٹھ جی ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو روک کر بولے۔ "پہلے میری باتیں سن لو۔ پھر جو جی چاہے کہہ لینا۔ ہاں تو اگر میں چل ہی بسا تو اپنے پیچھے تمہارے لیے اپنے بجائے منیب جی کو چھوڑ تا ہوں۔"

چنو مل نے ذرا چونک کر منیب جی کی طرف دیکھا۔ منیب جی بھی کچھ گھبرا سے گئے۔

سیٹھ جی "جو تنخواہ انہیں اب دی جاتی ہے وہ ہمیشہ دیے جانا خواہ یہ کام کریں یا نہ کریں۔ جب کوئی بڑا کام کرنا یا ایسا کام کرنا جو بخوبی تمہارا سمجھا ہوا نہ ہو تو پہلے منیب جی سے اصلاح لے لینا اور جیسا یہ کہیں ویسا ہی کرنا۔"

چنو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منیب جی کی طرف دیکھتے جاتے تھے اور باپ کی باتیں سن رہے تھے۔ منیب جی چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

سیٹھ جی کچھ دیر دم لینے کے بعد بولے۔ "بس تمہارے لیے میرا یہی آخری حکم ہے۔ مجھے اور کسی بارے میں کچھ نہیں کہنا تم خود سمجھ دار ہو۔ جو مناسب سمجھنا کرنا۔"

سیٹھ جی نے پھر کچھ دیر دم لیا۔ اس کے بعد بولے۔ "منیب جی! آپ سے مجھے کچھ نہیں کہنا۔ مجھے یقین ہے کہ جو برتاؤ آپ میرے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ وہی چنو سے بھی کرتے رہیں گے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہی کریں گے۔ کیونکہ اسے آپ ہمیشہ بجائے بیٹے کے خیال کرتے رہے ہیں۔"

منیب جی نے سیٹھ جی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سیٹھ جی نے منیب جی کی طرف دیکھا۔ بوڑھے منیب کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے قطرے نکل کر ان کے جھریاں پڑے ہوئے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے سیٹھ جی کو ان بوندوں ہی کے ذریعہ اپنی بات کا جواب مل گیا۔ کیونکہ ان کا چہرہ ذرا کھل اٹھا اور انہوں نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

☆ ☆ ☆

سیٹھ جی کو مرے ہوئے تین مہینے گزر گئے۔ سیٹھ چنو مل اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لیے ان کے بعد کل کاروبار کے وہی مالک ہوئے۔ بوڑھے منیب مٹرومل جس طرح بڑے سیٹھ جی کا کام کرتے تھے۔ اسی طرح چھوٹے سیٹھ چنو مل کا کام کاج کرنے لگے۔ کام ہاتھ میں لینے کے بعد دو ماہ تک تو چنو مل اور منیب جی کی خوب بنی رہی، مگر پھر رفتہ رفتہ چنو مل کو منیب جی خار کے مانند کھٹکنے لگے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ چنو مل نوجوان تھے اور زمانہ کی رفتار سے ناواقف۔ چنانچہ الٹا سیدھا جو جی میں آتا تھا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، مگر منیب حتی الوسع انہیں روکتے تھے۔ چنو مل منیب جی کی بات مان تو لیتے تھے مگر انہیں منیب جی کی دست اندازی بہت بری لگتی تھی۔ اکثر اوقات منیب جی انہیں ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتے تھے منیب جی کی ڈانٹ ڈپٹ سے چنو مل کا گرم خون ابلنے لگتا تھا مگر کچھ تو والد کی آخری باتیں یاد کر کے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ اوائل عمری سے منیب جی کی رائے پر عمل کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے ان کی بات سے انکار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

ایک روز چنو مل نے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ باہر سیر کرنے کے لیے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان دنوں کام کا بڑا زور تھا۔ چنانچہ منیب جی نے کہا "اس وقت آپ کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے پندرہ بیس روز ٹھہر جائیے جب کام ذرا ہلکا ہو۔ اس وقت چلے جائیے گا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں سارے کام کاج کی نگرانی کر سکوں۔ نوکروں کے بھروسے اتنا بڑا کام کاج چھوڑ دینا بھی ٹھیک نہیں۔"

چنو مل ناک بھوں سکوڑ کر بولے "کیا میں نوکروں کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا ہوں؟ آخر میری موجودگی میں بھی تو وہ ہی کام کرتے ہیں۔"

منیب جی "یہ درست ہے مگر مالک کے پاس رہنے سے نوکروں کو کھٹکا رہتا ہے اور وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتے جب مالک نہیں ہوتا تو ان کو کوئی ڈر نہیں رہتا۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔"

چنومل "یہ کچھ نہیں۔ میں دوستوں سے چلنے کا پکا وعدہ کرچکا ہوں۔ اس لیے ضرور جاؤں گا۔"

منیب جی کچھ ناراض ہو کر بولے۔ "میں آپ کو اس وقت نہیں جانے دوں گا۔ دوستوں کو کہنے دیجیے۔ آدمی کو اپنا نفع نقصان دیکھنا چاہیے۔"

چنومل منیب جی کو ناراض ہوتے دیکھ کر چپ تو ہو رہے مگر انہیں ان پر بڑا غصہ آیا۔

اسی شام دوستوں سے ملاقات ہوئی تو چنومل نے کہا "بھئی میں تو اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔"

ایک دوست بولا "کیوں؟"

چنومل "منیب جی کہتے ہیں اس وقت کام زیادہ ہے میرا جانا ٹھیک نہیں۔"

دوسرا "اور تم اس بڈھے کھوسٹ کی باتوں میں آگئے؟"

چنومل "کیا کروں۔ زیادہ کچھ کہتا ہوں تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔"

پہلا "ناراض ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ وہ ہیں کون؟ نوکر لاکھ کچھ ہو۔ پھر نوکر ہی ہے۔"

چنو "یہ تو ٹھیک ہے۔"

تیسرا "یار تو خود دبو ہے ورنہ ایک نوکر کی کیا مجال ہے جو مالک پر دباؤ ڈالے۔"

دوسرا "بات سچی تو یہ ہے کہ کہنے کو تو تم خود مختار ہو گئے مگر اب بھی اتنے ہی دوسرے کے دست نگر ہو۔ جتنے بڑے سیٹھ جی کے وقت میں تھے۔ تم کچھ دودھ پیتے بچے تو ہو نہیں۔ جو اپنا نفع نقصان نہ سمجھو۔"

تیسرا "ارے یار! یہ بڈھا بڑا چلتا ہوا ہے یہ چاہتا ہے کہ تم اس کی مٹھی میں رہو۔ جتنا پانی پلائے اتنا ہی پیو۔"

پہلا "سچ مچ۔ تمہارے لیے یہ بڑے شرم کی بات ہے۔"

اس طرح سب دوستوں نے چنومل کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے یہ ٹھان لی کہ چاہے جو کچھ ہو مگر اب منیب جی کے دباؤ میں نہیں رہوں گا۔

چنومل ایک تو خود ہی منیب جی سے تنگ آگئے تھے۔ دو تم دوستوں نے بھی انہیں خوب بھر دیا تھا۔ وہ منیب جی کی بے عزتی کرنے کے لیے تیار ہو کر بیٹھے تھے۔ پس انہوں نے چھوٹتے ہی کہا "آپ ہوتے کون ہیں جو آپ کی بات مانوں؟ میں تو صرف اس لیے کہ آپ پرانے ہیں اور پتا جی بھی آپ سے صلاح و مشورہ لینے کے لیے کہہ گئے ہیں۔ آپ کا حکم مانتا ہوں لیکن آپ سر پر ہی چڑھے جاتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں سولہ آنے (ہر ایک بات میں) آپ ہی کے کہنے پر چلوں؟"

منیب جی یہ جواب سننے کے لیے تیار نہ تھے وہ چنومل کے منہ سے اس چنو کے منہ سے جسے انہوں نے گود یوں کھلایا تھا۔ جسے انہوں نے سکھا پڑھا کر فن تجارت میں ماہر بنایا تھا۔ یہ جواب سن کر سناٹے میں آگئے۔ انہیں کبھی خواب میں بھی اس جواب کی توقع نہ تھی۔ بڑی دیر تک وہ سناٹے میں کھڑے چنومل کے منہ طرف تکتے اور سوچتے رہے کہ آج وہ دن آگیا جس کے محض تصور سے ان کا دل دہلا کرتا تھا۔ آخر سنبھل کر وہ ذرا ملائم لہجہ میں بولے۔

"خیر! آپ خواہ کچھ ہی سمجھیں اور میری باتوں کا چاہے جو مطلب ہو نکالیں مگر میں جب تک یہاں بیٹھا ہوں اس کام سے ہمیشہ منع کرتا رہوں گا۔ جسے نامناسب سمجھتا ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ خواہ بنے یا بگڑے میں چپ چاپ بیٹھا بیٹھا دیکھا کروں۔"

چنومل سنجیدگی کے انداز سے بولے "اگر آپ سے نہیں دیکھا جاتا تو آپ اپنے گھر بیٹھیں۔"

چنومل کے اس فقرے سے منیب جی کی رہی سہی امید کی ڈور بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ان کے دل پر چوٹ لگی۔ ادھر خودداری کے جذبات نے بھی دل پر دباؤ ڈالا۔ انہوں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "اچھا! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ایسا ہی ہو گا۔"

چنومل منیب جی کی اس بات سے دل میں خوش ہوئے انہوں نے سمجھا "چلو اچھا ہوا۔ آنکھ پھوٹی پیر گئی۔"

☆ ☆ ☆

منیب جی نے چنومل کے ہاں جانا بند کردیا۔ بعض لوگوں نے جو منیب جی اور چنومل دونوں کے خیر خواہ تھے۔ منیب جی کو سمجھایا کہ "جانے دیجیے۔ بچہ ہے۔ اس کی بات کا برا نہ مانیے۔ آپ اپنے آقا بڑے سیٹھ جی کی بات کو یاد کیجیے۔" مگر منیب جی نے اس کا جواب دیا۔ "میں صرف اپنے مالک کی بات پر ان کے بعد بھی ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا رہا۔ میں چنو کی سب باتیں برداشت کرسکتا تھا مگر جب اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا "گھر بیٹھو" تب رہ کیا گیا؟ میرا دل نہیں مانتا کہ اب میں وہاں جاؤں۔"

لوگوں نے چنو کو بھی بہت سمجھایا بجھایا کہ تم اپنی بدسلوکی کے لیے منیب جی سے معافی مانگو اور انہیں منا کر راضی کرو مگر سمجھانے والوں کی نسبت بھڑکانے والے بہت تھے۔ چنانچہ چنومل نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ منیب جی کو بطور پنشن کچھ ماہوار دینا چاہا مگر منیب جی نے ایک پیسہ تک لینا منظور نہ کیا۔ انہوں نے کہہ دیا "میں کبھی چنومل کا نوکر نہیں رہا۔ جس کا نوکر تھا۔ اس کا تھا۔ میں چنومل کا ایک پیسہ بھی نہیں لے سکتا۔"

اس طرح چنومل پر جو تھوڑا بہت دباؤ تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اب چنومل بالکل آزاد ہوگئے۔ آزاد ہونے سے عیش پسند چنومل کے اخراجات بڑھ گئے۔ انہوں نے اپنے کاروبار کی طرف بھی مناسب دھیان دینا چھوڑ دیا۔ سارا کام تقریباً نوکروں ہی کے بھروسے پر ہونے لگا۔ سال ڈیڑھ سال اسی طرح کام چلا ان کے کاروبار کی عمارت بہت عالیشان تھی اور اس کی بنیاد کمزور ہوئی تھی۔ زمانے کے چکر نے الٹ پھیر کر کے حالات کا رنگ بدل دیا۔ چنومل کی لاپروائی آخر کار وہ دن لے ہی آئی۔ جس سے سیٹھ چھنگا مل کی فرم ڈگمگانے لگی۔

دو لاکھ کی ایک ہنڈی کا بھگتان تھا۔ چنومل کو اس کی یاد ہی نہ تھی نہ ان کے نوکروں اور منیبوں ہی نے اس پر کچھ دھیان رکھا۔ جس وقت آدمی ہنڈی لے کر دکان پر آیا اور اس نے ہنڈی کا بھگتان مانگا اس وقت چنومل کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت ان کے پاس پچاس ہزار روپے ہی تیار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر دو چار روز پہلے انہیں اس بھگتان کا دھیان آجاتا تو دو لاکھ کیا چار لاکھ کا بھگتان بھی کیا جاسکتا تھا مگر دو چار دن پہلے تو درکنار چنومل کو ایک گھنٹہ پہلے تک بھی اس کا دھیان نہ آیا۔ اب اگر روپیہ فوراً نہیں ادا کیا جاتا تو فرم دیوالیہ ہوئی جاتی ہے یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس سے چنومل جیسے لاپروا آدمی کا بھی کلیجہ ہل گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے دو چار جگہ جہاں ان کا لین دین رہتا تھا۔ روپے کے لیے آدمی دوڑائے مگر ڈیڑھ لاکھ کی رقم آسانی سے مل جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ علاوہ اس کے لوگ چنومل کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان کی فرم سے کھٹک گئے تھے۔ اس لیے جو دے سکتے تھے۔ انہوں نے بھی انکار کردیا۔ یہ حالت دیکھ کر چنومل نے اپنے منیبوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ اتنی بڑی فرم دیوالیہ ہوئی جاتی ہے۔ سیٹھ چھنگا مل کی ساری شہرت خاک میں ملی جاتی ہے۔

ان کے بڑے منیب نے کہا "ہم کیا بتائیں؟ جیسا آپ مناسب سمجھیں کریں۔"

چنومل کو رونا سا آگیا۔ بولے۔ "تم لوگوں کی لاپروائی سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ افسوس! اگر مٹرومل ہوتے تو کیا ممکن تھا کہ کبھی ایسی حالت ہوتی؟ وہ دس دن پہلے ہی سے انتظام کررکھتے۔"

منیب "ادھر آپ نے بھی کام کی طرف بالکل دھیان نہ رکھا۔ ہم لوگ کس کس بات کا دھیان رکھیں؟ ایک دو ہوں۔ تو دھیان بھی رہ سکتا ہے۔"

ادھر بھگتان لینے والے نے کہا "کیوں صاحب۔ کیا دیر ہے؟ ہنڈی کا روپیہ دیجیے۔"

چنومل اندر بیٹھے ہوئے منیبوں سے جھگڑ رہے تھے۔ آدمی نے جاکر ان سے یہ بات کہی۔

چنو نے آدمی سے کہا "کہہ دو۔ ابھی بھگتان ہوتا ہے گھبرائیں نہیں۔"

آدمی کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا اور ادھر منیب سے بولے۔ ”اب کیا کیا جائے کچھ تو بتاؤ؟“

منیب بولا ”میری سمجھ میں اگر مترومل جی آجائیں۔ تو وہ کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لیں گے۔“

چنومل کو بھی یہ بات جچ گئی۔ بولے۔ ”اچھا تو جاؤ۔ انہیں بلالاؤ۔“

منیب: ”میرے یا کسی اور کے بلائے تو وہ کبھی نہ آئیں گے اس وقت اگر آپ ہی جائیں تو وہ آسکتے ہیں۔“

چنومل نے سرجھکا کر کہا ”مجھے جانا پڑے گا۔“

اگرچہ ان کو بہت کچھ امید تھی کہ مترومل کے آنے پر اس مصیبت سے چھٹکارا ملنے کا امکان ہے۔ مگر پھر بھی ان کا دل مترومل کے پاس جانے سے پیچھے ہٹتا تھا۔

منیب: ”آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ نہ جایئے گا تو کیا دیوالیہ بنے گا؟“

چنومل: ”اچھا! میں جاتا ہوں۔ تم اس آدمی کو کہہ دو کہ بڑے منیب جی کو بلوایا ہے۔ ان کے آنے پر بھگتان کیا جائے گا۔“

یہ کہہ کر چنومل نے اسی وقت گاڑی جتوائی اور منیب جی کے مکان کی طرف چلے۔ راستے میں وہ سوچتے جاتے تھے کہ کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاتا ہوں۔ کیا وہ چلے آئیں گے؟

ان ہی خیالات میں غرق چنومل منیب جی کے مکان پر پہنچے جاڑے کے دن تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ مترومل رضائی اوڑھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے نوکر نے آکر کہا۔ ”منیب جی! سیٹھ چنومل آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

منیب جی چونک پڑے۔ بولے ”ایں! چنومل!“

نوکر: ”جی ہاں! چنومل!“

منیب جی کچھ دیر تک سناٹے میں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد بولے ”اچھا بلالاؤ۔“

چنومل ہچکچاتے ہوئے مترومل کے پاس آئے اور آتے ہی ان کے پاؤں پر گر کر رونے لگے۔ مترومل چنومل کی یہ حالت دیکھ کر پہلے تو متعجب ہوئے مگر ساتھ ہی یہ سمجھ کر کہ ان پر اس وقت کوئی بڑی مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اسی لیے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ انہوں نے محبت سے چنومل کا سر اوپر اٹھایا اور کہا۔

”کیوں بیٹا! کیا بات ہے؟ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“

چنومل نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور پھر کہا۔ ”اس وقت آپ ہی کی مدد سے ہماری ناؤ اس بھنور سے نکل سکتی ہے۔“

مترومل بھی یہ حال سن کر گھبرا گئے اور بولے ”اس حالت میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اٹھا دیتا اور جو کچھ ہے وہ تمہارا ہی ہے۔ تمہارا اس سے کام چلے تو لے جاؤ۔“

حکمت

☆ اپنے اخلاق کو اس قدر خوبصورت اور لہجے کو اس قدر دھیما رکھو کہ کسی کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔

☆ غصے پر قابو پانا ہی دانش مندی ہے۔

☆ اپنا حقیقی راز کبھی کسی کو نہ بتاؤ، خواہ وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔

☆ آزادی کا ہر لمحہ غلامی کے ہزار سال سے بہتر ہے۔

☆ نماز خوف کی دلیل ہے یہ دل سے غیر اللہ کا خوف دور کرتی ہے، نماز ادھورے انسان کو آہستہ آہستہ پورا کردینے کی ضمانت ہے، یہ اندر سے خالی انسانوں کو بھرنا شروع کردیتی ہے۔

☆ نماز اللہ کی قربت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

☆ نماز دنیا اور آخرت کے درمیان رابطے کا پل ہے۔

☆ نماز دین کا ستون ہے۔

☆ عبادت جو مخلوق کے لیے کی جاتی ہے، زمین میں دھنسا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

چنومل: "میں روپیہ پیسہ کچھ نہیں چاہتا۔ کسی طرح ایک یا دو دن کے لیے یہ موقعہ ٹال دیجئے۔ پھر تو دو لاکھ کیا میں دس لاکھ کا انتظام کرلوں گا۔"

مٹرومل چنومل کی حالت دیکھ اور ان کی مصیبت کا حال سن کر ایسے سوچ میں پڑ گئے کہ انہیں یہ دھیان ہی نہ آیا کہ یہ وہی چنومل ہے جس نے انہیں گھر بیٹھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

مٹرومل بڑی دیر تک غور کرتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔

"اچھا چلو۔" یہ کہہ کر وہ دولائی اوڑھے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ راستے میں چنومل مٹرومل کے اطمینان و سکون پر حیران ہو کر سوچنے لگے "آخر یہ کریں گے کیا؟ یہ تو ایسے بے فکر ہیں۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

اسی طرح سوچتے ہوئے چنومل مٹرومل کے ساتھ اپنے ہاں پہنچے۔ مٹرومل نے گدی پر پہنچتے ہی کہا "بھائی میں جلدی میں چلا آیا۔ کچھ کپڑا بھی نہیں پہنا ذرا ایک انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر لے آؤ۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھر گئے۔" یہ کہہ کر وہ گدی پر بیٹھ گئے۔

چنومل نے ان کے سامنے ہنڈی رکھی اور بولے "دیکھیے! اس ہنڈی کا بھگتان کرنا ہے۔"

مٹرومل بولے "بھئی ذرا انگلیاں تو سیدھی کرلوں تو دیکھوں۔ جاڑے کے مارے انگلیاں تو سیدھی ہی نہیں ہوتیں۔"

کچھ دیر بعد دہکتی ہوئی انگیٹھی مٹرومل کے سامنے آئی مٹرومل تھوڑی دیر اس میں ہاتھ سینکنے کے بعد بولے "ہاں بھئی۔ اب لاؤ ہنڈی۔ دیکھوں۔ بڑھاپے میں جسم کا برا حال ہو جاتا ہے میرے تو ہاتھ بھی اب کانپنے لگے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ہنڈی ہاتھ میں لے لی۔ اسے آنکھوں کے سامنے لائے۔ ہاتھوں کے بالکل نیچے انگیٹھی تھی۔

یکایک ان کے ہاتھ تھرائے اور ہنڈی ہاتھ سے چھوٹ کر انگیٹھی میں جا گری۔ جب تک لوگوں کا دھیان اس کی طرف جائے جائے۔ تب تک وہ جل کر راکھ ہو گئی۔

بھگتان مانگنے والے کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ادھر چنومل کا چہرہ مارے خوشی کے کھل اٹھا۔

مٹرومل کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی خود بول اٹھے۔ "کیا کہوں۔ ہاتھ ایسے کانپے کہ ہنڈی سنبھلی ہی نہیں۔ اخیر کوئی فکر نہیں۔ (بھگتان لینے والے سے) تم ہنڈی کی نقل لے آؤ اور بھگتان لے جاؤ۔ ابھی لے آؤ۔ ابھی بھگتان مل جائے گا۔"

بھگتان لینے والا جل بھن کر بولا "نقل کیا میرے پاس رکھی ہے۔ جب منگوائی جائے گی تب آئے گی۔ نقل منگواتے منگواتے میں تین چار دن لگ جائیں گے۔"

مٹرومل: "تو بھائی! اس بات کا میں کیا علاج کروں؟ وقت کی بات ہے۔ ہاتھ کانپ گیا۔ بڈھا آدمی ٹھہرا۔ مگر اس سے تمہارا بھگتان رہ تو جائے گا نہیں۔"

بھگتان لینے والا بولا "بھگتان بھلا کیا رہتا مگر تین چار دن کا بھیملا تو لگ گیا۔"

مٹرومل "اب تو لگ ہی گیا۔ کیا کیا جائے؟"

بھگتان لینے والا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "اچھا! نقل آجانے پر بھگتان لے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی چنومل مٹرومل کے قدموں پر گر پڑے اور بولے "دھن باد! میں نے اس وقت آپ کو نہیں پہچانا تھا۔ اسی لیے پتاجی آپ کا اتنا آدر کرتے تھے اور آخیر وقت مجھے یہ حکم دے گئے تھے۔"

اب مٹرومل کو دھیان آیا کہ ان کے سامنے وہی چنومل ہے۔ جس نے ان سے گھر بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "یہ سب ٹھیک ہے مگر مجھے تمہارے وہ گھر بیٹھنے والے الفاظ ابھی یاد ہیں۔ اس لیے میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

یہ کہا اور جلدی سے جوتا پہن کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔

دوسرا راستہ

محمود عالم ایڈووکیٹ

جب تمام راستے بند ہوجائیں تب بھی ایک راستہ بہرحال کھلا ہوتا ہے بس اس راستے کا احساس باقی نہیں رہتا، اس کے لیے بھی تمام راستے سدور ہوچکے تھے اور دستیاب راہ اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی جو ایک ہمدرد کے کے باعث واضح ہوگئی۔

ایک ماہر نفسیات کے کامیاب علاج سے شفا پانے والے مریض کا قصہ

مجھے دفتر جانے میں خاصی دیر ہوچکی تھی۔ اوپر سے ہوا یہ کہ جب میں تیار ہوکر جلدی جلدی ناشتا کرکے گھر سے نکلنے ہی لگا تھا' اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں جھلا کر پلٹا اور ریسیور اٹھالیا۔ "ہیلو' میں ڈاکٹر ظفریات کررہا ہوں۔"

میرا لہجہ خاصا ناخوش گوار تھا۔ میرا خیال تھا دوسری طرف میرا کوئی مریض ہوگا جو فون پر ہی اپنا مرض بتا کر درخواست کرے گا کہ میں اس کے لیے کوئی دوا تجویز کردوں۔ ایسے فون اکثر آتے رہتے تھے لیکن دوسری طرف انسپکٹر فرید حسن تھا۔ اس کی آواز شناخت کرتے ہی میری آواز اور موڈ دونوں خوش گوار ہوگئے کیونکہ وہ میرا بچپن کا دوست اور طویل عرصے کا تعلیمی ساتھی تھا۔ میں نے ہی اسے کسی بھی وقت فون کرنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ درخواست بھی کی تھی۔

اس درخواست کا پس منظر یہ تھا کہ آج کل شہر میں خودکشی کے رجحان میں خطرناک حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے میری خواہش تھی کہ میں ایسے لوگوں سے ملوں جو خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد پولیس کی تحویل میں آجاتے ہیں۔ میں ان کی ذہنی کیفیات کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا کہ موت کو اتنا قریب سے دیکھ کر ان کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے اور بچ جانے کے بعد آیا ان کے ذہن سے خودکشی کی خواہش ختم ہوگئی ہے یا وہ مزید ایسی کوشش کرسکتے ہیں۔ ساتھ ہی میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ خرابی حالات کی وہ کون سی انتہا ہے' جہاں پہنچ کر ایک

انسان زندگی جیسی عظیم نعمت کو ٹھکرا کر موت کی آغوش میں کودنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس سلسلے میں' میں نے انسپکٹر فرید حسن سے باقاعدہ درخواست کی تھی کہ اگر اسے کوئی ایسا شخص مل جائے جو خودکشی کی کوشش کرچکا ہو تو قانونی کارروائی کرنے سے پہلے وہ اس شخص کو میرے پاس لے آئے۔ مجھے انسپکٹر فرید حسن کو اپنی بات سمجھانے میں کافی دیر لگی تھی کہ ایسے کسی شخص کو' جو خودکشی چاہتا ہو۔ لاک اپ میں بند کرنا یا اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنا اس پر ظلم کرنے کے مترادف تھا۔

کافی دیر سمجھانے اور دلائل دینے کے بعد میں اسے قائل کرسکا تھا کہ ایک ایسا انسان جو اپنی زندگی سے بے زار ہوچکا ہو' وہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ آخر کار میرے اور اس کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ آئندہ جب بھی اس نے خودکشی کی کوشش کرتے ہوئے کسی شخص کو گرفتار کیا تو وہ اسے میرے پاس ضرور لے آئے گا اور میں اس شخص سے جو کچھ معلوم کرسکا' وہ رضاکارانہ طور پر میں فرید حسین کو بتادوں گا۔ اس لیے فون کی گھنٹی بجنے پر میرا موڈ خراب ہوا تھا' انسپکٹر فرید حسن کی آواز سنتے ہی ٹھیک ہوگیا تھا۔

"ہاں حسن!" میں نے خود ہی سوال کیا "کیا تم نے خودکشی کرتے ہوئے کسی شخص کو گرفتار کرلیا ہے؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" انسپکٹر فرید حسن نے کہا "اس وقت وہ شخص میری تحویل میں ہے لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ "دیکھو حسن! تم مجھ سے وعدہ کرچکے ہو کہ تم کسی ایسے شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروگے۔ یار! تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ ایسے لوگ دنیا سے' دنیا کے لوگوں سے' معاشرتی نظام سے اور خود اپنی ہی زندگی سے مایوس ہوچکے ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی مریض بن چکے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہماری طرف سے ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ اور میرا مقصد تو نیک ہے نا! میں اس سے مل کر اس میں زندگی کی امنگ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی میں اخبارات میں اس طرح کا اشتہار چھپوانے کے بارے میں غور کررہا ہوں کہ "زندگی سے مایوس لوگ خودکشی نہ کریں' ہم سے رابطہ کریں۔"

"ہم خود انہیں زندہ درگور کردیں گے۔" فرید حسن نے استہزائیہ لہجے میں میری بات کاٹی۔

"بکو مت۔" میں نے جھلا کر کہا پھر میں نے اپنے لہجے کو ملتجیانہ بناتے ہوئے کہا "پلیز حسن! اس شخص کو میرے دفتر لے آؤ۔ یقین کرو' اسے تمہارا جرم نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ اس شخص کی مدد ہوگی۔ اس طرح قانون کا مقصد بھی پورا ہوجائے گا کہ آئندہ وہ خودکشی کے بارے میں نہ سوچے۔ مجھے امید ہے میں اس شخص کے دل و دماغ سے خودکشی کا خیال نکال دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے گہرا سانس لے کر فرید حسن نے گویا بادل ناخواستہ ہامی بھری۔ "اگرچہ میرا دل نہیں مانتا لیکن تمہارے اصرار پر میں اسے تمہارے دفتر لے آتا ہوں۔"

"شکریہ دوست!" میں خوش ہوگیا اور جلدی سے ریسیور رکھ دیا کہ کہیں وہ اپنا ارادہ بدل نہ لے۔

☆ ☆ ☆

میرے دفتر پہنچنے کے پانچ منٹ بعد انسپکٹر فرید حسن ایک نوجوان کو لیے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت فرید حسن وردی میں نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ آنے والے شخص کا گہری نظر سے جائزہ لیا پھر انہیں بیٹھنے کا کہہ کر میں نے ہلکے پھلکے انداز میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ اس دوران میں ہم ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوچکے تھے۔ اس شخص کا نام وسیم تھا۔ میں نے اپنی گفتگو کا انداز جان بوجھ کر ایسا رکھا تھا کہ ہمارے درمیان بے تکلفی پیدا ہوسکے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وسیم انسپکٹر فرید حسن کی موجودگی

میں کھل کر بات نہیں کرسکے گا۔
”اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔ پلیز، تھوڑی دیر کے لیے باہر انتظار گاہ میں جاکر بیٹھو۔“ میں نے فرید حسن سے کہا۔
”میں اپنے نئے دوست سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے وسیم کی طرف دیکھ کر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
”اس کے لیے ضروری ہے کہ پرانے دوست کو بھگا دیا جائے؟“ فرید حسن نے قدرے غصے سے کہا ”میں کہیں نہیں جارہا۔ تمہیں جو باتیں کرنی ہیں، میرے سامنے کرو۔“
میں بہت مشکل سے انسپکٹر فرید حسن کو باہر جانے پر رضامند کرسکا۔ وہ ناراضی کا اظہار کرتا رہا اور آخر میں اس نے دبے دبے سے لہجے میں مجھے خبردار کیا کہ وسیم میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ ایک بار خودکشی کی کوشش کرچکا ہے۔ اور اس نے گرفتاری کے وقت ایک سپاہی سے ہاتھا پائی بھی کی تھی۔
”میرے خیال میں وسیم صاحب ایک سمجھ دار اور مہذب آدمی ہیں۔ مجھے امید ہے یہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔“ میں نے یہ جملہ فرید حسن سے خاص طور پر بلند آواز میں کہا تاکہ وسیم بھی سن لے۔ اس نے میری بات سنی تو سہی، لیکن کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔
”میں انتظار گاہ میں جاکر بیٹھتا ہوں۔“ فرید حسن نے دروازے پر پہنچ کر سرگوشی کی ”اگر میری ضرورت پڑے تو فوراً آواز دے دینا۔“
”مجھے امید ہے کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے باہر نکال کر دروازہ بند کردیا۔ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طرف رکھے ہوئے فریج سے میں نے دو بوتلیں کولڈ ڈرنکس کی نکالیں اور انہیں کھول کر واپس پلٹا ایک بوتل وسیم کے سامنے رکھ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
”مجھے آپ کے بارے میں انسپکٹر فرید حسن نے سب کچھ بتادیا ہے۔“ میں نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد نہایت نرم لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا ”آپ خودکشی کرنا چاہتے تھے۔۔۔ میں آپ سے اس کی وجہ دریافت نہیں کروں گا۔ صرف یہ پوچھوں گا کہ کیا واقعی آپ کو اپنی اس زندگی سے اتنی نفرت ہوگئی ہے کہ آپ کے دل سے زندہ رہنے کی خواہش ہی ختم ہوگئی ہے؟ میرے خیال میں آپ ایک مہذب شخص ہیں۔ یقیناً تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کے پاس ایک بہترین ملازمت بھی موجود ہے۔۔۔ یا آپ اپنا کاروبار کرتے ہیں تو اس میں کامیاب رہے ہیں۔۔۔“
میں نے لمحے بھر کے لیے خاموش رہ کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں الفاظ کا انتخاب کرکے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”ماشاء اللہ آپ کی صحت بھی قابل رشک ہے۔ آپ کو دیکھ کر میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ کرلیا تھا کہ آپ کسی ایسے مرض میں ہرگز مبتلا نہیں ہیں جو ناقابل علاج ہو۔“
”آپ کا خیال درست ہے۔“ میری توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد وسیم زبان کھولنے پر مجبور ہوگیا۔ ”میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔۔۔ میں مکمل طور پر تندرست ہوں۔۔۔ لیکن اس کے باوجود اب میں زندہ رہنا چاہتا۔“
”آپ کے پاس یقیناً خودکشی کی معقول وجہ ہوگی۔“ میں نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ مسلسل سر جھکائے اپنے سامنے رکھی مشروب کی بوتل کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہا درجے کی مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ ایک بار پھر خاموشی کو میں نے ہی توڑا۔
”یقیناً وہ ایک ایسی بات ہوگی جسے آپ ایک اجنبی کے سامنے بتانا نہیں چاہتے۔ شاید آپ اس راز کو مجھے بتانے میں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کررہے ہیں۔ یقین کیجیے، آپ کا راز میرے پاس ایک امانت کے طور

پر رہے گا۔۔۔ میرا خیال ہے' دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر آدمی نہیں مل سکے گا۔ میں آپ کے لیے مکمل طور پر اجنبی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ دراصل ہیں کون؟ مجھے جو آپ کا نام بتایا گیا' میں نے اس پر یقین کرلیا۔ اس لیے کہ مجھے آپ کی شخصیت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ خودکشی کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی اس مایوسی کی وجہ بتادیں۔ اس سے آپ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا اور مجھے آپ کے دل سے خودکشی کا خیال نکالنے میں بھی کافی مدد ملے گی۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری اور دوسرے ہی لمحے معدوم ہوگئی۔ "آپ ماہر نفسیات ہیں۔۔۔ اور اپنے طریقے سے مجھے خودکشی سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ کی یہ کوشش بے فائدہ رہے گی کیونکہ میں مرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ آپ کا لیکچر مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔۔۔ اور نہ ہی میں آپ کو اپنی خودکشی کی وجہ بتاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ "یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسی کو وجہ بتائیں یا نہ بتائیں۔ کوئی آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔۔۔ ویسے جہاں تک میرا اندازہ کام کرتا ہے' آپ کی خودکشی کی وجہ کوئی ایسی بات ہے جسے اپنی زبان سے بیان کرتے ہوئے آپ اپنے لیے ذلت اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں حالانکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ذلت اور شرمندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بتا کر انسان نہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکتا ہے بلکہ ذلت اور شرمندگی سے ہمیشہ کے لیے نجات بھی حاصل کرسکتا ہے۔"

میں نے بوتل سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ وہ بدستور میرے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ گویا میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کولڈ ڈرنک کی بوتل اس کے سامنے میز پر جوس کی توں رکھی ہوئی تھی۔ اسے زبان کھولنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ میرا ایک مریض چار سال تک شدید ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی گاڑی نے ایک شخص کو کچل دیا ہے۔ چار سال تک وہ اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس واقعے کا پولیس کو علم ہوگیا تو اس کے لیے مسائل کھڑے ہوجائیں گے۔ وہ خود کو قاتل سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجرم ہے۔ آخر کار وہ علاج کے لیے میرے کلینک پر آیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خود اس علاقے کے پولیس اسٹیشن جائے اور یہ معلوم کرے کہ جس رات اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔۔۔ کیا اس رات واقعی کوئی ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔۔۔ اگر واقعی ہوا تھا تو اس کی تفصیل کیا ہے؟

"میرے بہت سمجھانے کے بعد وہ آخر پولیس اسٹیشن جانے پر راضی ہوا۔ وہاں سے اپنے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس رات نیو ہورا جی روڈ پر دو حادثے ہوئے تھے۔ ایک حادثہ ٹھیک رات آٹھ بجے پیش آیا۔ اس حادثے میں ڈرائیور گاڑی سمیت فرار ہوگیا تھا جو بعد میں گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت میں اس شخص پر گاڑی کی ٹکر سے ایک راہ گیر کو ہلاک کرنے کا مقدمہ چلا۔ بے پروائی سے ڈرائیونگ کے جرم میں اس شخص کو ایک سال کی قید ہوئی اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ ہوا جو ہلاک ہونے والے کے لواحقین کو دیے گئے تھے۔

"دوسرا حادثہ اسی سڑک پر رات کے گیارہ بجے کے بعد پیش آیا۔ یہ گاڑی والا بھی حادثے کے فوراً بعد فرار ہوگیا تھا اور بعد میں بھی پولیس اس کا سراغ نہ لگا سکی لیکن اب وہ فائل بند ہوچکی تھی کیونکہ زخمی کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ خود زخمی ہونے والے

شخص کا بیان تھا کہ حادثہ اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر اچانک فٹ پاتھ سے سڑک پر آگیا تھا۔۔۔ اس کے بعد میرے مریض کے ذہن سے وہ بوجھ ہٹ گیا۔ اگر وہ شخص میرے مشورے پر عمل نہ کرتا تو شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو کر ایک روز آپ کی طرح خودکشی کرلیتا۔ اگر آپ کے ساتھ بھی اس قسم کی کوئی بات یا اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کم سے کم یہ سبب آپ کی خودکشی۔۔۔"

"میرے ساتھ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔

"پھر آپ کے ساتھ آخر کیا مسئلہ ہے؟" اس نے اسے جواب دینے پر اکسایا "یقیناً" وہ کوئی ایسی بات ہے جو آپ کسی سے نہیں کہنا چاہتے۔۔۔ کیا آپ کی بیوی۔۔۔"

یکایک اس کا چہرہ اندرونی جوش کے سبب سرخ ہوگیا "میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا "تم اپنے نفسیاتی حربوں سے مجھ سے کچھ بھی نہیں معلوم کرسکتے۔۔۔ میں مرنا چاہتا تھا اور اب بھی میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ تمہاری کوئی بات میرے اندر زندگی کی خواہش پیدا نہیں کرسکتی۔"

"لیکن میرے دوست!" میں نے کہا "آپ اس بات سے انکار نہیں کریں گے کہ انسان کو زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔۔۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ ابھی آپ کی عمر اتنی نہیں ہے کہ آپ زندگی سے نجات کے بارے میں سوچنے لگیں۔۔۔ کیا آپ کے پاس واقعی خودکشی کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے؟"

"دوسرا راستہ۔۔۔؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"دیکھئے، خودکشی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ویسے بھی عام طور پر لوگ اس وقت خودکشی کرتے ہیں جب ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ کیا آپ کے پاس بھی اپنے مسئلے کا کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔ آپ نے اس بارے میں غور کیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔" وسیم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا "میرا خیال ہے۔۔۔ اگر میں اس سلسلے میں غور کرتا اور سوچتا۔۔۔ تو ممکن ہے میں خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔"

"بہت خوب!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی "اگر آپ کو کاروبار میں نقصان ہوا ہے تب بھی کوئی بات نہیں۔ بزنس میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ زندگی سلامت رہی تو آپ اس نقصان کی تلافی کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کے بزنس پارٹنر نے دھوکا دیا ہے تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ آپ اس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے بھاری آواز میں کہا پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کچھ بتانے یا نہ بتانے کے سلسلے میں فیصلہ کررہا ہے۔ میں خاموش بیٹھا اس کے مزید بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ہوئی مشروب کی بوتل سے چند لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا "دراصل میں اپنی بیوی سے بے زار ہو کر خودکشی کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتی ہے مگر۔۔۔"

اچانک وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے گویا اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کے خیال سے عورتوں کے خلاف چند جملے کہنا ضروری سمجھا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے؟ یہ ایک انتہائی افسوس ناک حقیقت ہے کہ عورت کی وفاداریاں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ وہ ایسی نہیں ہوگی۔" وسیم نے نفرت سے کہا "وہ روزانہ شام کو دفتر سے واپسی پر میرا اس طرح استقبال کرتی جیسے ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہو۔۔۔ میرے وہم اور گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ

سے بے وفائی کر رہی ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے نرم لہجے میں ہمدردی سے کہا "زن گزیدہ افراد کے کیسز اکثر میرے سامنے آتے رہتے ہیں دوست! عورت کے بارے میں دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر نفسیات بھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت کیا کر گزرے۔ عورت' جہاں وفا کی تتلی' ایثار کا پیکر اور جاں نثار ساتھی کا نام ہے۔ وہیں یہ کبھی کبھی زہریلی ناگن بن کر اپنے ہی آشیانے کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ جہاں وجود زن سے تصور کائنات میں رنگ کی حقیقت ہے' وہیں یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ وہ اپنی فطری کم عقلی کے سبب ایسے فیصلے بھی کر گزرتی ہے جس کے نتیجے میں ایک بھرا پرا' خوش و خرم گھرانا منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔"

میں نے گہرا سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔ میں وسیم کا مسئلہ سمجھ چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اسے مزید بولنے پر آمادہ کرنے کے لیے میں نے قصداً "صنف نازک کے خلاف چند جملے بولنا شروع سمجھا تھا۔

"ہاں دوست!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "آپ اپنے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟"

"میں کاروبار کے سلسلے میں اکثر گھر سے دور رہتا ہوں۔ کبھی کبھار کئی کئی دن مجھے گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ پچھلے ہفتے میں فیصل آباد گیا ہوا تھا مگر فیصل آباد میں میرا کام توقع سے کچھ پہلے ہی ختم ہو گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے فون کر دوں۔" وسیم نے جان بوجھ کر اپنی بیوی کا نام بتانے سے گریز کیا۔ میں نے بھی اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

"میں بہت خوش خوش کراچی واپس پہنچا تھا۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "میں اچانک اس کے سامنے جا کر اسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔۔۔ مگر جس وقت میں اپنے گھر پہنچا۔۔۔"

اچانک وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ بوتل اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ لیا اور پھر خود کلامی کے انداز میں بتانے لگا "کل شام۔۔۔ جس وقت میں اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔۔۔ تو جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔۔۔ میرے بیڈ روم سے میری بیوی اور ایک مرد کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کی ہول سے اندر جھانک کر دیکھا اور میرا خون میری رگوں میں جم کر رہ گیا۔ یہ میرے لیے اس قدر شدید صدمہ تھا جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح کھڑا تھا۔ میرے اندر' گویا وقتی طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ بس ایک ہی خیال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا رہا کہ اس وقت مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔۔۔ کہاں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ بہرحال' اپنے گھر سے نکل آنے کے بعد میں مسلسل پیدل چلتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ مجھے سب کچھ اجنبی لگ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کراچی جیسے شہر میں۔۔۔ انسانوں کے اس جنگل میں' میں اکیلا رہ گیا ہوں۔۔۔"

"آپ کے ساتھ واقعی ظلم ہوا ہے۔" میں نے ہمدردی سے کہا "پھر بھی آپ کو خودکشی کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

دوست! مسئلے کا حل یہ نہیں ہے جو آپ نے سوچا تھا۔ آپ کو سوچ سمجھ کر کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیے جس کے نتائج خواہ کچھ بھی سامنے آئیں' آپ کو مردانہ واران کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ آپ جو کچھ کرنے لگے تھے۔۔۔ یہ تو حالات سے فرار حاصل کرنا ہے۔ زندگی ایسی بے وقعت چیز نہیں ہوتی جسے ایک عورت کی خاطر ضائع کر دیا جائے۔۔۔ اور عورت بھی ایسی جو بے وفا ہے۔۔۔ نہیں میرے دوست! آپ کو زندگی کی قدر کرنی چاہیے۔ یہ بار بار نہیں ملتی اور ایسی حرام موت کو گلے لگانے کی اجازت تو ہمارا مذہب بھی نہیں دیتا۔" "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔" اس نے میرے بات سے اتفاق کیا "مگر اس وقت میں اپنے ہوش و حواس

میں نہیں تھا۔ اس وقت میرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میرا کوئی ایسا دوست بھی نہیں، جس کے پاس جاکر میں اپنا دکھ بیان کرسکتا۔۔۔ ویسے بھی میرا خیال ہے اگر کوئی میرا بے تکلف دوست ہوتا بھی، تو شاید میں اسے یہ بات بتانے کی جرات نہ کرپاتا اس لیے میں نے رات ہوٹل میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔۔۔ اور پھر ہوٹل کی کھڑکی سے کود پڑا۔ میرا خیال تھا کہ چوتھی منزل سے کودنے کے بعد میرا وجود فرش پر بکھر جائے گا۔۔۔ لیکن ہوٹل کے پچھلے حصے میں ٹینٹ لگا ہوا تھا اور ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے کتب میلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ میں سیدھا ٹینٹ پر جاگرا اور۔۔۔"

"بہرحال۔۔۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ نے بالکل درست کہا۔۔۔ کہ خودکشی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ زندگی اتنی بے قیمت نہیں ہے کہ اسے یوں ضائع کیا جائے۔ خاص طور پر کسی عورت کے لیے جان دینا تو انتہائی احمقانہ فعل ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری بات سمجھ لی ہے۔" میں نے وسیم کی حوصلہ افزائی کی "کیا میں یقین کرلوں کہ اب آپ۔۔۔"

"جی ہاں۔۔۔" اس نے پرزور لہجے میں کہا "اب میں خودکشی ہرگز نہیں کروں گا۔ میں اس مسئلے کو کسی اور طرح نمٹانے کی کوشش کروں گا۔"

"گڈ!" میں نے طمانیت سے کہا۔ میں اس کے جواب سے پوری طرح مطمئن ہوگیا تھا۔

میں خود اٹھ کر باہر گیا اور انسپکٹر فرید حسن کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ اپنے آفس میں آیا۔ بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے کہا "فرید حسن! میری درخواست ہے کہ تم وسیم صاحب کے خلاف کارروائی نہ کرو۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اب یہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"مسٹر ماہر نفسیات!" انسپکٹر فرید حسن نے طنزیہ لہجے میں کہا "میرا تجربہ کہتا ہے کہ۔۔۔"

"تم اپنا تجربہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ وسیم صاحب کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ میں یہ درخواست تم سے ایک دوست کی حیثیت سے کررہا ہوں۔ اور رہی تجربے کی بات تو میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ میری ضمانت پر وسیم صاحب کو چھوڑ دو۔"

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر گہرا سانس لے کر بولا "ٹھیک ہے، میں تمہاری درخواست پر وسیم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کررہا۔۔۔" پھر وہ وسیم سے مخاطب ہوا "اب آپ جاسکتے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر!" فرید حسن اب مجھ سے گہری سنجیدگی سے بولا "یاد رکھنا کہ اگر اس شخص نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو آئندہ میں کسی شخص کو تمہارے پاس نہیں لاؤں گا۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کر اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ وسیم اب خودکشی ہرگز نہیں کرے گا اور انسپکٹر فرید حسن آئندہ بھی ایسے مریضوں کو سیدھا میرے پاس لایا کرے گا۔ ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد میں بہت خوش اور مطمئن ہوکر اپنے چند مریضوں سے ملا لیکن اسی دن لنچ کے بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور میری خوشی خاک میں مل گئی۔ دوسری طرف انسپکٹر فرید حسن تھا۔

"کیا بات ہے حسن؟" اس کی آواز پہچان کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ "کیا وسیم نے خودکشی کرلی ہے؟"

"نہیں۔" وہ جواب میں غرایا "تم نے اپنے تجربے کے بنیاد پر بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وسیم اب خودکشی نہیں کرے گا۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس بدبخت نے تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے مسئلے کا دوسرا حل ڈھونڈ لیا تھا۔۔۔ اس نے تمہارے ہاں سے جاتے ہی اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے۔" "اوہ، میرے خدا۔۔۔" میرے ہاتھ سے ریسور چھوٹ کر گر پڑا۔

محبت پھر آباد ہو گی

فرخ ظفر

ایک بیٹے کی کتھا جس سے اپنے باپ کی ادھوری خواہش پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور اپنی محبت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

بچھڑ کے ملنا ہی اصل محبت ہے، محبت کے موسم میں لکھی گئی کہانی

زندگی ایک تسلسل میں گزرتی جارہی تھی، بہت سی سوچیں اس کے دماغ میں گڈمڈ ہورہی تھیں۔ پارک کی روش پر ٹہلتے ہوئے اس نے اردگرد نظر دوڑائی، پھولوں، پودوں، درختوں، ہنستے کھیلتے بچوں اور کپلز کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے دیکھ کر یوں لگتا جیسے زندگی بہت خوب صورت ہے مگر حقیقت اس سے قطعاً" مختلف۔ ہر چہرہ اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی دکھ چھپائے پھرتا ہے کچھ لوگ میری طرح دکھوں کو چھپانا جانتے ہیں کچھ ان دکھوں کے دباؤ کو برداشت نہ کرتے ہوئے پاگل خانے چلے جاتے ہیں کچھ دباؤ کا اثر کو کم کرنے کے لیے اپنا دھیان بٹانے کی خاطر اللہ کی طرف لو لگالیتے ہیں، کچھ اپنے آپ کو دنیاوی مصروفیات میں گم کرلیتے ہیں اور کچھ لوگ معاشرے سے بغاوت کردیتے ہیں مگر یہ بھی ایک کڑی حقیقت ہے کہ تمام لوگوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی اپنے دکھوں سے فرار۔

اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھروں کو لوٹتے پرندوں کو دیکھ کر رگوں میں اک عجیب سی آسودگی اتر گئی۔ گھر میں داخل ہوتے ساتھ ہی وہ اپنی ماں کے کمرے کی طرف بڑھا، کمرے میں سرخاموشی تھی۔ رضیہ بیگم سو رہی تھیں، وہ آہستگی سے اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

فرید ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، وہ روزانہ اسکول سے واپسی پر ماں کو روتا ہوا پاتا اور سوچتا کہ آج پھر امی ابو کا جھگڑا ہوا ہے۔

رضیہ بیگم اور ارشاد حسین کی محبت کی شادی تھی۔ محبت ختم ہوگئی شادی رہ گئی۔ رضیہ بیگم کی خواہش تھی کہ ان کے پاس بہت سا روپیہ اور آسائشیں ہوں، ارشاد کوشش تو پوری کرتے تھے لیکن زندگی میں کیے گئے کچھ فیصلے انسان کو تمام عمر کے لیے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ جب وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھے تب انہوں نے رضیہ بیگم کو پہلی بار دیکھا، رضیہ گورنمنٹ آفیسرز سوسائٹی کے پارک میں چہل قدمی کررہی تھیں اور ایف ایس سی کی طالبہ تھیں۔ روز ایک ہی جگہ واک کرتے ہوئے دونوں میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ ارشاد رضیہ کو اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہوگئے مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ارشاد کے والد سرکاری افسر تھے ان ہی دنوں ان کا تبادلہ پشاور سے کراچی ہوگیا ارشاد کو گھر والوں کے ساتھ کراچی منتقل ہونا تھا۔ انہوں نے جب رضیہ سے یہ ذکر کیا تو اس نے رونا شروع کردیا۔

"رضیہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو میں شہر

چھوڑ رہا ہوں' ملک نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی بھی صرف تم سے کروں گا مگر مجھے دو سال کی مہلت چاہیے تاکہ میری تعلیم مکمل ہو جائے' جب میں تمہارے گھر رشتہ بھیجوں تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔" مگر رضیہ کی ایک ہی ضد تھی کہ آپ رشتہ ابھی بھیجیں۔

"معاملے کی نزاکت پر غور کرو رضیہ! تم راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور میں سید خاندان سے اگر ابھی میں نے والدین سے بات کی تو وہ ہرگز میرے مطالبے کو تسلیم نہ کریں گے۔" ارشاد نے کہا۔

تاہم رضیہ کوئی بات ماننے پر تیار نہ ہوئی' اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے انہوں نے والد سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ تصور حسین' ارشاد کی بات سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے' پہلے غصے کا اظہار کیا پھر پیار سے سمجھانے لگے۔

"ارشاد! میں ہر چیز پر سمجھوتا کرنے کو تیار ہوں لیکن پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کرو' میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں اس پر ضرور سوچوں گا۔" مگر رضیہ نے تو یہ بات ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتے جب ہی تو اپنے والدین سے یہ بات منوا نہ سکے اب میرے سامنے عدد تراش رہے ہو' اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو آج ہی کورٹ میرج کرو۔"

کہتے ہیں جوانی منہ زور ہوتی ہے۔ ارشاد نے رضیہ

کا ہاتھ تھاما اور کورٹ میرج کے لیے چل دیے' واپسی پر ارشاد' رضیہ کو اپنے گھر لے گئے۔ تصور حسین یہ دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوگئے اور ارشاد کو عاق کرکے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا' رضیہ کے والدین نے بھی اس رشتے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ارشاد حسین آسمان سے زمین پر آگرے' چند روز اپنے دوست کے گھر گزارے اس دوران والدین کراچی منتقل ہوگئے۔ اب ایک نیا مسئلہ درپیش تھا' وہ تھا ارشاد کے کالج کی فیس' انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ساٹھ ہزار کی رقم کہاں سے لائیں۔ دوست نے مکان خالی کرنے کو کہا' تمام جاننے والوں نے رقم دینے سے انکار کردیا' سید تھے فیس معافی کی درخواست دینے کو اپنی غیرت پر تازیانہ محسوس کرتے ہوئے کالج چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

سچ کہا ہے کہ کسی نے کہ "محبت اندھی ہوتی ہے۔" انسان نفع و نقصان کے متعلق نہیں سوچتا۔

ارشاد نے ایک کلینک پر بہ طور کمپیوٹر آپریٹر کام شروع کردیا۔ ایک سال بعد فرید حسین پیدا ہوا' ذمہ داریاں کو بوجھ بڑھتا گیا پوں ارشاد اپنی تعلیم مکمل نہ کرپائے' لگی بندھی آمدنی رضیہ کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہی کیوں کہ وہ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں' آسائشوں میں پلی بڑھی تھیں' کچھ عرصے تو انہوں نے صبر کیا لیکن آخر کار صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ آئے دن گھر میں جھگڑے ہونے لگے' ارشاد کا موقف تھا کہ وہ رضیہ کے جذباتی فیصلے کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کرسکے اسی لیے وہ زندگی میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہے جب کہ رضیہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھیں۔

☆ ☆ ☆

فرید حسین چار برس کے ہوچکے تھے اور اسکول جانا شروع کردیا تھا انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں لڑائی کے علاوہ کوئی آواز نہ سنی تھی' وہ ساتویں جماعت میں تھے جب ارشاد کو جان لیوا دل کا دورہ پڑا۔ وجہ وہی جھگڑا جو اتنے ہوس سے چلا آرہا تھا مگر شاید ارشاد زندگی سے لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔

اب زندگی رضیہ کو اکیلے ہی کاٹنی تھی۔ رشتے داروں سے تو پہلے ہی قطع تعلقی تھا' ماں باپ بھی منہ پھیر چکے تھے ان کی عزت خاک میں ملانے والی کو وہ سر آنکھوں پر کس طرح بٹھاتے' اب وہ کسی کے در پر جاتی' پچھتاوے اور صرف پچھتاوے رہ گئے تھے۔

تنہائی میں آنسوؤں کی لڑی ان کے چہرے پر جگمگاتی رہتی' وہ انہیں پونچھتی بھی نہ تھیں کہ یہ آنسو اس شخص کی یاد میں تھے جس نے ان کی خاطر بڑی قربانی دی اور بدلے میں کڑوی کسیلی سنیں' لیکن وقت اب ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ ارشاد حسین کے چالیسویں کے بعد خالی پیٹ بیٹھیں وہ اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کررہی تھیں کہ اگر نئی زندگی میں ماں باپ کی دعائیں شامل نہ ہوں تو زندگی یوں ہی اذیت میں گزرتی ہے' خوشیاں روٹھ جاتی ہیں وقت از خود دل میں پچھتاوے پیدا کردیتا ہے لیکن آہ یہ انسانی فطرت محض نفسی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کتنے دلوں کو توڑتی ہے کتنی بددعائیں لیتی ہے لیکن... دامن! پھر بھی خالی رہ جاتا ہے' یہی رضیہ کے ساتھ ہورہا تھا۔

ضرورتیں منہ کھولے کھڑی تھیں' فرید نو عمر تھا زندگی کی تلخیوں سے نابلد! اب جو اچانک افتاد سر پر پڑی تو بوکھلا گیا۔ دکھ تو انسان کو وقت سے پہلے شعور اور پختگی عطا کردیتا ہے' فرید ماں کے دکھ کو محسوس کرتا۔ اس نے بارہا اسکول چھوڑنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ماں کے لبوں پر صرف "نہیں" کا لفظ تھا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جن مصائب کا سامنا ارشاد کرتے رہے وہی ہی کٹھنائی فرید کو بھی جھیلنی پڑے۔ رضیہ بیگم پر ابھی بہار کا موسم تھا کئی برسوں تاک نظروں نے ان کا پیچھا کیا لیکن ان کے کردار کی مضبوطی اور اللہ کی حفاظت کے باعث وہ سر اٹھا کر جیتی رہیں' بیٹے کے مستقبل کی خاطر انہیں گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑا ارشاد حسین کے ایک دوست نے ان کی خاصی مدد کی اسکول میں

نوکری دلوائی' اس طرح دو وقت کی روٹی میسر آنے لگی' فرید ایک محنتی اور لائق طالب علم تھا حالات نے اسے سنجیدہ بنا دیا تھا۔ عام لڑکوں کی طرح فضول گپیں ہانکنے کی بجائے وہ پڑھائی میں مشغول رہتا' مقصد صرف ماں کا بوجھ بٹانا تھا انہیں وہ آسودگی فراہم کرنا چاہتا تھا جس کی وہ متمنی تھیں' وقت کا پہیہ چلتا رہا میٹرک کے امتحان میں فرید نے بورڈ میں پوزیشن لی تو با آسانی ایک اچھے کالج میں وظیفے پر داخلہ مل گیا۔

رضیہ بیگم صبح اسکول میں پڑھاتیں اور شام کو گھر میں بچوں کو ٹیوشن دیتیں' اسی طرح گزر بسر ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو فرید! کیسے ہو؟" وہ لائبریری میں بیٹھا نوٹس بنا رہا تھا کہ اچانک نسوانی آواز پر اس نے سر اٹھایا تو ثمرین کو سامنے پایا۔ ثمرین کی خود میں بڑھتی دلچسپی سے وہ ناواقف نہ تھا لیکن ان جان ضرور بنتا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی لیکن اس کا سرد رویہ دیکھ کر واپس چلی گئی' دور جاتے اس کے قدموں کی آواز سن کر فرید نے ٹھنڈی سانس بھری اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ثمرین کو پسند وہ کرتا تھا لیکن خود سے کیے گئے عہد کی وجہ سے وہ اس سے لاتعلقی اختیار کیے رکھتا۔

وہ ایم بی بی ایس کے فائنل میں پہنچ چکا تھا ماں کی امیدوں کو پورا کرنا اس کا اولین مقصد تھا کہ یہ اس کے باپ کی ادھوری خواہش بھی تھی۔ جب اس کا ایم بی بی ایس میں داخلہ ہوا تو اس کی ماں خوشی سے رو پڑی۔

"فرید! تم نے اس منزل کی طرف پہلا قدم رکھ دیا ہے جسے پانا تمہارے باپ کا خواب اور شوق تھا۔" بولتے بولتے وہ کھو سی گئیں' غالباً" پرانی یادیں ان کے وجود کو مہکانے لگی تھیں۔

"وہ کہتے تھے ہارٹ سرجن بننا میرا جنون ہے اور میں ان کا جنون۔۔۔" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ منہ پر دوپٹا رکھ کے رونے لگیں۔ وہ ماں کو دلاسا دینے لگا۔

"وہ کہا کرتے تھے میں اپنی ادھوری خواہش اپنے بیٹے کو ہارٹ سرجن بنا کر پوری کروں گا۔" اس لمحے فرید کو بھی یہ جملہ کہتے اپنے باپ کی پرعزم آنکھیں یاد آنے لگیں ور اس کا ہارٹ سرجن بننے کا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی لگن اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ پھر کیسے وہ عشق و محبت کے چکر میں پڑ کر ان ناکامیوں کو خوش آمدید کہتا جو اس کے باپ نے برداشت کی تھیں؟ ماں کی بولتی آنکھوں نے اسے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی باور کرا دیا تھا کہ اسے صرف اور صرف اپنا مستقبل بنانا ہے اور وہ وہی کر رہا تھا۔

MBBS کے بعد وہ ہاؤس جاب کر رہا تھا ثمرین بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ ہاؤس جاب مکمل ہونے میں چند ہفتے رہ گئے تھے۔ ثمرین کی بے تابی بڑھ گئی تھی وہ بے چین سی فرید کے پاس آتی گویا کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہ پاتی' فرید اس کی لو دیتی آنکھوں میں دیکھنے سے احتراز کرتا مبادا وہ کسی نازک لمحے کی زد میں آ کر کوئی جذباتی فیصلہ نہ کر لے' لیکن اب وہ لمحہ آ گیا تھا جس سے بچنے کی وہ حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔

صفحہ نمبر 244 تک

"فرید! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" وہ حسب معمول کتابوں میں غرق تھا۔ ثمرین اس کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہ چونک گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ثمرین کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

"فرید! تم۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو کیا کہنا ہے؟" وہ بہ مشکل خود پر جبر کر کے بولا۔

یکایک ثمرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے' ارے! یہ کیا کر رہی ہو' لوگ کیا سوچیں گے؟" وہ بوکھلا گیا لیکن وہ اسی طرح روتی رہی۔

"اگر تم کچھ کہو گی نہیں تو میں اٹھ کے چلا جاؤں گا۔" فرید کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"میں نے بہت انتظار کیا کہ شاید تم مجھ سے اظہار محبت کردو یا میری محبت کا اعتراف کرلو لیکن تم۔۔۔ اتنے لاتعلق اور ان جان بنے رہے یہ کیسے ہوسکتا ہے فرید کہ میرے جذبے کی آنچ تم تک نہ پہنچی ہو؟" وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فرید نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔

"یہ کیسی باتیں کررہی ہو تم؟"

"وہی جو تمہیں مجھ سے کرنی چاہیے تھیں' وہ باتیں جو تمہاری آنکھیں کرتی تھیں لیکن تمہارے لب خاموش رہے' کیا تمہاری کسی کمٹمنٹ ہے جو میرے جذبوں کی پذیرائی کرنے سے انکاری رہے؟" اس کے لہجے میں کرب تھا۔

"اب تم نے یہ موضوع چھیڑ ہی دیا ہے تو سن لو ثمرین! میری پلاننگ میں فی الحال شادی کہیں نہیں ہے اس لیے میں تمہیں بلاوجہ آس کی ڈوری نہیں تھمانا چاہتا تھا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"لیکن کیوں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے مرحوم باپ کی خواہش تھی کہ میں ہارٹ سرجن بنوں کیوں کہ یہ ان کی تشنہ آرزو تھی جو حسرت میں ڈھل گئی۔" وہ اچنبھے سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ مزید گویا ہوا۔

"میرا انگلستان سے اسپیشلائزیشن کا ارادہ ہے تم چار سال انتظار کرلوگی؟" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

"لیکن اگر تم شادی کرکے۔۔۔ باہر جاؤ تو؟" وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں۔" اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔

"میں اپنے باپ کی غلطی دہرانا نہیں چاہتا۔" وہ گویا ایک لمحے میں اس کی بات کا پس منظر جان گئی اور بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں تمہاری خاطر ساری عمر انتظار کرسکتی ہوں لیکن میرے والدین مجھے کبھی ایسا نہیں کرنے دیں گے۔"

"تو پھر اللہ حافظ ثمرین!" وہ بے رخی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیٹھی وہیں ہونٹ کچلتی رہی۔

☆ ☆ ☆

فرید گھر آیا تو خاموش سا تھا' بیٹے کی ہر ادا کو پہچاننے والی رضیہ بیگم سے بھلا اس کی کھوئی کھوئی کیفیت کہاں چھپی رہ سکتی تھی۔ رات کو جب وہ بہ ظاہر کتابیں سامنے رکھے کسی سوچ میں گم تھا تو وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"فرید! کہاں گم ہو بیٹا!" ماں کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"کہیں نہیں امی! بس یوں ہی۔"

"اب ماں سے بھی چھپاؤ گے؟" انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ فرید نے ماں کو ساری بات بتادی' وہ خاموشی سے سنتی رہیں' جب وہ خاموش ہوا تو بولیں۔

"تم اپنے فیصلے سے مطمئن نہیں ہو؟" انہوں نے اس سے استفسار کیا۔

"نہیں امی! ایسا۔۔۔" وہ وضاحت دینے لگا کہ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم مطمئن نہیں ہو فرید! تم اس دوراہے پر کھڑے ہو جہاں کبھی تمہارا باپ تھا۔ یاد رکھو! جو چیز تمہاری قسمت میں اللہ نے لکھ دی وہ تمہیں ضرور ملے گی خواہ تم دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ چلے جاؤ اور رشتے تو آسمان پر بنتے ہیں البتہ مستقبل اچھا بنانا تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے "لیس الانسان الاماسعی" انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ تم نے ایک بہتر فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کل تمہیں ثمرین سے بھی بہتر شریک حیات مل جائے لیکن یہ جو وقت آج تمہارے ہاتھ میں ہے کل نہیں رہے گا۔ مجھے امید ہے تم سمجھ گئے ہوگے اللہ تمہارا حامی و ناصر رہے۔" وہ ہولے سے اس کا سر تھپک کر کمرے سے نکل گئیں۔

فرید حکومت کی طرف سے باہر اعلا تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ بے شک ماں کی نصیحت نے پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھنے میں بے حد مدد کی تھی لیکن دل میں

کہیں اک کسک سی تھی۔ ثمرین سے شادی میں تین باتیں مانع تھیں اول یہ کہ اس کے اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ شادی کے لیے معقول رقم کا انتظام کرپاتا۔ دوم یہ کہ اگر وہ شادی کر بھی لیتا تو ثمرین کو ساتھ لے جانے کے وسائل نہ تھے کیوں کہ وہ خود وظیفے پر جارہا تھا سوئم یہ کہ اگر شادی کرکے اسے پاکستان میں چھوڑ جاتا تو دوری برداشت کرنا مشکل ہوتی لہٰذا پڑھائی میں یک سوئی ناممکن ہوجاتی۔ ☆ ☆

وہ دن قریب آرہا تھا جب وہ ارشاد حسین کی روح کے سامنے سرخرو ہوتا' ماں کی برسوں کی تشنہ آرزو پایہ تکمیل کو پہنچتی۔ اس نے امتیازی نمبروں سے ڈگری لی اور وہیں ایک اسپتال میں دو سال تک پریکٹس کرتا رہا۔ اب اس کے ہاتھ میں اتنے پیسے تھے کہ وہ اپنی ماں کو وہ سہولتیں فراہم کرسکتا جن کی اس نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ لندن میں چار سال قیام کے دوران وہ صنف نازک سے قطعی دور رہا حالانکہ بہت سی حسینائوں نے اس کی جانب پیش قدمی کی تھی لیکن ایسے وقت ثمرین چھم سے اس کے سامنے آجاتی اور وہ اپنے خول میں بند ہوجاتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ ثمرین اپنے شوہر کے ساتھ خوش بھی ہوگی کہ نہیں۔ کبھی تصور میں اس کو دو بچوں کی انگلی تھامے جاتا دیکھتا۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوگئیں۔ یادیں پھر سے تازہ ہونے لگیں۔ رضیہ بیگم نے اسے سینے سے لگالیا اور رونے لگیں۔

"امی جان! آج میں نے آپ اور ابو کی خواہش پوری کردی' پھر بھی آپ رو رہی ہیں۔" وہ اور بھی شدت سے رونے لگیں۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں فرید! انہیں بہنے دو۔"

ماں کے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہوئے' پرانے دوستوں سے ملتے ہوئے' میڈیکل کالج میں گھومتے ہوئے اسے بارہا ثمرین کا خیال آیا لیکن اس نے ذہن جھٹک دیا۔

"اب وہ کسی کی امانت ہے' میرے لیے پرائی ہے۔" لیکن دل بھلا ایسی تاویلوں کو کہاں مانتا ہے؟ سو وہ بھی دل کے سامنے خود کو مجبور پاتا۔ ماں کو خوش دیکھ کر وہ اپنے فیصلے کو درست قرار دیتا اور دل کی کسک نظرانداز کردیتا۔

اندر کی گھٹن کم کرنے کے لیے وہ سیر کرنے پارک چلا آیا' رضیہ بیگم کافی پی لو تھا لہٰذا جب وہ سیر کرکے واپس آیا تو وہ سو رہی تھیں۔ کمرے کی خاموشی اور وال کلاک کی ٹک ٹک نے اسے احساس دلایا کہ اس کی زندگی کتنی بے رنگ اور تنہا ہے۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے رضیہ بیگم نے فرید کو مخاطب کیا۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے بیٹا!" نوالہ بناتا اس کا ہاتھ یک دم رک گیا۔

"سوچنا کیا ہے امی! کل سہارا والوں نے بلایا ہے دیکھیں کیا بنتا ہے!" وہ پھر کھانے میں مصروف ہوگیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کرلو۔" ماں کے جملے نے اس کے اعصاب جھنجھوڑ کر رکھ دیے۔

"امی! میں کچھ سال تک ایسا نہیں چاہتا۔" رضیہ بیگم اس کی نیت کو بھانپ گئیں۔

"ثمرین کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟" وہ چونکا۔

☆ جس کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ عالم ہے' جس کا باطن، ظاہر سے افضل ہے، وہ ولی اللہ ہے اور جس کا ظاہر باطن سے افضل ہے وہ جاہل و مکار ہے۔

☆ خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہ جو کچھ بھی سنے بیان کردے۔

☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھالیتا ہے اسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔

☆ بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

"ثمرین! اس کا اب کیا ذکر؟ اس کے والدین نے تو اس کی شادی ہاؤس جاب کے فوراً بعد کر دینی تھی اب تو اس کے دو چار بچے بھی ہوں گے۔" اس کا لہجہ بکھرا بکھرا تھا۔

"جس گلی جانا نہیں اس کا پتا لے کر کیا کرنا امی!" اس کی آواز میں یاسیت تھی' وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ فرید کھانا وہیں چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔ رضیہ بیگم کسی سوچ میں گم تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس کے قدم وہیں تھم گئے۔ دل انوکھی لے پہ دھڑکنے لگا' سامنے سے آتی ڈاکٹر ثمرین کو وہ ایک لمحے میں پہچان گیا جب وہ فرید کے قریب پہنچی تو اس نے بے ساختہ ثمرین کو پکارا۔ ثمرین کی نظر اس پر پڑی وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

دونوں یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھنے لگے چار سال یوں پلک جھپکتے گزر ہو گئے جیسے کبھی ان دونوں کے بیچ آئے ہی نہ ہوں۔

"کیسی ہو؟" وہ وارفتگی سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہوں' تم سناؤ۔" اس نے خود کو سنبھالا۔ دل کی دھک دھک اسے با آواز بلند سن رہی تھی۔

"میں دو ہفتے پہلے ہی واپس آیا ہوں' اس اسپتال سے منسلک ہونے کا ارادہ ہے۔"

"تمہارا ہارٹ سرجن بننے کا خواب پورا ہو گیا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"ایک خواب پورا ہو گیا ایک ادھورا رہ گیا۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں! تمہارے شوہر کیسے ہیں؟ خوش تو ہو نا؟" وہ ایک سانس میں کئی سوال پوچھ گیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

"لگتا ہے خوش ہے مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" وہ بدگمان ہوا لیکن ثمرین کے اگلے جملے نے اسے چونکا دیا۔

"میری شادی نہیں ہوئی فرید۔"

"لیکن کیوں! تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارے گھر والے۔"

"وہ صرف کہہ رہے تھے فرید! شادی کا وقت اللہ نے مقرر کیا ہے پھر یہ زمین والے کون ہوتے ہیں۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"میری منگنی ہوئی تھی پھر ٹوٹ گئی شادی سے ایک ماہ قبل۔"

"منگنی کیسے ٹوٹ گئی؟"

"لڑکے کی کہیں اور شادی کی خواہش تھی۔ والدین نے زبردستی مجھ سے منگنی کر دی لیکن پھر اس نے بغاوت کر دی۔"

"بہت افسوس ہوا۔" فرید کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

"افسوس کیسا؟ افسوس تو یہ ہے کہ اگر تم اس وقت بے شک منگنی کر کے باہر چلے جاتے تو آج حالات مختلف ہوتے۔" وہ مایوس تھی۔

"ثمرین! میں بندہ بشر ہوں اگر کسی میم میں دل اٹک جاتا تو؟ ویسے بھی میں اتنی طویل منگنی جیسے کم زور رشتے کا قائل نہیں۔" وہ شرارت سے ہنستا سنجیدہ ہوا۔

"بہرحال چھوڑو' تم بتاؤ تمہاری بیوی کیسی ہے' میم تو نہیں ہے؟" اس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ وہ مسکرانے لگا۔

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں' مجھے کہاں اس نے یاد رکھا ہو گا!" وہ بدگمان ہونے لگی۔

"میں نے ابھی شادی نہیں کی ثمرین۔" وہ خوشی سے معمور لہجے میں بولا۔

"کیوں تمہاری بھی منگنی ٹوٹ گئی تھی؟" وہ برجستہ بولی۔

سر سے ایک بہت بڑا بوجھ جو اتر گیا تھا وہ ہنسنے لگا' وہ بھی ہنسنے لگی کہ انہیں اب یہ زندگی ہنستے ہوئے گزارنی تھی۔

☆ ☆